بلوچوں کی رومانوی داستانیں
ڈاکٹر فاروق بلوچ

بلوچوں کی رومانوی داستانیں

بلوچوں کی رومانوی داستانیں

ڈاکٹر فاروق بلوچ

فکشن ہاؤس
لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد
e-mail: fictionhouse1991@gmail.com

نام کتاب	:	بلوچوں کی رومانوی داستانیں
مصنف	:	ڈاکٹر فاروق بلوچ
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
پبلشرز	:	فکشن ہاوس، لاہور
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق	:	ریاض ظہور
اشاعت	:	2021ء
قیمت	:	-/600روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-36307550-36307551

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

لاہور ○ کراچی ○ حیدر آباد ○

e-mail: fictionhouse1991@gmail.com

انتساب!

میں اپنی یہ کاوش اپنی پیاری بیٹی

طوبل بلوچ

کے نام کرتا ہوں

فہرست ابواب

باب سوم

باب سوم

تعارف

بلوچ ایک محبت کرنے والی پُرامن قوم ہے جس کی تاریخ گوکہ جنگ وجدل اور رزم آرائیوں سے بھری ہوئی ہے مگر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ جنگیں اور رزمکاریاں اُن پر مسلط کی گئیں نہ کہ انہوں نے کسی کے خلاف اشتعال انگیزی کی، نہ کسی پر حملہ آور ہوئے اور نہ ہی جنگ کہ طرح ڈالنے میں کبھی پہل کی ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بلوچوں پر ہمیشہ بیرونی جارحیت کے دروازے کھولے گئے اور ان قبائل کے خطہ عظیم کو بڑی طاقتوں نے ہمیشہ اپنی ترکتازیوں کا نشانہ بنایا جس کی وجہ سے بلوچ بھی اپنی مدافعانہ جنگ لڑنے پر مجبور ہوئے وگرنہ بلوچوں کی طرف سے ایسی کسی بھی جارحیت کے لیے پہل نہیں کی گئی۔ بلوچ تو ایک محبت کرنے والی جمالیات ذوق اور رومان کی دلدادہ قوم ہے جس کی تاریخ کا اگر ایک پہلو شدید رزم آرائیوں سے بھری ہوئی ہے تو ان کی رومانی داستانیں بھی اتنی زیادہ ہیں کہ جن کی مہکتی ہوئی دل گداز خوشبو میں بارود اور خون کی سوندھی سوندھی مگر جان لیوا اور اداس کرنے والی مہک ماند پڑ جاتی ہے۔

یہ دعویٰ شاید غلط نہ ہو کہ پاکستان بلکہ برصغیر اور اس کے اطراف کے ممالک میں بسنے والے لاتعداد اقوام میں بلوچ وہ واحد قوم ہے کہ جس کی شاعری کا ادبی اثاثہ سب سے زیادہ ہے اور اس قوم کی شاعری میں عشقیہ پہلو کے ساتھ ساتھ رزمیہ پہلو بھی واضح طور پر نظر آتا ہے بلکہ رزمیہ پہلو کا توازن عشقیہ پہلو سے زیادہ ہے لیکن رزمیہ شاعری میں بھی عشقیہ اور رومانوی پہلو واضح طور پر نظر آتا ہے۔ یعنی یہ وہ قوم ہے کہ جو جنگ میں بھی آداب انسانیت کا خیال رکھتی ہے اور وہاں بھی جہاں خون اور آگ کی بارش ہو رہی ہو تو یہ قوم پھول، خوشبو اور

بلوچوں کی رومانوی داستانیں
ڈاکٹر فاروق بلوچ

محبت کی باتیں کرتی ہے۔ بلوچوں کی رومانوی داستانوں کے اکثر مرکزی کردار اس قوم کے عسکری سرگرمیوں میں بھی نظر آتے ہیں اور اپنے قومی اور وطنی فرض سے کبھی غافل نہیں رہتے۔ اس طرح کے جذبات سے ہی اس قوم کی رومانوی مزاج اور امن وسکون کی خواہش کو بہتر طور پر دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔

بلوچ قوم کی رومانوی داستانوں پر کئی مصنفین نے دلچسپ اور معلومات سے بھرپور کتب تحریر کی ہیں جن کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس طرح بلوچ قوم کی تاریخ میں رزم کار مشاہیر کے تذکرے کثرت سے ملتے ہیں تو اسی طرح اس قوم کی تاریخ میں رومانوی کرداروں کی بھی ایک لمبی اور طویل قطار ہے جس سے اس بات کا ادراک ہوجاتا ہے کہ یہ قوم ایشیاء بھر میں سب سے زیادہ رومانوی کرداروں کی حامل قوم ہے۔ پاکستان کے اقوام پنجابی، پوٹھوہاری، سندھی، پشتون وغیرہ میں ایک دو یا چار چھ کردار ہی ملیں گے کہ جن کی محبت نے شہرت پائی اور ان کی تاریخ اور ادب کا حصہ بنا جبکہ بلوچوں میں ایسی بیسیوں کہانیاں ہیں جو ان کی تاریخ کے رومانوی پہلو کو واضح کرتے ہیں۔ اس قوم میں ایسے لازوال کردار گزرے ہیں جن کی محبت اور داستانِ عشق ہمیشہ کے لیے امر ہوگئی اور ساتھ ہی ان کی محبت بھری کہانی نے بلوچی ادب کو بھی تقویت بخشی اور اس کے اصناف میں اضافہ کا سبب بنے۔ بلوچی کے اکثر قدیم شعرا بذاتِ خود وہ کردار رہے ہیں جن سے یہ عشقیہ داستانیں منسوب ہیں مثلاً مست توکلی جو عاشق بھی تھا اور شاعر بھی، اسی طرح للہ عاشق بھی تھا اور شاعر بھی، حانی شہہ مرید دونوں عشق اور ادب کا حصہ تھے۔ شاہداد ومہناز تو بلوچی شاعری کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ بالخصوص مہناز کی شاعری اعلیٰ درجہ کی شاعری میں شمار ہوتی ہے کہ جس میں اس شاعرہ کی بھرپور صلاحیتیں، فن شاعری پر مکمل عبور اور دسترس واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اس طرح کے کئی کردار مزید بھی نظر آتے ہیں جو بلوچی زبان اور ادب کا سب سے بڑا اثاثہ ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں کہ خطے کی دیگر ثقافتی گروہ اس وصف سے مبرا ہیں مگر جس قدر رومانوی کردار بلوچ قوم میں ملتے ہیں شاید ہی کسی دوسری قوم میں ملتے ہوں۔ علاوہ ازیں دوسری اقوام کے ان رومانوی کرداروں پر دیگر لوگوں نے منظوم اور منثور ادب تخلیق کی ہے جبکہ بلوچی کے رومانوی کردار بذاتِ خود عشق اور ادب دونوں کے خالق ہیں۔ بہت کم کردار ایسے

ہوں گے جن کی نشاندہی یا ان کی عشقیہ داستان پر دیگر شعراُ اور ادباُ نے تحریر کیا ہو وگرنہ بلوچ خود ہی عاشق اور خود ہی ادیب وشاعر ہے۔

بلوچی رومانوی داستانوں کا جہاں ادبی حوالے سے بڑی اہمیت ہے تو تاریخ بلوچ قوم اور بلوچستان میں بھی ان کرداروں کا جلوہ اور سرگرم کردار نظر آتا ہے اور اُس لمحے یہ ہرگز نہیں لگتا کہ یہ کردار صرف ایک مجنوں یا صحرانورد دیوانہ ہے بلکہ اُس لمحے جب اس کی قوم اور وطن کو اس کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اپنے لطیف جذبات اور عشقیہ خواہشات کو قربان کرتے ہوئے وطن اور قوم کی حفاظت کے لیے دوڑ پڑتا ہے اور اپنی محبوبہ سے دوبارہ ملنے کے وعدے اور قومی فرض کی تکمیل کے بعد ملاقات کا کہہ کر میدانِ رزم اور بساطِ سیاست پر سرگرم کردار ادا کرتا نظر آتا ہے یعنی وہ محبت میں اندھا نہیں ہوتا اور نہ ہی اپنی یا اپنی محبوبہ کی بدنامی کا باعث بنتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے جب بھی ان عشقیہ اور رومانوی کرداروں کا حال بیان کیا جائے تو بلوچستان کی قومی اور سیاسی تاریخ کے حوالے سے بھی ان کے کردار کا جائزہ لیا جائے اور نہ صرف ان کی داستانِ محبت پر طبع آزمائی کی جائے بلکہ ان کے سیاسی اور تاریخی کردار کو بھی منظر عام پر لا کر ان ہستیوں کی سرگرمیوں اور کردار وعمل کی اہمیت کو بیان کیا جائے۔

زیرِ نظر کتاب بھی اُن مشاہیر کے بارے میں ایک چھوٹی سی کاوش ہے جنہوں نے بلوچ قوم کی رومانوی تاریخ کو جلا بخشی اور بلوچ تاریخ کے اس خوبصورت پہلو کی تکمیل کر کے ہر کس وناکس کو یہ اطلاع دی کہ بلوچ قوم ایک امن پسند اور محبت کرنے والی قوم ہے جسے بعض اوقات تاریخ سے ناآشنا اور نابلد لوگ صرف جنگجو اور رزم آراُ قوم تحریر کرتے ہیں۔ اس کتاب کے منظر عام پر آجانے کے بعد اس بات کی بہتر طور پر وضاحت ہوگی کہ بلوچ قوم کو امن اور آشتی سے محبت ہے جبکہ رزم آرائی پر انہیں ہمیشہ مجبور کیا گیا ہے۔ اگر بلوچ قوم کی طویل تاریخ میں شدید رزم آرائیوں کی تاریخ ملتی ہے تو یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ کیا بلوچوں نے یہ جنگیں ایرانی، یونانی، ہندی، عرب، ترک، مغل اور انگریز اقوام کے ملکوں میں جا کر لڑی ہیں یا ان اقوام کے بلوچستان پر حملوں کے خلاف مزاحمت کی ہے۔ یقیناً مطالعہ اور تاریخی حقائق کے پڑھنے سے یہ بات واضح ہوگی کہ بلوچوں نے ہمیشہ اپنے دفاع کی جنگ لڑی ہے اور انہوں نے کبھی بھی کسی دوسری قوم پر نہ تو جنگ مسلط کی ہے اور نہ ہی کسی قوم کو اپنے زیرِ نگیں رکھنے کی

کوشش کی ہے۔ان کی ساری مدافعت اپنی قوم ووطن کی دفاع کی خاطر رہی ہے اور یہ سلسلہ ہزاروں سالوں سے جاری ہے۔

اس کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔باب اول: بلوچ سماج میں عورت اور مرد(ہر دو اصناف) کا مقام کے عنوان سے متصف ہے۔اس باب میں بلوچ سماج میں مرد اور عورت کی ذمہ داریوں اور سماجی مراتب و حیثیت کی وضاحت کی گئی ہے۔ باب دم میں بلوچوں کی رومانوی داستانیں بیان کی گئی ہیں اور اس کے لیے مختلف کتب اور ذرائع سے استفادہ کیا گیا ہے۔کوشش کی گئی ہے کہ اس سلسلے میں ان تمام کرداروں کا احاطہ کیا جاسکے جو اس قوم کے رومانوی پہلو کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں اور ان کا شمار بلوچ قوم کے اہم ترین اور جاوداں رومانوی کرداروں میں ہوتا ہے۔گو کہ اُن تمام کرداروں کو تو اس کتاب میں جگہ نہیں مل سکی جن کی کسی نہ کسی حوالے سے محبت کہانی کے تذکرے زبانی یا تحریری طور پر دستیاب ہیں پھر بھی کسی حد تک کچھ مشہور کرداروں کی داستانوں کو قلمبند کرنے اور ان پر روشنی ڈالنے میں کامیابی ہوئی ہے۔ کتاب کے آخری یعنی تیسرے باب میں بلوچ سماج اور بلوچی ادب میں رومانوی داستانوں کی اہمیت کے حوالے سے مختصر بحث بھی شامل مطالعہ ہے۔یقیناً اس کتاب کے ابواب مطالعہ کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرنے میں کامیاب ہوں گے اور قارئین ان موضوعات سے نہ صرف لطف اندوز ہوں گے بلکہ محققین بھی اس سے استفادہ کرسکیں گے۔

زیرِ نظر کتاب بلوچوں کے رومانوی کرداروں کے بارے میں ایک تحقیقی کاوش ہے جسے یقیناً ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور امید ہے کہ قارئین کرام اسے ضرور پسند فرمائیں گے۔

آپ کی دعاؤں کا طلبگار

فاروق بلوچ

باب اول

بلوچ سماج میں عورت کا مقام

مختصر جائزہ

"اس کائنات کی سب سے خوبصورت شئے عورت ہے کہ جو ماں کی صورت میں ہو، یا بہن کی شکل میں، وہ چاہے رفیقہ حیات ہو یا گڑیا جیسی بیٹی۔ اس کا ہر روپ حسین و جمیل ہے۔"

بلوچ سماج میں عورت کے مقام و مرتبہ پر روشنی ڈالنے سے قبل یہ دیکھنا ضروری ہے کہ تاریخ میں عورت کا کردار کیا رہا ہے اور بلوچ تاریخ میں عورت کو کیا حیثیت حاصل رہی ہے۔ زیرِ نظر سطور میں تاریخ کے قدیم اوراق پر عورت کے کردار کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ماضی قدیم سے ہی اس صنف کی حیثیت اور کردار کو واضح کیا جاسکے اور اسے بلوچستان کے معاشرتی نظام کے تناظر میں دیکھا اور پرکھا جاسکے۔

بلوچ سماج اور تاریخ:

عورت سماجِ انسانی کی روح ہوتی ہے کہ جس کے بغیر بلاشبہ نہ تو زندگی کی تخلیق ہوسکتی ہے اور نہ ہی اس کائنات کے خالق کی مقصدیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اگر انسانی ارتقاء میں خاندان سب سے اہم اور بنیادی کردار ادا کرتا ہے تو اس خاندان کی اصل بنیاد گزار ایک

عورت ہی ہوتی ہے کہ جو انسانوں کو جنم دیتی ہے اور معاشرے میں عددی لحاظ سے اضافہ کرتی ہے اور خاندان کو قبیلہ اور قبیلوں کو نسلوں اور اقوام میں تبدیل کر دیتی ہے۔ بلاشبہ عورت کی ہمدردی پہاڑوں سے بھی اونچی ہوتی ہے اور اس کی محبت اور خلوص کو کسی بھی پیمانے میں ناپا نہیں جاسکتا۔ عورت ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے روپ میں یقیناً تحفہ خداوندی ہے اور جس گھر میں کوئی عورت نہ ہو وہ مثلِ ویرانہ ہوتا ہے بھلے اس میں دس مرد بستے ہوں مگر وہ گھر مکمل طور پر خالی خالی اور غیر منظم نظر آتا ہے، اور اگر پورے معاشرے کو عورت کی ذات سے خالی کر دیا جائے تو بھلا وہ معاشرہ کتنی دیر اپنا وجود قائم رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا اس حقیقت سے انحراف نہیں کرنا چاہیے کہ عورت معاشرتی بقاء کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ مرد ذات ضروری ہوتا ہے۔ مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ اکثر و بیشتر تقریباً دنیا بھر میں عورت کو وہ مقام، مرتبہ، اہمیت اور حیثیت نہیں دی جاتی کہ جس کی وہ حقدار ہے۔ اسے بعض کمزور اور بوسیدہ معاشروں میں انتہائی پست درجہ کا حامل کردار خیال کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض وحشی اور پست معاشروں میں خاص تہواروں پر عورتوں کی قربانی تک دی جاتی ہے اور ایسی سیکڑوں مثالیں ہمیں ماضی کی تاریخ میں بھی ملتی ہیں کہ جہاں دریائی سیلابوں کو روکنے کے لیے جوان لڑکیوں کو سپردآب کیا جاتا تھا تا کہ ناراض دیوتا ایک جوان اور خوبصورت لڑکی پا کر خوش ہو جائیں اور سیلاب کو ختم کر دیں یا کم از کم ٹال دیں۔

پاکستان ایک کثیر القومی ملک ہے کہ جہاں کئی ثقافتی گروہ رہتے ہیں جن کا تاریخی پس منظر انتہائی طویل ہے۔ پاکستان کے تمام قومی گروہ مثلاً بلوچ، سندھی، پشتون اور کئی دیگر چھوٹے بڑے قومی اور نسلی گروہ۔ ان میں سے ہر گروہ کی اپنی ثقافت، روایات، سماجی ادارے اور جغرافیائی حدود ہیں۔ یہ تمام گروہ صدیوں سے اپنے اپنے حدود میں رہتے چلے آرہے ہیں اور ہمیشہ نہ صرف ایک دوسرے کی ثقافتوں پر اثرانداز ہوتے رہے ہیں بلکہ بسااوقات بیرونی تہذیبوں کے بھی بڑے گہرے اثرات یہاں کے معاشرتی نظام کو متاثر کرتے رہے ہیں جن کی گہری چھاپ پاکستان کے جغرافیائی حدود میں رہنے والی تمام اقوام کی ثقافتوں میں نظر آتی ہے۔ بلوچ، سندھی اور پشتون اقوام کی بہت ساری رسومات اور رواجات آپس میں ملتے جلتے ہیں اور خصوصاً عورت کی عزت اور احترام کے حوالے سے یہ معاشرے مثالی سمجھے جاتے ہیں۔

عورت اور قدیم تہذیبیں:

دنیا کی تاریخ پر اگر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو پوری دنیا کی تاریخ میں کئی نشیب و فراز نظر آئیں گے۔ کوئی بھی تہذیب کہ جس نے مقامی، براعظمی یا بین الاقوامی شہرت اور ناموری حاصل کی ہو بالآخر فنا ہی اس کے نصیب میں آئی ہے۔ چاہے ہم اولین انسانی بستیوں پر نظر ڈالیں یا ان عظیم تہذیبوں پر کہ جنھوں نے شہرت، ناموری، ترقی، ملک گیری اور طاقت میں عروج و کمال حاصل کر لیا تھا کوئی بھی فنا کے ہاتھوں نہ بچ سکا۔ طاقتور تے ہمیشہ کمزور کا گلہ گھونٹا۔ اس تمام تر انسانی تاریخ میں عورت کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے جس کی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ عورت کو ہمیشہ محکوم اور مظلوم رکھا گیا اور مرد نے ہمیشہ اسے اپنا دست نگر بنائے رکھا۔ یہ بات تاریخی دور کی چند تہذیبوں یا تہذیبی ادوار کی حد تک تو درست ہے یا پھر ان وحشی قبائل کی حد تک کہ جہاں عورت کو کسی قابل نہیں سمجھا جاتا تھا مگر یہ بات تمام انسانی ادوار اور تمام معاشروں پر صادق نہیں آتی۔ کیونکہ تاریخ سے قبل بھی ایک دور گزرا ہے کہ جسے قبل از تاریخ دور کہا جاتا ہے، یعنی وہ دور کہ جب انسان نے نیا نیا زمین پر بسنا، کچے یا جھونپڑا نما گھر بنانا، ابتدائی بنیادوں پر زراعت کا ہنر، مٹی کے برتن بنانا وغیرہ سیکھا تھا۔ اس دور کو عام طور پر ابتدائی اشتمالی نظام یا First Comparative System کہتے ہیں۔ (سبط حسن (2009 پندرہواں ایڈیشن):23-11) اس زمانے میں انسان جو بھی پیداوار حاصل کرتا وہ کسی کی بھی انفرادی ملکیت نہیں ہوتی تھی بلکہ اس پر کمیونٹی کے سارے لوگوں کا برابر کا حق ہوتا تھا۔ اس وقت بھی معاشرے میں استحکام قائم رکھنے کی ضرورت تھی اور اس استحکام کو قائم رکھنے کی ذمہ داری عورت کو سونپ دی گئی کہ جسے بھاگوان کہا جاتا تھا۔ (بلوچ (2012):264) یعنی روزی تقسیم کرنے والی۔ یہ تھا مردانہ معاشرے کا پہلا اور بنیادی قدم کہ جس نے سیاسی اور سماجی ذمہ داریاں عورت کو سونپ دیں۔ قدیم معاشرے زرعی ہوتے تھے یعنی انسان بالکل ابھی ابھی شکاری زندگی ترک کر کے اپنی بقا کی خاطر دیگر وسائل قدرت سے استفادہ کرنا شروع کر چکا تھا اور زراعت کا آغاز انسانی معاشرے میں انقلابی تبدیلی کا باعث بنا اور انسان خود کفیل ہوتا گیا۔ اس کی پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ ہوا اور اس نے کئی صنعتیں مثلاً برتن سازی،

چمڑا سازی، چوب سازی وغیرہ میں بے پناہ ترقی کی۔ ماقبل از تاریخ انسانی دور کا سفر ہزاروں سالوں پر محیط ہے۔

دنیا کے جن مقامات پر بھی آثار قدیمہ دریافت ہوئی ہیں ان میں گو کہ بعض اشیا یا پورے سماج ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے مگر ایک بات تمام معاشروں میں یکساں ملتی ہے یعنی عورت کی قدیم مورتیاں۔ جن سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ عورت کو ہر معاشرے میں تقدس کا انتہائی درجہ حاصل تھا اور اس کی مورتیاں بنا کر ان کی باقاعدہ پوجا کی جاتی تھی۔ آثار قدیمہ کی دریافتوں سے یہ بات آشکارا ہوتی ہے کہ عبادت گاہوں اور گھروں میں عورتوں کی مورتیاں رکھی جاتی تھیں اور کسی بھی کام یا عمل کے آغاز سے پہلے ماتا مورتی کی پوجا کی جاتی تھی۔ بعض بت پرست معاشروں میں اب تک عورتوں کے مورتیوں کی نہ صرف پوجا کی جاتی ہے بلکہ معاشرتی طور پر بھی عورت کو اعلیٰ درجہ اور سماجی مرتبہ حاصل ہے۔ مثال کے طور پر ہندو مذہب و ثقافت میں کئی ایسی مورتیاں شامل ہیں کہ جو عورتوں کی ہیں اور ہندو دیو مالا میں ان عورتوں کا اہم ترین کردار رہا ہے۔ اسی طرح قدیم مصری، قدیم عراقی اور دنیا کی دیگر قدیم تہذیبوں میں عورت کا درجہ و مقام بہت بلند ہوتا تھا حتیٰ کہ دیویاں بسا اوقات سب سے بڑے اور خالق دیوتا کے کاموں میں بھی مداخلت کرتی تھیں اور اپنی من مانیاں ضرور دکھاتی تھیں۔ جواب میں ان کی ناز برداریاں اٹھائی جاتی تھیں اور انہیں خوش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی نہ کہ انہیں مارا پیٹا جاتا تھا یا ان پر کوئی تشدد کیا جاتا تھا، بلکہ تمام دیوتا مل کر ایک روٹھی ہوئی دیوی کو منانے میں لگ جاتے اور کائنات کے سارے کام اور ذمہ داریاں چھوڑ دیتے تھے اور جب تک وہ روٹھی ہوئی دیوی کو نہ مناتے آسمانی امور کارُکے رہتے۔

قبل از تاریخ دور کی تمام بڑی تہذیبوں میں دنیا اور انسان کی تخلیق کے بارے میں جتنے بھی عقیدے تھے ان سب نظریات اور عقائد میں تخلیق کے عمل میں دیوتاؤں کے ساتھ دیویاں بھی شامل رہی ہیں اور بنیادی کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ ان دیوی دیوتاؤں کے تذکروں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں کہ جن کے قبضہ و اختیار میں بہت کچھ ہوتا تھا۔ میسوپوٹیمیا یعنی قدیم عراق کی تمام تہذیبیں (سمیری، آشوری، کلدانی، بابلی وغیرہ) میں عشتار دیوی (سبط حسن (2002 تیرھواں ایڈیشن):126-102) کا درجہ اور مقام اور قدیم

فارس کی قبل از زرتشتی تہذیب میں اناہیتا یا ناہید دیوی (قاضی (سال اشاعت ندارد):19) کا مقام ومرتبہ تاریخ کے صفحات پر مرقوم ہے۔ اسی طرح قدیم مصری، فنیقی اور یونانی تہذیبوں میں بھی عورت کا کردار یا تو مرد سے افضل رہا ہے یا پھراس کے برابر۔ (سبط حسن (2002): 127-146) صدیوں تک یہ تقدس برقرار رہا اور اس میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں آئی۔ اگر کوئی تہذیب زوال پذیر ہو جاتی اور اس کی جگہ کوئی اور تہذیب لے لیتی تو بھی دیویوں کے درجات میں کوئی کمی نہیں آتی جبکہ مرد دیوتاؤں پر اکثر زوال آتا رہتا تھا۔ اسی طرح ہندوستان کی قدیم تہذیب کے آغاز سے تا حال ہندو معاشرے میں عورت کا جو مقام اور مرتبہ ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر ہندو مندر میں بھگوان کے ساتھ ساتھ کسی دیوی کا بت ضرور رکھا ہوتا ہے۔ ہندو مذہب میں کئی دیویاں ہیں جن کے قبضہ واختیار میں بہت ساری اہم ذمہ داریاں ہیں، ان دیویوں کے مندر تک الگ بنائے جاتے ہیں اور ان کی عبادت بھی مخصوص انداز اور طریقہ کار کے مطابق کی جاتی ہے۔

عورت بحیثیت شہنشاہ ماضی قدیم میں

صرف یہی نہیں کہ قبل از تاریخ دور میں عورت دیوی کی صورت میں نظر آتی ہے یا صرف اس کا مقام ومرتبہ مذہبی نوعیت کا ہے بلکہ ایسی شہادتیں بھی ملتی ہیں کہ جن سے یہ بات آشکارا ہوتی ہے کہ زمانہ ماضی قدیم میں عورتوں کو مکمل سیاسی اختیارات بھی حاصل تھے اور وہ ملکی سربراہ اور شہنشاہ بھی بن سکتی تھیں۔ قدیم عراق کہ جسے میسوپوٹیمیا کہا جاتا تھا (امجد (1989):223,232) میں ایک قوم بنی آشور کا تذکرہ ملتا ہے کہ جس نے بابل میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی (ہیروڈوٹس (2001):102) جس کی سرحدیں مشرق میں موجودہ ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھیں اور شمال میں وسط ایشیا تک اس قوم کا قبضہ تھا۔ مصر کی عظیم الشان تہذیب اس قوم کے سامنے سرنگوں ہو کر باجگذار بن چکی تھی جبکہ ایران پر اس کا مکمل تسلط قائم تھا حتیٰ کہ اپنے زمانے کا سپر پاور تھا۔ اس قوم نے کئی بار اور صدیوں تک عراق سمیت ایک وسیع خطہ زمین پر حکومت کی۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس قوم میں ایک ایسی عورت گزری ہے کہ جس نے اس تہذیب کو اوج ثریا عطا کی اور اس کی سرحدیں موجودہ

ہندوستان تک پہنچا دیں۔(ہیروڈوٹس (2001):102) اس بہادر حکمران عورت کا نام مؤرخین سیمی رامس تحریر کرتے ہیں (ہیروڈوٹس (2001):03-102) اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ شاہسوار عورت بابل سے نکلی اور پھر فتوحات کے پھریرے اڑاتی ہوئی آخرکار ہندوستان پہنچی مگر بدقسمتی سے اس عورت کو ہندوستان فتح کرنے کی مہم میں ناکامی ہوئی اور شکست کھا کر براستہ مکران، عازم ایران و عراق ہوئی۔(سمتھ (2001):125) بابائے تاریخ ہیروڈوٹس اپنی کتاب کہ جو دنیا میں تاریخ کی پہلی کتاب مانی جاتی ہے، لکھتا ہے کہ صرف سیمی رامس ہی نہیں بلکہ ایک اور آشوری خاتون نے بھی عراق پر حکومت کی ہے کہ جو اصلاحات اور رفاہی کاموں کے لیے تاریخ میں بڑی شہرت رکھتی ہے۔ ہیروڈوٹس اس کا نام نیٹوکریس تحریر کرتا ہے۔ (ہیروڈوٹس (2001):102) اور یہ بھی لکھتا ہے کہ اس خاتون حکمران کے دور میں عراق نے بڑی ترقی کی۔گوکہ اس خاتون نے سیمی رامس کی طرح فتوحات نہیں کیں مگر ملک کے اندر ایسی اصلاحات نافذ کیں کہ جن کی بدولت آشوری تہذیب بامِ عروج تک پہنچ گئی۔ (ہیروڈوٹس (2001):03-102) اسی طرح ماضی کی کئی دیگر تہذیبوں میں بھی عورتوں کا صرف مذہبی تقدس کا مقام و مرتبہ ہی نظر نہیں آتا بلکہ ان کے سیاست اور حکمرانی کی تاریخ بھی ملتی ہے۔

عورت اور مذاہب آسمانی:

مذاہب انسانی میں بھی عورت کا کردار نظر آتا ہے یعنی کہیں پر عورت پیغمبر کا وفادار ترین ساتھی کے روپ میں نظر آتا ہے تو کہیں پر اس کی بااعتماد رفیق حیات کے روپ میں۔اگر کہیں پر ہاجرہ کا بیٹا قربانی کیلیے مقبول ہوتا ہے تو کہیں پر مریم کے لعل کو صلیب پر لٹکایا جاتا ہے۔اگر کہیں سائرہ کا شوہر دھکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا جاتا ہے تو کہیں پر موسیٰ کی ماں اپنے شیر خوار لخت جگر کو فرعونی سپاہیوں کی خون آشام تلواروں سے بچانے کی خاطر سپرد سیل رواں کر دیتی ہے اور اللہ کے نام کو سربلند کر دیتی ہے۔مذاہب میں تو آغاز سے ہی عورت مرد کے ساتھ ہے اور اسے عقل و دانائی عطا کرنے کا سبب بنتی ہے اور ساتھ ہی دنیا میں لانے کی وجہ۔اگر حواؑ آدمؑ کو دنیا میں لانے کا سبب نہ بنتی تو ہمارے پیارے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں کیسے تشریف لاتے۔یعنی اگر عورت نہ ہوتی تو انسانی معاشرہ تو کجا انسان کا تصور بھی نہ ہوتا بلکہ

بذاتِ خود تصور تک نہ ہوتا۔ کسی بھی الوہی مذہب کی تعلیمات میں عورت کی حق تلفی نہیں کی گئی ہے چاہے وہ یہودیت ہو یا عیسائیت۔ حتیٰ کہ جتنی بھی آسمانی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئی ہیں ان میں عورت کا درجہ معاشرتی لحاظ سے بلند تر بیان ہوا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعدازاں ان مذہب کے ماننے والوں اور مذہبی وحکمران طبقات نے اپنے مفادات کی خاطر اپنے بعض اقدامات کو مذہبی احکامات کا نام دے کر اپنے عقائد کا حصہ بنایا ہو یا پھر اپنے سیاسی اور ذاتی مفادات کی خاطر بعض عقائد واحکامات کو مذہب سے خارج کیا ہو وگرنہ اللہ پاک نے جس صنف کو خود تخلیق کیا ہو اس کی حق تلفی کا حکم نہیں دے سکتا۔ لہٰذا یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی آسمانی مذہب نے ذاتِ انسانی کی نفی نہیں کی اور نہ ہی جنس کے لحاظ سے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی۔ بلکہ ہر مذہب نے تقویٰ کو ہی اپنا بنیادی قانون بنایا اور انسانوں کو تولنے کا پیمانہ بھی تقویٰ قرار پایا۔ البتہ یہ درست ہے کہ ماضی کے غیر الہامی اور بت پرست طبقات کی فحاشیت، عریانیت اور مورتیوں کی پوجا کے برعکس الہامی مذاہب نے عورت کے لیے معاشرہ میں زیادہ باوقار اور باعزت مقام کا تعین کیا۔ پوجا کے لیے الہامی مذاہب نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو مخصوص کیا اور عورت کو ماں، بہن، بیوی اور بیٹی جیسے بلند اور اعلیٰ مراتب عطا کیے۔ الہامی مذاہب کے پیروکاروں نے بھی آہستہ آہستہ اپنے مذاہب میں ترامیم وتبدیلیاں کر کے قدیم قوانین چھوڑ دیے جس کی وجہ سے اکثر اوقات عورت کا مقام معاشرتی طور پر گھٹتا گیا اور مرد حضرات اپنی طرف سے کی گئی مذہبی ترامیم کے ذریعے عورت کے مقام اور مرتبہ پر ڈاکہ ڈالتے اور اس کے حقوق سلب کرتے گئے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا اور پھر کوئی پیغمبر یا مصلح سابقہ عقائد واحکامات کی بحالی کیلئے جدوجہد کرتا۔

عورت اور اسلام:

حتیٰ کہ تہذیب انسانی کے مذہبی عقائد کا سفر عرب آ پہنچا اور 571ء میں اس کائنات کے سب سے بہترین انسان نے اس دنیا کو اپنے وجود مبارک سے شرف عطا کیا اور رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے اور ایک ایسا بہترین نظامِ انسانی اپنے ساتھ لے کر آئے کہ یقیناً اس نظام پر مکمل طور پر عمل کرنے سے ہر انسان چاہے

مرد ہو یا عورت، فلاح پا سکتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری پیغمبر ہیں کہ جن کے بعد نبوت کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ساتھ دین اسلام لے کر آئے کہ جس میں ہر چیز اور ہر صنف کے الگ الگ مراتب مخصوص کیے گئے اور ہر ایک کے حقوق کا تعین کیا گیا۔ اور یہ وہ دین ہے کہ جس کے تحفظ اور سلامتی کی ذمہ داری خود اللہ پاک نے اٹھائی ہے۔ لہٰذا اس کے احکامات اور عقائد میں تبدیلی کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اگر ان اسلامی احکامات پر صحیح عملدر آمد کی جائے تو یقیناً کسی بھی شخص کو چاہے وہ عورت ہو یا مرد، کبھی حق تلفی کی شکایت نہیں ہوگی۔ قرآن مجید میں سورہ نساء اور سورۃ نور سمیت کئی دیگر مقامات پر اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے حقوق اور ان کے لیے احکامات بیان فرمائے ہیں اور ہر ایک بات کی صحیح صحیح وضاحت کی ہے۔ علاوہ ازیں احادیث مبارکہ میں بھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر صنف کے الگ الگ حدود بیان فرمائے ہیں جن پر ہر دو اصناف کے عمل کرنے سے شکایتیں خود بخود ختم ہو سکتی ہیں۔

اسلامی تاریخ کو اگر بغور دیکھا جائے تو اس میں ہر شعبہ زندگی میں عورت سرگرم کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔ کیا کسی نے اس بات پر کبھی غور کیا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت ملنے سے پیشتر ایک عورت نے ہی پہچان لیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی معمولی ہستی نہیں ہیں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی زوجہ مبارکہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ والطاہرہ رضی اللہ عنہا کہ جن کو یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ آپ رضی اللہ عنہا پہلی مسلمان تھیں۔ یعنی اسلام کے تاجدار کے ساتھ جب رفیق سفر کی ضرورت اللہ تعالیٰ نے محسوس کیا تو حضرت خدیجۃ الکبریٰ والطاہرہ رضی اللہ عنہا کی صورت میں بہترین رفیق حیات عطا فرمایا۔ حتیٰ کہ اسلام کی یہ جانثار خاتون اور ام المؤمنین جب تک زندہ رہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسری شادی نہیں کی حالانکہ کثیر الازدواجیت عرب کے عام قوانین کا حصہ تھا اور تقریباً ہر عرب اس پر عمل کرتا تھا مگر جب تک حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا زندہ رہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی زندگی میں دوسری عورت نہیں لائے۔ حتیٰ کہ ان سے محبت کا یہ عالم تھا کہ جب مدینۃ المنورہ میں ایک بار ام المؤمنین حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کچھ سخت الفاظ کہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا سخت برا منایا اور ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ اسی طرح دیگر امہات المؤمنین میں سے بھی ہر ایک نے اپنے حدود اور اختیارات کے مطابق اسلامی معاشرے کی بقا اور سلامتی

اور دین کی سربلندی کیلئے خدمات سرانجام دیں۔ سماجی کاموں میں امہات المؤمنین بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ غریب اور مستحق بچیوں کی شادی اور جہیز وغیرہ کا بندوبست کرنا، بیواؤں، ضعفاء، غریب اور مساکین کی خوب خوب مدد کرتی تھیں اور اس نوع کی دیگر سماجی کاموں میں پیش پیش رہتی تھیں۔ تاریخ اسلام کے صفحات امہات المؤمنین کی سماجی خدمات کے تذکروں سے بھری ہوئی ہیں اور ان کی سماجی خدمات کو خوب اجاگر کرتی ہیں۔

اسی طرح اسلامی عسکری تاریخ میں بھی کئی خواتین کے تذکرے ملتے ہیں کہ جنہوں نے جنگوں میں نہ صرف بہادری کے کارنامے سرانجام دیے بلکہ افواج کی سربراہی بھی کی۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں بلکہ جنگ جمل کو ہی دیکھیئے کہ جس میں ام المؤمنین حضرت بی بی عائشہؓ حضرت علیؓ کے خلاف لشکر کی کمانداری کرتی ہے اور جمل نامی اونٹنی پر سوار ہوکر میدان جنگ میں کُود پڑتی ہے اور اپنے افواج کی بھرپور کمانداری کرتی ہے۔ ان کی اونٹنی کی وجہ سے یہ جنگ، جنگ جمل مشہور ہوئی۔ (لینگر (1968 تیسرا ایڈیشن): 8-1) اسی طرح احزاب یعنی جنگ خندق میں حضور پاک ﷺ کی پھوپھی، حضرت زبیر بن العوامؓ کی رفیقہ حیات اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی صفیہؓ نے بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ جن کی وجہ سے یہودیوں اور مشرکین مکہ کا مشترکہ لشکر بھاگ جانے پر مجبور ہوا۔ اس طرح کے سیکڑوں واقعات سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے۔

ہندوستان یعنی برصغیر میں بھی ایسی خواتین کے تذکرے ملتے ہیں کہ جنہوں نے سیاسی اور عسکری تاریخ میں بڑا نام پیدا کیا۔ سلطان شمس الدین التمش کی صاحبزادی سلطانہ رضیہ کے نام سے ہر شخص واقف ہوگا کہ جنہوں نے اپنے والد کی وفات کے بعد حکومت و سیاست کی باگ ڈور سنبھالی گو کہ وہ چار سال بعد قتل کردی گئی مگر تاریخ گواہی دیتی ہے کہ ان چار سالوں میں انہوں نے ہندوستان کی نوزائیدہ اسلامی مملکت کو بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ اسی طرح ہندوستان میں برطانوی تسلط کے خلاف جھانسی کے علاقہ کی ملکہ، کہ جسے تاریخ میں جھانسی کی رانی کے نام سے شہرت ملی، (مارکس (2002):277) کی تاریخ ساز مسلح جدوجہد سے ہر شخص واقف ہوگا۔ ان کا کردار برصغیر کی تاریخ کو جلا بخشتی ہے۔ مغلیہ عہد میں تو دربار اور ریاست کے اکثر امور میں محل کی خواتین کی مداخلت عام تھی اور بعض ریاستوں کے گورنر

تک کی تعیناتی ان کی سفارش سے ہوتی تھی یا وہ خود ان کی تعنیاتی کے احکامات جاری کرتے تھے اور روادار مغل حکمران ان احکامات کی مخالفت نہیں کرتے تھے بلکہ انہیں من وعن قبول کر لیتے تھے۔

اس طرح کی دیگر سیکڑوں عسکری واقعات سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں کہ جو یقیناً تاریخ میں عورت کے اعلیٰ ترین کردار اور عمل کی غماز ہیں اور تاریخ میں یہی واقعات عورت ذات کی قدر ومنزلت میں اضافہ کا باعث بنتی ہیں۔ صرف اسلامی دنیا ہی نہیں بلکہ دیگر اقوام اور تہذیبوں میں بھی عورت کا کردار واضح طور پر نظر آتا ہے اور تاریخ کی کتب میں ان کے کردار وعمل کے کثیر تذکرے ملتے ہیں۔

بلوچستان کی قدیم تہذیب اور عورت کا مقام:

جہاں تک بلوچستان کا تعلق ہے تو اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ پہلے بلوچستان کے ماقبل تاریخی پس منظر کو دیکھا جائے۔ بلوچستان کی ماقبل تاریخ دور کے بارے میں مہر گڑھ کے آثار یہ بتاتے ہیں کہ اس خطہ کا تہذیبی سفر لگ بھگ گیارہ ہزار سال قدیم ہے۔ (بلوچ (2012):55) یہی وہ اولین بستی شمار کی جاتی ہے۔ جہاں شکاری انسان نے اپنے لیے زمین پر مساکن بنائے اور پہاڑوں اور غاروں کی زندگی ترک کردی۔ کتب کے مطالعہ سے یہ بات بھی آشکارا ہوتی ہے کہ زراعت کا آغاز بھی عورتوں کی محنت اور تحقیق کا نتیجہ تھا کہ جو قابل استعمال قدرتی جڑی بوٹیوں اور پودوں کے بیجوں اور پھلوں کو استعمال کرنے لگیں، بیجوں کی بوائی سیکھ لی اور خوردنی بیجوں کو زیرِ استعمال لائے۔ زراعت کی اس دریافت نے انسانی زندگی کا دھارا تبدیل کر دیا۔

اسی طرح ابتدائی برتن سازی کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ عورت ہی اس فن کی موجد ہے اور ابتدائی ٹوکری برتن بنا کر اسے آگ پر پختہ کرنے کا فن بھی عورت نے ہی مردوں کو سکھایا البتہ اس فن میں جدت، تبدیلی اور انقلاب اس وقت آیا جب کمہار کا پہیہ ایجاد ہوا اور فن برتن سازی میں نمایاں اور انقلابی تبدیلی آ گئی۔ اس تبدیلی کی وجہ سے صدیوں، بلکہ ہزاروں سالہ قدیم اشتمالی نظام یعنی ابتدائی کمیونزم کو شدید دھچکا لگا کیونکہ چاک پر کم وقت میں

زیادہ تعداد میں اور زیادہ نفیس وخوشنما برتن بننے لگے اور اس زائد پیداوار نے ہی بین الاقوامی تجارتی ومعاشی رشتوں کو جنم دیا۔ انسانی تعلقات کی وسعت میں اضافہ ہونے لگا۔ مگر تب تک بھی بلوچستان کی قدیم تہذیب میں عورت کا تقدس قائم تھا اور اسے معاشرے میں مکمل برتری حاصل تھی۔

بلوچستان کا قدیم معاشرہ مدرسری نظام پر مشتمل تھا کہ جس میں پوری سوسائٹی کی سربراہی ایک عورت کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور عورت ہی خاندان کی سربراہ ہوتی تھی۔ بلوچستان کے طول وعرض میں ہزاروں مٹی کے ٹیلے ماضی کی یادگار کے طور پر ملتے ہیں۔ ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر دیہات میں یہ آثار پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سارے ٹیلوں پر ماہرین آثار قدیمہ تحقیقی کام کر چکے ہیں جس کے نتیجہ میں جہاں ان ٹیلوں سے ہزاروں کی تعداد میں پختہ مٹی کے برتن نکلے ہیں تو ساتھ ہی لاتعداد مٹی کی مورتیاں بھی برآمد ہوئی ہیں۔ یہ تمام مورتیاں عورتوں کی ہیں۔ بلوچستان کے ٹیلوں ژوب، لورالائی، قلات، خضدار، مکران اور مہر گڑھ کی کھدائی کے دوران ایسی لاتعداد مورتیاں برآمد ہوئی ہیں۔ گو کہ ان مورتیوں کی بناوٹ میں فرق ہے مگر یہ سب کی سب عورتوں کی مورتیاں ہیں۔ ماضی کا انسان زمین سے محبت کرتا تھا اور اسے ماں کا درجہ دیتا تھا لہٰذا یہ تمام مورتیاں اسی زرعی دور کی پیداوار ہیں کہ جب انسان اپنی بقاء کی خاطر زمین کے ساتھ اپنے تمام رشتے جوڑ چکا تھا اور زمین کی زرخیزی اور رزق عطا کرنے کی صلاحیتوں کی وجہ سے انسان نے اس کی پوجا شروع کی مگر چونکہ زمین کی کوئی واضح صورت ان کے سامنے نہیں تھی لہٰذا عورت کے کردار سے زمین کو تشبیہہ دے کر اس کی مورتیاں بنائی گئیں کیونکہ عورت بھی نسلوں کو جنم دینے اور انہیں پالنے کا کام کرتی ہے جبکہ زمین کا عمل بھی یہی ہوتا ہے۔ اس تصور کی بنیاد پر عورت کے مجسمے بنائے گئے اور اسے زمین سے تشبیہہ دے کر اس کی پوجا شروع کی گئی۔ یقیناً یہ عورت کیلئے زمانہ قدیم کی وحشی ادوار میں بہت بڑا اعزاز اور مرتبہ تھا کہ انسان نے اسے پوجا اور عبادت کے لئے مخصوص کیا۔

بلوچستان کا یہ قدیم اور ابتدائی نظام ہزاروں سالوں پر محیط ہے اور ان ہزاروں سالوں کی سماج پر عورت حاوی رہی ہے۔ اسے تمام تر سماجی اور سیاسی اختیارات حاصل تھے۔

مدرسری نظام کے زوال پذیر ہونے کے باوجود بلوچستان کے قدیم معاشرتی نظام میں عورت کی سماجی حیثیت اور ادب واحترام میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ اس کا سماجی مرتبہ اب بھی بلند تھا۔ البتہ سماجی، سیاسی اور پیداواری ادارے مرد کو منتقل ہوتے گئے اور اختیارات کا سرچشمہ بھی مرد قرار پانے لگا۔ لیکن اس عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچنے میں بھی صدیاں لگیں اور تب کہیں اختیارات عورت سے مرد کو منتقل ہوئے۔ مگر اس کے باوجود عورت کو معاشرے میں خاص مقام حاصل رہا اور بہر حال اس کی تقدیس اسی طرح جاری رہی۔

بلوچستان کا سماج قبائلی ہے یہاں آباد اقوام بلوچ اور پشتون ایک طویل تاریخ کے وارث ہیں۔ قبائلی سماج کے کچھ قوانین ہوتے ہیں کہ جو کہ برتر سماجی مرتبہ رکھنے والے بااثر افراد ترتیب دیتے اور بناتے ہیں مگر ان قوانین میں کسی کے استحصال سے زیادہ احتیاط کے جذبات زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں رہنے والے لوگ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ایک عورت کا اصل مقام اور مرتبہ کیا ہوتا ہے۔ بلوچ سماج گو کہ قبائلی سماج ہے مگر اس قوم کی تاریخ میں سیکڑوں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ جن میں عورت کا تقدس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ سب سے بڑھ کر بلوچی ضابطۂ اخلاق (Balochi Code of Honor) میں عورت کے تقدس اور احترام کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس مقام کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور یقیناً بہترین معاشرتی نظام کے لیے ایسے ضابطے مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔ بلوچی کوڈ آف آنر کے اہم نکات درج ذیل ہیں۔

بلوچ ضابطہ اخلاق:

1۔ تمام قبائل اور بین الاقبائلی تنازعات کا قبیلہ، سردار اور معتبرین کی کچہری میں بیٹھ کر فیصلہ کرنا اور اس پر کاربند رہنا۔

2۔ سیاہ کار اور سیاہ کارہ کو پناہ نہ دینا۔

3۔ باہوٹ کی حفاظت کرنا، اور حتیٰ الوسع فریقین کے درمیان سمجھوتہ کرنا۔

4۔ ہمراہی پر اگر اسکا کوئی دشمن حملہ آور ہو تو ہمراہی کا ساتھ دینا۔

5۔ قول وزبان کی پابندی کرنا۔

6۔ مجلس و کچہری میں ننگے سر نہ بیٹھنا۔
7۔ گھر میں داخل ہوتے وقت جوتے باہر نکالنا۔
8۔ سادات کا احترام کرنا۔
9۔ مجلس میں پاؤں نہ پھیلانا۔
10۔ خواتین کے سامنے ناشائستہ کلام اور نازیبا حرکت نہ کرنا۔
11۔ جھوٹ نہ بولنا اور جھوٹی افواہیں نہ پھیلانا۔
12۔ دشمن کو للکارنا اور اپنا نام و نسب اور وجہ قتال ظاہر کر کے حملہ کرنا۔
13۔ پیٹھ پیچھے سے دشمن پر حملہ نہ کرنا۔
14۔ عورتوں اور بچوں پر ہاتھ نہ اٹھانا۔
15۔ بھاگ جانے والے دشمن کا تعاقب نہ کرنا۔
16۔ لڑائی کے دوران جب کوئی سید درمیان میں آ جائے تو جنگ سے ہاتھ روکنا۔
17۔ اگر دشمن کی عورتیں باہر نکل کر لڑائی روکنے کی درخواست کریں تو ان کا احترام کرنا۔
18۔ کمتر ذات کے لوگوں اور ہندوؤں کو قتل نہ کرنا۔
19۔ جنگ میں گرفتار ہونے والے قیدی کو نہ تو قتل کرنا اور نہ اذیت دینا''۔
(خان (1965):10)

بلوچی رومانوی کہانیاں اور عورت:

ان درج بالا نکات میں کئی جگہوں پر عورتوں کا تذکرہ اور مختلف حالات میں ان کے ساتھ سلوک کے تذکرے ملتے ہیں۔ بلوچ تاریخ ایک ایسی تاریخ ہے کہ جس میں زندگی کے ہر شعبہ میں عورت سرگرم نظر آتی ہے۔ بلوچ تاریخ میں مہمان نوازی، جنگی کارنامے، پرصعوبت سفر، سماجی زندگی اور رومانوی کہانیوں میں بلوچ عورت اپنے پورے وجود اور مکمل کردار کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اگر بلوچی کی رومانوی داستانوں کو یکجا کیا جائے تو شاید رومانوی کرداروں کی اتنی بڑی تعداد دیگر تمام ثقافتوں میں ایک ساتھ نظر نہ آئے مگر بلوچ قوم کی رومانوی تاریخ اتنی بھرپور ہے کہ جو بلوچ تاریخ کو ایک الگ باب عطا کرتی ہے۔

ساری عشقیہ داستانوں کو عورت جنم دیتی ہے۔ حانی شہ مرید، بیبرگ گراں ناز، شہداد مہناز، عزت و مہرک، سمومست توکلی، سسی پنوں، حتیٰ کہ ایک طویل فہرست ہے کہ جن سے بلوچی رومانوی تاریخ ترتیب پاتی ہے ان میں سے ہر کہانی میں عورت کا رول بنیادی اور اہم ترین ہے اور اہم ترین بات یہ کہ ان کرداروں میں سے کوئی بھی کردار دیگر اقوام کی رومانوی کرداروں کی طرح قتل نہ ہوا اور نہ ہی اسے کاری کی بدترین رسم کا سامنا کرنا پڑا بلکہ ان کرداروں میں سے بعض میاں بیوی کے روپ میں ہی بعد ازاں تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ اکا دکا ایسے کردار ہوں گے جو سماج کی بیہمانہ اور قبیح رسموں کا شکار ہوئے وگرنہ زیادہ تر کردار یا تو آپس میں یکجا ہوئے یا ان میں سے کسی ایک کا انتقال ہوا تو دوسرے نے اس کی یاد میں ساری زندگی بسر کی، یا پھر زندگی بھر نہ ملے مگر ان کا روحانی تعلق برقرار رہا جس نے ان کی محبت کو امر کر دیا۔

علم و ادب اور بلوچ عورت:

اس میدان میں بھی بلوچ خواتین مردوں سے پیچھے نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اس میدان میں علم و ادب کے ایسے چراغ روشن کیے ہیں کہ جن کی لو سے ایک وسیع جہاں منور ہوا ہے۔ بھلا رابعہ خضداری کے نام سے کون واقف نہیں کہ جنہوں نے صدیوں پیشتر فارسی زبان میں ایسی شاعری کی کہ خود فارسی کے بڑے بڑے شعراءِ کرام ان کا کلام حیرت و استعجاب سے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح بلوچی رومانوی کرداروں کی ملکہ حانی بلوچی زبان کی انتہائی بلند پایہ شاعرہ تھیں۔ رند و لاشار یونین کے عہد میں بانک (محترمہ) ماہناز، گراں ناز، حانی، سیمک، رانی وغیرہ کی ادبی خدمات بلوچی زبان و ادب کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ دور جدید میں بھی کئی دیگر نام اس وسیع اور مشکل میدان میں ملتے ہیں کہ جو اپنی ذوق اور شوق کی تکمیل کر رہی ہیں اور مشاعروں اور محافل میں مردوں کے شانہ بشانہ نظر آتی ہیں۔

سیاسی میدان اور بلوچ خواتین:

دور جدید کی سیاست میں کئی خواتین اسمبلیوں میں بیٹھی ہوئی ہیں اور اہم اہم

وزارتوں کے قلمدان سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان سیاستدان خواتین میں سے کئی ایسے مشہور و معروف نام بھی ہیں کہ جن کا تعلق بلوچستان سے ہے جبکہ ان کی اکثریت بلوچ قوم کے مختلف قبائل سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔

بلوچ جمالیات کا بہترین عکس بلوچی کشیدہ کاری والے ملبوسات:

اسی طرح بلوچ خواتین کے کشیدہ شدہ ملبوسات وقار، جاذبیت، رعنائی، دلکشی، خوبصورتی اور جمالیات میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اگر نابرابری اور غیر مساوات کی بات ہوتی تو بلوچ معاشرہ میں عورت اس حد تک خوبصورت کپڑے ہرگز استعمال نہ کرتی بلکہ یہ بات بلوچ خواتین اچھی طرح جانتی ہیں کہ ان کے مرد چاہے شوہر ہو یا والد، بھائی ہو یا بیٹا سب ہی گھر کی خواتین کو بلوچی کپڑے زیب تن کرنے پر اصرار کرتے ہیں حالانکہ بلوچی کپڑے باقی ثقافتی کپڑوں کی نسبت زیادہ خوبصورت اور جاذبِ نظر ہوتے ہیں اور انتہائی مہنگے بنتے ہیں۔ اس سے ہی پتہ چلتا ہے کہ بلوچ معاشرے میں عورت کو مساوات ہی نہیں بلکہ مرد کی نسبت زیادہ آزادی اور ساتھ ہی تحفظ بھی حاصل ہے۔ عورت کے احترام کا یہ عالم ہے کہ اگر وہ کسی جاری قبائلی جنگ کے دوران میدان جنگ میں آجائے اور دونوں فریقوں کے مابین پڑ جائے تو وہ جنگ رک جاتی ہے اور فریقین مزید خونریزی کیے بغیر اپنے اپنے راستوں پر ہو لیتے ہیں۔ اگر عورت ساتھ ہو تو دشمن حملہ نہیں کرتا (خان (1965):10) اور اگر عورت اپنا دوپٹہ کسی مرد کے پیروں میں رکھ دے تو وہ خون بھی معاف کر دیتا ہے۔ (خان (1965):10) الغرض ایسی ہزاروں مثالیں بلوچ تاریخ میں تحریر صورت میں ملتی ہیں۔

میدانِ جنگ اور بلوچ عورت:

جنگوں میں بلوچ خواتین کا کردار نہ صرف نظر آتا ہے بلکہ وہ ہر جگہ کمان کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کمبرانی دورِ حکومت میں مائی بیبو کے بارے میں جب معلومات ملتی ہیں تو بڑی حیرت ہوتی ہے کہ وسطی دور میں بھی کہ جب دنیا کے کئی اقوام وحشیوں جیسی زندگی گزار رہے تھے اور عورتوں کے لیے تو ایسے معاشروں میں کوئی مقام نہ تھا ان کی حیثیت ماسوائے ایک فالتو پرزے

اور بچے جننے والی مشین کے اور کچھ نہ تھا۔ مائی بیبو میر احمد خان اول کی بہن تھی۔ میر احمد خان اول 1666ء میں قلات میں برسرِ اقتدار آیا اور سبی کے باروزئیوں کے ساتھ ان کی طویل جنگیں ہوئیں۔ میر احمد مسلسل پندرہ لڑائیوں میں شکست کھاتا رہا اور آخرکار دلبرداشتہ ہوگیا۔ ان حالات میں ان کی بہن مائی بیبو نے افواج کی قیادت سنبھالی اور سبی پر حملہ آور ہوئی گو کہ اس جنگ میں ان کی موت واقع ہوگئی مگر سبی بعدازاں قلات کے زیرِ تصرف آ گیا۔ (نصیر (2000):17) اسی طرح برطانوی عہد میں پہلی جنگ عظیم کے دوران مغربی بلوچستان کے بلوچ قبائل نے جرمنی اور ترکی کی حمایت میں برطانیہ کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اور طویل عرصہ تک برطانیہ کی ناک میں دم کیے رکھا۔ جلیانوالہ باغ کے قاتل جنرل ڈائر کو ان قبائل کی سرکوبی کی خاطر روانہ کیا گیا تو اسے بھی طویل عرصہ تک ان جنگجو قبائل نے خوب ستایا۔ ان بلوچ قبائل میں محمودزئی، گمشادزئی، یارمحمد زئی اور چند دیگر سرحدی قبائل شامل تھے۔ ان تمام قبائل کے سردار مختلف تھے مگر ان کی مشترکہ قیادت گل بی بی نامی ایک بلوچ خاتون کررہی تھی کہ جس کا شوہر اپنے قبیلہ کا سردار تھا مگر سپاہ کی قیادت گل بی بی کے ہاتھوں میں تھی۔ (ڈائر (1984):12) آج بھی بلوچ خواتین جانتی ہیں کہ انہیں اپنے معاشرے میں یکساں اہمیت حاصل ہے بلکہ وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ بحیثیت عورت کے ان کی حیثیت مردوں کی نسبت زیادہ ہے۔ بلوچ معاشرہ میں کم ازکم اس حوالے سے کوئی تنگ نظری نہیں پائی جاتی۔ اگر پسماندگی ہے تو اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں کہ بلوچ مردوں کی جانب سے اپنی عورتوں کے ساتھ ناانصافی کی جاتی ہے تو اسی وجہ سے بلوچ معاشرہ پسماندہ ہے حالانکہ یہ بالکل درست نہیں، بلکہ بلوچ معاشرے کی پسماندگی اور درماندگی کی دیگر بہت ساری وجوہات ہیں۔

بلوچ معاشرے میں عورت کو انتہائی پر اعتماد ساتھی اور دوست سمجھا جاتا ہے کہ جو نہ صرف بچے جنم دیتی ہے بلکہ اپنے مرد کے شانہ بشانہ مال مویشی چراتی ہے، فصلوں کی بوائی اور کٹائی میں وہ مکمل طور پر مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہے، بھیڑ بکریوں کا دودھ دوھتی ہے اور گھر بار بھی سنبھالتی ہے۔ کسی نے بلوچ معاشرے کی عورت کے بارے میں درست کہا ہے کہ

> ''عورت بلوچ ثقافت کی ایماندار ترین امانت دار ہے وہ بلوچی زبان کی جفاکش محافظ اور چرواہن ہے۔'' (مری (2005):11)

بلوچ سماج میں صنفِ نازک کے مقام و مرتبہ کا ایک مختصر اجمالی خاکہ:

الغرض بلوچ معاشرے میں بلوچ عورت کی جائز معاشرتی اور ذاتی آزادی کے لیے کی کافی گنجائش ہے بشرطیکہ وہ اخلاقی بے راروی اور شرعی حدود کی خلاف ورزی نہ کرے، مگر غربت، افلاس اور تنگدستی کی وجہ سے چونکہ بلوچ معاشرے کی بڑی اکثریت تعلیم جیسی نعمت سے محروم ہے اور حکومتی سطح پر بھی کبھی بلوچستان کے دور دراز علاقوں کو اہمیت نہیں دی گئی اور خصوصاً تعلیم کے شعبہ کو تو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا لہٰذا علم کی کمی نے ابھی تک بلوچ معاشرے کی خوبیوں سے دنیا کو بہرہ مند نہیں کیا وگرنہ یہ معاشرہ اور اس میں موجود احترام کے جذبات سے یقیناً ایک بڑی خلقت مستفید ہو جاتی۔ بسا اوقات مذہبی احکامات کی غلط پر چار کے ذریعے لوگوں اور بالخصوص بچیوں کو تعلیم سے دور رکھا گیا وگرنہ بلوچ معاشرہ اعتماد کی بنیادوں پر استوار ہوا ہے اور اس معاشرے میں حقوق کی تقسیم کو ہمیشہ مقدم سمجھا گیا ہے۔

بلوچ دنیا کے قدیم ترین اقوام میں شمار ہونے والا ایک قدیم ثقافتی گروہ ہے جس کی تاریخ کے تانے بانے قبل از مسیح کے متحرک اور سرگرم اقوام سے جا کر ملتے ہیں۔ یہ قوم سیکڑوں قبائل میں منقسم ہے جن کا سیاسی و سماجی کردار اور پس منظر بلوچ تاریخ کا جزوِ لاینفک ہے۔ اس قوم کا جہاں سیاسی کردار کسی شک وشبہ کے بغیر واضح اور مسلّم ہے اسی طرح سماجی حوالے سے بھی اس قوم کو دنیا کے ترقی پسند اور اشتمالیت پسند اقوام میں شمار کیا جاتا ہے۔ ترقی پسند حلقے اس قوم کے بارے میں اب بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں کہ یہ قوم دنیا کی قدیم ترین اور انسانوں کی اولین سماجی و معاشی نظام یعنی قدیم اشتمالی نظام پر عملدرآمد کرنے والی قوم ہے جس کے سیاسی اور سماجی ادارے اب بھی اُسی قدیم اشتمالی نظام کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اکثر یہ غلط استدلال پیش کیا جاتا ہے کہ بلوچ سماج میں عورت کے کوئی حقوق نہیں ہیں اور اس صنف کو انسانوں میں شمار ہی نہیں کیا جاتا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بلوچ سماج دراصل سو فیصد مردانہ سماج ہے جس میں مرد کی مکمل بالادستی قائم ہے اور عورت کا درجہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ پروپیگنڈہ عموماً بالادست، استعماری اور سامراجی سوچ رکھنے والی اقوام کرتی ہیں جو دراصل بلوچستان پر قابض ہونے کے بعد اپنے قبضے کو طوالت دینے اور اس آزادی پسند،

آزادخیال مگر نظریاتی قوم کو دنیا کی دیگر اقوام کے سامنے اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ دنیا انہیں وحشی اور غیر مہذب گروہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے مگر خود انہی سامراجی اور استعماری حلقوں کے دانشور بلوچ اداروں کی جمہوریت پسندی، انسانیت دوستی، آزاد خیالی اور ترقی پسندی کی گواہی بھی دیتے ہیں۔ پاکستان کے ترقی پسند مصنف جناب سبطِ حسن اپنی کئی کتابوں اور تحریروں میں بلوچ قوم کو انسانوں کے قدیم اشتمالی نظام کے نمائندے قرار دیتا ہے کہ جو وسائل کی تقسیم مساوی بنیادوں پر کرتے ہیں۔ اسی طرح صنف نازک کے بارے میں یہ تصور کہ بلوچ سماج میں اس کا درجہ کم ہے اور اسے مساوی حقوق یا عورت کے حقوق و درجات حاصل نہیں ہیں تو یہ واضح کردوں کہ یہ خیالات اور الفاظ بھی ان لوگوں کے ہیں کہ جو یا تو اس سماجی گروہ کے اداروں سے عدم واقف ہیں یا پھر صرف وہ لوگ یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں جن کے کچھ خاص مقاصد ہوتے ہیں یا وہ کسی کے مقاصد کے لیے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ بلوچ تاریخ کے اوراق کو الٹ کر دیکھا جائے تو اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ زمانہ اولیٰ سے کہ جب بلوچ سماج کا آغاز ہوا تھا تب سے لے کر دورِ حاضرہ تک بلوچ سماج میں عورت کا درجہ مردوں کی نسبت زیادہ بلند رہا ہے۔ عورت کو جو مقام و مرتبہ بلوچ سماج میں حاصل ہے وہ ترقی پسند معاشروں میں بھی اُسے حاصل نہیں بلکہ ترقی پسند معاشرے بھی بلوچ سماج میں عورت کی آزادی اور معاشرتی مقام کو دیکھ کر رشک کرتے ہیں۔ مصنفین اور محققین بلوچ سماج میں عورت کے مقام کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''بلوچوں میں عورت کو بے حد عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر دو قبیلوں میں لڑائی چھڑ جائے تو ایک متحارب قبیلہ مخالف قبیلہ کی عورتوں کو ہرگز کوئی گزند نہیں پہنچاتا، عورتوں کی بے حرمتی یا ان پر ظلم روا رکھنا کمینگی اور بزدلی کے مترادف ہے۔ اگر دو قبیلے لڑ رہے ہوں تو عورت کے دخل دینے پر لڑائی بند کر دی جاتی ہے۔ بلوچ عورتیں بلند کردار، بے حد دلیر اور جفاکش ہوتی ہیں، سینا پرونا ان کا مقبول مشغلہ ہے۔ وہ گلہ بانی بھی کرتی ہیں۔ مرد کی عدم موجودگی میں کوئی اجنبی یا مہمان آجائے تو بساط بھر خدمت کرتی ہیں۔ مہمانوں کو خواہ وہ اجنبی ہوں یا دشمن خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا جاتا

ہے۔ بلوچ عورتوں کا لباس شائستگی کا عمدہ نمونہ ہے۔ وہ تنگ یا چست لباس سے نفرت کرتی ہیں۔ ان کے دوپٹے اور چادریں لمبی چوڑی ہوتی ہیں اور قمیض کھلی ڈھیلی۔ بلوچی کشیدہ کاری دنیا بھر میں نام پیدا کر چکی ہے اور اس امر کا ثبوت ہے کہ بلوچ عورتیں صاحبِ ذوق اور چابک دست ہیں۔"

(گمی (1990 سیکنڈ ایڈیشن):48-49)

بلوچ سماج کی ابتدا میں عورت کا درجہ معبود کا ہوتا تھا اور اس کی مورتیاں بنا کر ان کی پوجا کی جاتی تھی۔ بلوچستان کے طول و عرض میں پائی جانے والی آثار قدیمہ سے برآمد ہونے والی دیگر سیکڑوں اقسام کی اشیاء کے علاوہ لاتعداد مورتیاں بھی برآمد ہوئی ہیں جو تمام کی تمام خواتین کی ہیں۔ یہ مورتیاں ماقبل از تاریخ زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جو اس بات کی شہادت ہیں کہ زمانہ قدیم میں عورت کا درجہ معاشرے میں سب سے اونچا ہوتا تھا اور اسے اس حد تک سب پر فوقیت حاصل تھی کہ سب اس کی پوجا کرتے تھے اور اسے زندگی کا مظہر سمجھتے تھے۔ وقت بدلتا رہا انسان ماقبل تاریخ کے زمانے سے نکل کر تاریخی دور میں داخل ہوا اور اس کے تمام ادارے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے ترقی کی معراج کو پہنچ گئے۔ ترقی کی اس ہوا کے اثرات بلوچستان کے باشندوں تک بھی پہنچنے لگے اور ان کا قدیم معاشرہ بھی جدت کے سانچے میں ڈھلنے لگا اور قدیم نظام جدید نظام میں تبدیل ہونے لگا۔ اس کے ادارے بھی بدلتی ہوئی دنیا کی ساتھ ہم آہنگ ہونے لگے۔ دیہی نظام کی جگہ شہری نظام لینے لگی، گدانوں اور مٹی کے گھروں کی جگہ پختہ اور پائیدار بنگلے پُر کرنے لگے۔ سواری کا طرز بھی یکسر تبدیل ہوا اونٹوں، گھوڑوں اور گدھوں کی جگہ موٹر کار اور دیگر مشینی سواریوں نے لے لی۔ بلوچی حال احوال کی جگہ جدید الیکٹرانک مواصلاتی نظام نے لے لی۔ حتیٰ کہ پُرانا تمام ڈھانچہ تبدیل ہونے لگا اور اب بھی یہ سلسلہ بڑی تیزی کے ساتھ جاری ہے۔ مگر۔۔۔۔

مگر ان تمام تر تبدیلیوں اور جدت کے باوجود اگر ایک چیز اب بھی بلوچ قوم میں ماضی کی طرح زندہ اور قائم ہے تو وہ ہے عورت کا مقام، درجہ اور احترام۔ ایسا نہیں کہ بلوچ قوم میں تمام لوگوں کا معیار اور ان کی سوچ یکساں ہے یا وہ سب کے سب فرشتہ صفت ہیں البتہ بحیثیت مجموعی قومی سوچ کے حوالے سے بلوچ قوم کی وہ سوچ جو عورت کے بارے میں تھی جوں

کی توں باقی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس سوچ میں مزید پائیداری، پختگی اور مضبوطی آئی ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ بلوچ مرد چاہے جس قسم کی بھی سوچ رکھتا ہو یا وہ کتنی ہی بُری ذہنیت کا ہو مگر جب وہ کسی خاتون سے ملتا ہے تو کسی جھجک کے بغیر اُسے بہن، ماں، گودی، بانک، اِیڑ، اڈی، گہوار، لُمہ، جیجا، مَسِڑ وغیرہ جیسے الفاظ سے مخاطب کرتا ہے جن میں سے ہر لفظ عورت کے احترام کی انتہا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

بلوچ سماج میں ان الفاظ کا استعمال عام ہے اور ان کا استعمال بطور تکیہ کلام ہوتا ہے اور انہیں زیادہ محسوس نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ ان کا روزمرہ کے معمولات میں شامل ہیں بلکہ اُن کی عادت بن چکی ہے۔ مگر جب کسی غیر بلوچ قوم کی عورت کے لیے یہ الفاظ بولے جاتے ہیں تو وہ خاتون ان الفاظ پر نہاں ہوجاتی ہے اور کوئی بھی عزت دار خاتون ان الفاظ کو اپنے لیے بڑا اعزاز سمجھتی ہے۔ بلوچ معاشرے میں مرد اور عورت کے مابین باہمی احترام کے رشتے اور عورت کے بلند درجہ واعلیٰ مرتبہ ومقام کی شہادت کئی دیگر مثالوں سے بھی دی جاسکتی ہے۔ بلوچ معاشرے میں چھوٹی بہن اپنے بڑے بھائی کا نام کبھی نہیں لیتی بلکہ اُس کے لیے ادا، لالہ، ایلم وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتی ہے، بیوی اپنے شوہر کا اور شوہر اپنی بیوی کا نام نہیں لیتے بلکہ ایک دوسرے کو اپنی بڑی اولاد سے منسوب کر کے بلاتے ہیں جیسا کہ: گواہرام نا باوا، گواہرام نا لُمہ۔ یعنی اے گواہرام کے ابا، اے گواہرام کی اماں۔ اسی طرح چھوٹا بھائی بڑی بہن کا نام نہیں لیتا اور اسے کسی مخصوص نام جیسا کہ دادا، باجی، ایڑا، گودی، وغیرہ کے لقب سے پکارتا ہے۔ بلوچ سماج میں جو درجہ بیٹی کا ہوتا ہے وہ بیٹے کا نہیں ہوتا۔ بیٹا اگر طاقت ہے تو بیٹی کو بغیر کسی حیل وحجت کے عزت، غیرت اور رحمت مانا جاتا ہے۔ دورِ حاضرہ میں بیٹی اب بلوچ سماج میں طاقت کی علامت بنتی جارہی ہے اور اسے بیٹے سے کم کسی بھی طور نہیں دیکھا جاتا۔

ہر کس وناکس کو یہ معلوم ہے کہ بلوچ سماج میں عورت کا درجہ اس حد تک بلند ہے کہ اگر دو بلوچ گروہوں میں خونریز جنگ ہورہی ہو اور دونوں طرف سے لاشیں گر رہی ہوں تو ان حالات میں اگر کوئی سید قرآن اُٹھا کر یا کوئی خاتون میدان جنگ میں دونوں گروہوں کے مابین آجاتی ہے تو دونوں گروہ کسی تعطل کے بغیر جنگ روک دیتے ہیں اور اپنے اپنے راستوں پر چل دیتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بلوچ سماج میں عورت کا درجہ اور مقام کس

نوعیت کا ہے۔ سید کو بلوچ سماج میں بڑا مرتبہ اور مقام حاصل ہے اور اس کی خصوصی عزت کی جاتی ہے مگر وہ قرآن سمیت نکلے گا تو بلوچ متحارب گروہ اپنا ہاتھ جنگ سے روک دیتے ہیں مگر ایک عورت خالی ہاتھ اگر متحارب گروہوں کے مابین آجاتی ہے تو فریقین اُسی وقت لڑائی سے دست کش ہو جاتے ہیں۔ ببانگِ دُہل یہ اعلان کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ سماج میں عورت کے اس معاشرتی مقام کی مثال نہیں ملتی۔

بلوچ سماج میں مرد اور عورت دونوں کے حدود اور دائرہ کار متعین ہوتے ہیں۔ بلوچ مرد شکی مزاج نہیں ہوتے اور وہ گاؤں کے سیدھے سادھے ماحول میں اعتماد کی بنیاد پر زندگی گزارتے ہیں۔ بلوچ عورت میں پردہ کرنے یا برقعہ اوڑھنے کا کوئی رواج نہیں بلکہ پردہ کرنے کے لیے ایک بڑی چادر کو ہی کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس چادر میں بلوچ عورت اپنا سر اور جسم لپیٹ کر چھپا دیتی ہے جبکہ چہرہ چھپانے کا کوئی رواج نہیں۔ بلوچ عورت کی کشیدہ کاری کے کپڑے جتنے زیادہ جاذبِ نظر ہوتے ہیں اتنی ہی زیادہ ان میں پردہ داری ہوتی ہے۔ یہ کپڑے جسم کو چھپانے کے لیے بہترین ہوتے ہیں۔ بلوچی کپڑوں میں عورت بڑی باوقار اور باعزت نظر آتی ہے حالانکہ ان کشیدہ شدہ کپڑوں میں بلا کی کشش اور جاذبیت ہوتی ہے مگر اس کے باوجود ان کپڑوں میں عورت کا وقار بڑھ جاتا ہے۔ بلوچ سماج میں صنفی مساوات اور برابری عام طور پر نظر آتی ہے۔ چونکہ بلوچوں کی بڑی اکثریت دیہاتوں میں مستقلاً آباد ہیں جہاں کی زندگی شہری زندگی کی نسبت سخت اور مشکل بھی ہوتی ہے اور پُر صعوبت بھی۔ زندگی صبح و شام مال مویشیوں اور بھیڑ بکریوں کے علاوہ فصلوں کی دیکھ بھال میں گزرتی ہے۔ گلہ بانی اور زراعت گاؤں کے مرد اور عورتیں مل کر کرتے ہیں یعنی عورت اپنے مرد کے شانہ بشانہ فصلوں میں کام کرتی ہے اور ساتھ ہی مال مویشیوں کو بھی چرانے کے لیے لے کر جاتی ہے۔ جبکہ خانہ داری کے کام بھی عورتوں کو کرنے پڑتے ہیں اور بچوں کی دیکھ بھال بھی ان کی ذمہ داری ہوتی ہے جبکہ مرد بھی بچوں کی دیکھ بھال میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

بلوچ تاریخ میں جہاں مردوں کے تذکرے تفصیل کے ساتھ اور بڑی تعداد میں ملتے ہیں تو اس میں عورتوں کے کردار کے بارے میں کافی شواہد دستیاب نہیں ہیں مگر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ دنیا کی دیگر تہذیبوں میں بھی یہی حال رہا ہے۔ دراصل عالمی سطح پر مردوں کو تمام تر

اختیارات اس وقت حاصل ہو گئے جب بڑی بڑی تہذیبوں اور سلطنتوں نے جنم لیا۔ لہٰذا سیاست میں عورت کا کردار محدود ہوتا گیا۔ جنگیں، فتوحات، خونریزیاں، ہوس ملک گیری، لالچ اور طمع نے مردوں کو اس نہج پر پہنچا دیا کہ انہوں نے عورت کو صرف حرم سرا تک محدود رکھا جبکہ باقی تمام تر ریاستی اور سیاسی وسماجی امور اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ مگر جہاں چھوٹے چھوٹے دیہی اور دریائی ثقافتوں سے دور پہاڑی وصحرائی محدود دیہات سسٹم موجود تھا وہاں کا سماج سلطنتوں کی یلغاروں اور دباؤ کے باوجود اپنے قدیم نقوش پر ہی کاربند رہا۔ اگر تاریخ میں بلوچ خواتین کے تذکرے نہیں ملتے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس قدیم سماج میں عورت کا درجہ دنیا کے دیگر خطوں میں ہونے والی سماجی وسیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے کم ہوا یا اسے پسِ پردہ رکھا گیا جبکہ مردوں کو تاریخ کے صفحات پر جگہ ملی۔ بلکہ اس کی کئی دیگر وجوہات ہیں کہ جن کی وجہ سے بلوچ عورت تاریخ کے صفحات پر مذکور نہیں مگر یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کا قدیمی کردار، مقام اور تکریم ختم ہوئی۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جب بلوچستان کے مشرق اور مغرب میں بڑی بڑی تہذیبوں نے جنم لیا تو دیہی سماج کے ان قدیم باشندوں کا تسلط ختم ہوا اور دنیا ایک دم سے جدید دور میں داخل ہوئی۔ بڑی بڑی سلطنتوں نے جنم لیا۔ بڑے بڑے ممالک وجود میں آ گئے جن کے وسیع جغرافیائی حدود اور بڑی بڑی فوجیں تھیں۔ انہوں نے حملے کر کے کئی خطے اپنے اپنے ممالک اور سلطنتوں میں شامل کیے۔ اس طرح قدیم سماج ایک دم سے نئے دور میں داخل ہوئی۔ دنیا کا تمام تر نظام تبدیل ہوا۔ قدیم اشتمالی نظام جو پہلے ہی سے روبہ زوال تھی اور جاگیردارانہ وغلامانہ سماج میں تبدیل ہوتی جارہی تھی ان عظیم تہذیبوں کے جنم لیتے ہی قدیم سماج کا خاتمہ ہوا اور چھوٹے چھوٹے دیہات اور قصبے بڑے بڑے عظیم الشان اور فقید المثال شہروں میں تبدیل ہو گئے۔ مشرق وسطیٰ، ایران، ہندوستان، سندھ میں ان عظیم تہذیبوں کی وجہ سے بلوچستان کی قدیم اور مہر بند دیہی سماج زوال پذیر ہوا۔ بعد ازاں آرین نے رہی سہی کسر پوری کردی اور ایران وہندوستان پر قبضہ کر کے قدیم ثقافتوں کا قلع قمع کیا اور دنیا کو مزید جدت دینے کے ساتھ ساتھ سامراجیت کی اصطلاح کو مزید پُرمعنی اور وسیع بنا دیا۔ بلوچستان ایک ایسے نکو پر واقع ہے جہاں مشرق ومغرب آپس میں بغل گیر ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک طویل ساحل سمندر اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کرتی ہے۔ مغرب سے آنے والا راستہ

یالآخرایک جگہ کوئٹہ کے قریب واقع مشہور درہ بولان پرآ کراس مشہور مگر انتہائی خطرناک پہاڑی راستے میں داخل ہوتا ہے جو سو میل آگے جا کر کچھی کے وسیع وعریض میدانوں میں داخل ہوجاتا ہےاور وہاں سے سندھ و پنجاب کے میدانی راستوں کے ساتھ منسلک ہوجاتا ہے۔ جبکہ دوسرا راستہ خضدار کے قریب واقع مشہور ومعروف درہ مولہ میں داخل ہوجاتا ہے جو زمانہ قدیم سے مشرق ومغرب کے کاروانوں کے زیرِ استعمال ہے۔ یہاں سے سندھ کے میدانی علاقوں کے علاوہ کچھی کی جانب بھی راستے نکلتے ہیں۔ان دو قدیم دروں کے علاوہ اور ایسا کوئی راستہ نہیں کہ جہاں سے مغرب کے کاروان مشرق کی جانب سفر جاری رکھ سکیں۔ اسی طرح مشرق کے کاروان بھی مغرب کی جانب محوِ سفر رہنے کے لیے انہی راستوں کا استعمال کرتے تھے جبکہ تیسرا راستہ سمندر کا تھا۔لہٰذا بلوچستان کی قدیم ثقافت مشرق ومغرب میں رونما ہونے والی ان سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کے دوران گویا چکی کے دو پاٹوں کے مابین پس کر رہ گئی۔ مغرب سے مشرق کی جانب بلوچستان کو ہمیشہ بطور فوجی چوکی اور اہم ترین گزرگاہ کے استعمال کیا گیا۔ بڑی طاقتوں کی ہمیشہ کوشش رہی کہ تجارتی راستے اُن کے قبضے میں رہیں۔لہٰذا بلوچستان کی قدیم ثقافت کا ان جدید تہذیبوں اور طاقتور سلطنتوں کی یورشوں سے متاثر ہونا ایک فطری امر تھا جبکہ اُس صورت میں کہ جب یہاں کے قدیم باشندوں نے قدم قدم پر حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت کی،لہٰذا جواب میں حملہ آور بھی انھیں مسلسل اپنی ترکتازیوں کا نشانہ بناتے رہے۔اس طویل رزمیہ آنکھ مچولی کے باوجود حملہ آور اقوام بلوچوں پر ماسوائے اپنے مذہبی عقائد کے اور کوئی بھی سماجی قانون مسلط نہ کر سکے۔ وہ یہاں کے باشندوں کا مال واسباب لوٹ لیتے، ان کے دیہاتوں کو نذرِ آتش کرتے، حتیٰ کہ ہر طرح سے تباہی و بربادی مچاتے۔ جب ایک حملہ آور قوم کا عہد ختم ہوجاتا تو دوسرا آتا اور پہلے والے کی جگہ لیتا اس طرح یہ سلسلہ گذشتہ کئی ہزار سال سے جاری ہے۔ان حملہ آوروں کے خلاف ہمیشہ یہاں کے باشندوں نے مزاحمت کا راستہ اختیار کیا۔(یقینی بات ہے کہ مزاحمت کار مرد ہوں گے لہٰذا اگر تاریخ میں مردوں کے تذکرے ملتے ہیں تو بدقسمتی یہ ہے کہ تاریخ کا زیادہ تر حصہ جنگوں کے تذکروں پر مشتمل ہے جبکہ دیگر سماجی اداروں کے بارے میں معلومات بہت کم دستیاب ہیں۔) لہٰذا فطری امر ہے کہ ان حملوں اور یورشوں کے بلوچ سماج پر گہرے اثرات مرتب ہوئے اور قدیم مراسم ورواجات ناپید اور

محدود ہوتے گئے۔ یقیناً ان تبدیلیوں کی وجہ سے عورت کا کردار بھی تبدیل ہوا اور اس کے اختیارات کی نوعیت بھی تبدیل ہوتی گئی۔ اب تو قدیم بلوچ سماج صرف اُن دیہاتوں میں نظر آتا ہے کہ جہاں جدید دور کی سہولیات میں سے کوئی بھی دستیاب نہیں وگرنہ جدید دور کی سہولیات نے قدیم سماج کی بنیادیں تک ہلا دی ہیں۔ مگر ان تمام تر سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کے باوجود بلوچ سماج میں عورت کے مقام و مرتبہ اور عزت و تکریم میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ عورت اب بھی اس سماج میں اُسی عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے جس طرح ماضی میں اس کا مقام و مرتبہ متعین تھا۔ اس رتبے اور درجے میں کوئی کمی نہیں آئی ہے اور کوئی بھی حملہ آور بلوچوں کے اس وصف کو ختم نہیں کر سکا۔

تاریخ میں بلوچ خواتین کے تذکرے نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چونکہ خود بلوچ قوم میں اپنی زبان میں علم کا حصول کبھی بھی مروج نہیں رہا۔ کم از کم اس طرح کی کوئی بھی شہادت برطانوی عہد سے قبل دستیاب نہیں ہے کہ بلوچ قوم نے کبھی اپنی زبان میں تعلیم حاصل کی ہو اور اپنی زبان میں کوئی نثری تاریخ تحریر کی ہو۔ ممکن ہے ماضی قدیم میں کسی خطے کے بلوچ باشندوں نے بھی تاریخ رقم کی ہو مگر وہ یقیناً بلوچی زبان میں نہیں ہو گی۔ لہٰذا ماضی میں اگر بلوچ علماء گزرے بھی ہیں تو ان کا طرزِ تکلم اور طرزِ تحریر غیر بلوچی رہا ہوگا۔ دوم یہ کہ بلوچوں کی مزاحمتی تاریخ عرب، فارسی اور یونانی مورخین کی لکھی ہوئی قدیم تحریروں میں ملتی ہے جن کو غیر بلوچ اقوام نے تحریر کیا اور ان میں زیادہ تر مواد بلوچوں کی مزاحمت کے بارے میں ہے۔ لہٰذا تاریخ میں بلوچ خواتین کے تذکرے ان کتب میں بھی نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں دنیا میں بہت کم یہ رواج رہا ہے کہ خواتین کے تذکرے کتب میں بیان ہوں، علاوہ ازیں عورت کا زیادہ تر کردار غیر سیاسی اداروں یا گھر بار تک محدود رہا ہے لہٰذا ان کے تذکرے کتب میں نہ ہونے کے قریب ہوں گے، بلوچ سماج تو ویسے بھی زیادہ تر دیہی سماج ہے کہ جہاں عورت کو کبھی بھی اور کسی بھی طرح کی نجی محفلوں میں زیرِ بحث لانا انتہائی معیوب اور بدترین فعل سمجھا جاتا ہے۔ البتہ اس کے مقام اور مرتبہ کا سب خیال رکھتے ہیں۔ المختصر یہ کہ:

''عورت کی عزت اور تکریم بلوچ قوم کا جزوِ ایمان ہے''

باب دوم

بلوچوں کی رومانوی داستانیں

بلوچ قوم کی تاریخ میں جہاں رزمیہ آرائیوں کی عظیم و سچی داستانیں ملتی ہیں تو دوسری جانب اس قوم کی تاریخ میں رومانوی کہانیوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ پاکستان میں کئی قومیں اور ثقافتی گروہ بستے ہیں جن کے اپنے اپنے سیاسی، جغرافیائی اور ثقافتی حدود ہیں۔ یہ ثقافتی گروہ اپنے اپنے حدود میں گذشتہ کئی صدیوں بلکہ ہزاروں سالوں سے آباد رہتے چلے آرہے ہیں۔ ان ثقافتی گروہوں کی اپنی اپنی تاریخ اور سیاسی وسماجی ادارے ہیں اور ان میں سے ہر گروہ نے تاریخی طور پر اس خطے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ ان گروہوں کی سیاسی تاریخ کی داستانیں کتب تواریخ میں تفاصیل کے ساتھ مرقوم ہیں۔ جہاں ان گروہوں کی رزمیہ و عسکری تاریخ کے بیانات ان کتب میں ملتے ہیں تو وہاں ان کی سماجی کہانیاں بھی کتب کی زینت بنی رہی ہیں۔ ان گروہوں کی ثقافتی وسماجی زندگی کے بھی کئی واقعات اور رومانوی داستانیں بھی مورخین، مصنفین اور محققین کے موضوعات رہے ہیں۔ پاکستان کے تمام ثقافتی گروہوں کی رومانوی داستانیں ان کے ادب کا حصہ ہیں۔ اس لحاظ سے بلوچ قوم بہت خوش قسمت ہے کہ جس کا ادب رومانوی داستانوں کی چاشنی سے بھری ہوئی ہے جو اس قوم کی زبان وادب کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہیں۔ اس باب میں بلوچ قوم کی ان سچی اور حقائق سے بھرپور محبت کی داستانوں کو بیان کیا جارہا ہے جو بلوچی زبان وادب کو نہ صرف مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں بلکہ خطے کی دوسری ثقافتی گروہوں اور ان کی زبانوں کی نسبت بلوچی زبان اور بلوچ سماج کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہیں۔ اس خطے سے حانی شہہ مرید، شیریں و دوستین، سسی و پنوں،

لللہ وگراناز جیسے عاشقوں اور محبت کرنے والے انسانوں کی داستانیں منسوب ہیں جن میں سے ہر کردار وسیع اور گہرے مطالعہ کا حقدار ہے۔ اس طویل اور دلچسپ موضوع کا آغاز عاشقوں کے سردار شہہ مرید کی داستان سے کرتے ہیں جو عشقِ حانی میں ڈوب کر حیاتِ جاودانی سے سرفراز ہوا۔

حانی شہہ مرید:

سردار عاشقان شہہ مرید بلوچی زبان وادب اور تاریخ کا وہ سرمایہ ہے جس پر بلوچ قوم بلاشبہ فخر کرنے کا حق رکھتی ہے۔ یہ داستانِ عشق رند ولاشار یونین کے تاریخ ساز عہد سے تعلق رکھتی ہے جب یہ قبائل مکران سے نکل کر قلات اور پھر سبی وکچھی کے میدانوں میں پہنچ گئے۔ تب یہ داستانِ عشق وقوع پذیر ہوا اور تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رقم ہوئی۔

مرید شہہ مبارک کا بیٹا تھا جسے رند قبائل میں پیر ومرشد کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اُن کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ جس زمانے میں یہ قبائل سبی میں سکونت پذیر تھے تو شہہ مبارک کے ہاں ایک خوبصورت بیٹے نے جنم لیا جس کا نام شہہ مرید رکھا گیا۔ شہہ مبارک چاہتا تھا کہ شہہ مرید اپنے آباؤ اجداد کے پیشے پیری مرشدی کی جانب راغب ہو مگر شہہ مرید کا اس جانب کوئی رجحان نہ تھا بلکہ اس کو شکار اور شاعری سے ہی رغبت تھی جن کی طرف وہ بچپن سے ہی راغب تھا۔ شہہ مرید کی منگنی بچپن میں ہی اس کے کزن اور میر مندو کی بیٹی حانی کے ساتھ ہوئی تھی جو رندوں میں سب سے خوبصورت اور حسین ترین لڑکی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے بے حد محبت تھی اور ایک دوسرے پر مر مٹتے تھے۔ دونوں ہی شاعری کے دلدادہ تھے اور اس صنفِ ادب پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ بچپن کی محبت پروان چڑھتی رہی اور دونوں جوان ہو گئے۔ جوانی میں شہہ مرید کی وجاہت اور حانی کا حُسن ضرب الامثال بن چکے تھے اور قبائل وجاہت و شجاعت اور تیراندازی میں شہہ مرید جبکہ حُسن وخوبصورتی اور خوش اخلاقی وملنساری میں حانی کی مثال دیتے تھے۔ بلاشبہ شہہ مرید جوان مردوں میں یکتا تھا جبکہ حانی حسینوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے دونوں کو ظاہری حُسن اور وجاہت عطا کی تھی تو وہ حسنِ اخلاق، ہمدردی اور ملنساری کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ تمام رند ولاشار قبائل میں ان کی بہادری،

ملنساری، ہمدردی، خوش اخلاقی اور محبت کے چرچے عام تھے۔

شہہ مرید کا والد شہہ مبارک نہ صرف رندوں کا پیر و مرشد تھا بلکہ چاکر کے اہم مصاحبین اور درباری امراُ اور مشیروں میں بھی شامل تھا۔ اس طرح شہہ مرید کا بھی چاکر رند کے ساتھ قریبی تعلقات اور دوستی تھی۔ چاکر اکثر شہہ مرید اور اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ شکار پر نکلتا تھا اور مجالس ادب منعقد کرتا تھا۔ ان مجالس میں شعراُ کرام اپنی اپنی شاعری اور کلام سے حاضرین کو خوب محظوظ بھی کرتے تھے اور ان کا لہو بھی گرماتے تھے۔ ان مہمات اور مجالس میں شہہ مرید چاکر کے ساتھ ساتھ ہوتا تھا اور اکثر اپنے خوبصورت، دلسوز اور بامعنی کلام سے مجلس لوٹ لیتا تھا اور خوب داد وصول کرتا تھا۔ وقت گزرتا گیا اور چاکر و شہہ مرید کی دوستی بھی پختہ ہوتی گئی اور وہ ہر وقت ایک ساتھ نظر آنے لگے۔ ہر مہم اور ہر مجلس میں دونوں ایک ساتھ موجود ہوتے تھے۔ چاکر کے دیگر اہم مصاحبین کہ جو رند و لاشار عہد کے مشہور و معروف اور نامور ہستیوں پر مشتمل تھے میں، میر جاڑو، میر حدے، شہہ کٹے، میر ہیبتان، میرحسن مولاناغ، میر بیورغ اور کئی دیگر شامل تھے۔ رند و لاشار یونین کے عہد میں ان شخصیات نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ اپنے عہد کے نہ صرف جنگجو بلکہ اپنے قبائلی طائفوں کے سردار اور اپنے وقت کے بڑے اور نامور شعراُ کرام تھے۔ ان کی شاعری کے نمونے اور رزم آرائیوں کی داستانیں بلوچ تاریخ اور ادب کا بہت بڑا اثاثہ ہیں۔

شہہ مرید اور چاکر کی دوستی کے بارے میں حانی بھی جانتی تھی کیونکہ شہہ مرید نے اُسے کسی بھی بات سے بے خبر نہیں رکھا تھا۔ حانی یہ بھی جانتی تھی کہ چاکر اور شہہ مرید اکثر شکاری مہم پر نکل جاتے ہیں اور مشاعرے بھی منعقد کرتے ہیں۔ حانی جانتی تھی کہ کوئی بھی مشاعرہ شہہ مرید کے کلام کے بغیر نامکمل ہوگا اور ایسا کوئی بھی مشاعرہ جس میں شہہ مرید شامل ہو وہ کوئی اور نہیں لوٹ سکتا اس مشاعرے کا فاتح اُس کا مرید ہی ہوگا۔ اس طرح زندگی کا سفر امید و یقین کے ساتھ جاری رہا۔

یہ یقیناً اُس زمانے کی داستان ہے کہ جب ابھی تک لاشار اور رند قبائل کا اتحاد یہ قائم تھا اور دونوں مشترکہ طور پر پُرامن طریقے سے اور ایک ہی سربراہ کے زیرِ سایہ زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی حاکمیت کا دائرہ دریائے سندھ کے مغربی کناروں سے مشرق میں کرمان کی

سرحدات تک وسیع تھی جبکہ شمالاً جنوباً وہ قندھار کی سرحدات سے لے کر بحیرہ بلوچ (بحیرہ عرب) کے ساحل تک پھیلی ہوئی تھی۔ اولاً یہ قبائل سیستان سے منگول عہد میں مہاجرت کر کے کرمان اور مکران لے علاقوں میں پھیل گئے اور مقامی بلوچ قبائل کے ساتھ گھل مل گئے۔ پندرہویں صدی عیسوی میں انھوں نے ایک مضبوط یونین قائم کی جو چوالیس قبائل کے اتحاد یے پر مشتمل تھی۔ بہت جلد انہوں نے مکران پر اپنی حاکمیت قائم کی۔ کولواہ کا علاقہ ان کا مرکز بنا۔ چاکر خان رند بھی یہیں پر متولد ہوا۔ بعدازاں جب ان قبائل نے مکران سے مشرق کی جانب ہجرت کی تو انہوں نے بی کو اپنا مرکز بنایا جبکہ دریائے سندھ کے مغربی کناروں تک آہستہ آہستہ یہ پھیلتے چلے گئے۔ اس دوران بدقسمتی سے رند اور لاشار قبائل کے سرداروں کے مابین ایسے اختلافات پیدا ہوئے جن کی وجہ سے ان میں ایک طویل خانہ جنگی کا آغاز ہوا جس نے انہیں تباہ کر کے رکھ دیا اور یہ قبائل مزید مشرق کی جانب پھیلتے ہوئے ہندوستان کی سرحدات تک پہنچ گئے بلکہ بعض قبائل ہندوستانی حدود میں داخل ہو گئے جن کی باقیات اب بھی وہاں دیکھی جاسکتی ہیں اور مختلف کتب میں ان کے تذکرے بھی پڑھے جاسکتے ہیں۔ چاکر نے بعدازاں لنگاہ خاندان کی حاکمیت کا خاتمہ کر کے ملتان پر قبضہ کرلیا اور جنوبی پنجاب میں بلوچوں کی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ یہ حکومت طویل عرصہ تک تو قائم نہ رہ سکی مگر اس کے قیام سے بلوچ قبائل کو پنجاب کے مختلف حدود میں خود کو مضبوط اور مستحکم کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ چاکر بلوچ تاریخ کے عظیم شخصیات میں شمار ہوتا ہے کہ جن کے تذکرے کے بغیر بلوچ تاریخ کے ابواب نامکمل ہوں گے۔ ان کا عہد بلوچ تاریخ کے اہم ترین ادوار میں شامل ہوتا ہے۔ بلاشبہ چاکر وہ بلوچ حکمران تھے جنہوں نے ہندوستانی سرحدات سے لے کر کرمان کی حدود تک ایک وسیع وعریض خطے پر حکمرانی کی اور اپنا نام نہ صرف بلوچستان کی تاریخ میں رقم کروایا بلکہ سندھ، پنجاب اور ہندوستان کی تواریخ میں بھی انھیں عظیم رہنما کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

بہر حال دوبارہ موضوع کی طرف آتے ہیں کہ جب یہ قبائل سبی اور گنداواہ کے میدانوں میں امن وسکون کی زندگی گزار رہے تھے تب حانی وشہہ مرید کی داستان عشق کا واقعہ پیش آیا جس نے بلوچ تاریخ اور بلوچی ادب پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے نقش ثبت کیے۔

چاکر اور شہہ مرید کی دوستی خوب پروان چڑھی اور شہہ مرید ان کے مصاحبینِ خاص

میں شامل ہوا۔ چاکر میں لاکھ خوبیاں سہی مگر بحیثیت انسان ان میں کچھ کمزوریاں بھی تھیں جن کی وجہ سے بعض اوقات محققین اور ناقدین انھیں اپنی تنقید کا بھی نشانہ بناتے ہیں۔ ان کی ایسی ہی کمزوریوں میں ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنے قریبی دوستوں سے بھی بسا اوقات حسد کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی بھی شخص اس کی جیسی خوبیوں کا مالک نہ ہو اور اگر کسی بھی شخص میں کوئی ایسی خوبی دیکھ لیتا تو وہ اُس سے حسد کرتا۔ حانی اور شہہ مرید کی محبت کے تذکرے بھی انہوں نے سُنے تھے اور حانی کے حُسنِ لازوال کی کہانیاں بھی مخبروں کے ذریعے اُس تک پہنچتی رہتی تھیں مگر اُسے ان باتوں کو سُن کر کوئی تجسس نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ اپنی ذات کو ہی مکمل سمجھتا تھا اور دوسروں کی تعریفوں کے تذکرے اُسے متاثر نہیں کرتے تھے۔

محققین اور مصنفین کے بیانات کے مطابق ایک دن چاکر اپنے مصاحبین کے ساتھ شکار پر نکلا تھا پہاڑوں کی جانب شکار تلاش کرتا ہوا چل پڑا۔ کہتے ہیں شکار تو ہاتھ نہیں آیا البتہ پیاس سے چاکر اور اس کے مصاحبین کا بُرا حال ہوا۔ شہہ مرید جو اس شکاری گروہ میں شامل تھا، نے کہا کہ یہاں سے قریب حانی کا گھر ہے جو اس کی منگیتر ہے آپ وہاں جائیں جبکہ میں کہیں اور سے پانی لے لیتا ہوں کیونکہ بلوچی رسم کے مطابق میں اپنی منگیتر کے گھر شادی سے پہلے نہیں جا سکتا۔ لہٰذا چاکر اپنے مصاحبین کے ساتھ یا تنِ تنہا حانی کے گھر کی جانب چل پڑا۔ اُس نے جب حانی کے گھر پہنچ کر پانی مانگا تو حانی نے اُسے بالکونی سے دیکھ کر پہچان لیا کہ سردار چاکر رند ہے اور شدید پیاس سے اُس کا بُرا حال ہے۔ لہٰذا اُس نے اپنی لونڈی کو ایک کٹورے میں صاف پانی ڈالا اور اس کے اوپر کچھ صاف تنکے بکھیر دیے اور یہ کٹورا لونڈی کو دے کر کہا کہ چاکر رند سردار میر چاکر کو دیدے۔ میر چاکر نے جب کٹورے کے پانی کی سطح پر چند تنکے دیکھے تو اسے غصہ بھی آیا اور شہہ مرید کی منگیتر کے پھوہڑ پن پر ہنسی بھی آئی۔ بہر حال اُس نے گھونٹ گھونٹ بھر کر اور تنکوں کو پھونکیں مارتے ہوئے آہستہ آہستہ پانی پیا۔ اس کے بعد وہ اپنے مصاحبین کے ساتھ آملا۔ دوسری جانب شہہ مرید چاکر کی منگیتر کے گھر پانی پینے پہنچا تو اُس نے شہہ مرید کو صاف کٹورے میں صاف پانی پلایا جسے شہہ مرید نے پیاس کی شدت کی وجہ سے ایک ہی سانس میں پی لیا۔ اس سے شہہ مرید کی حالت غیر ہوگئی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے دوستوں کے پاس پہنچا۔ چاکر نے جب اس سے اس کی طبیعت ناساز ہونے

کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ مجھے آپ کی منگیتر نے صاف کٹورے میں صاف اور ٹھنڈا میٹھا پانی پلایا جسے میں ایک ہی سانس میں پی گیا جس کی وجہ سے میری حالت غیر ہوگئی۔ تب چاکر کو حانی کے گھر کے پانی پر تیرنے والے تنکوں کی اصل وجہ سمجھ میں آگئی۔ کیونکہ عقلمند اور دانا حانی نے یہ محسوس کیا کہ میر چاکر بڑی مسافت طے کر کے آئے ہیں اور انھیں شدید پیاس لگی ہے۔ اگر انہیں صاف پانی پلایا گیا تو وہ ایک ہی سانس میں پی جائیں گے جس سے ان کی حالت خراب ہوسکتی ہے لہٰذا اُس نے صاف پانی کے اوپر چند تنکے اس مقصد کے لیے بکھیر دیے تا کہ رند سردار پانی کو آہستہ آہستہ اور پھونک پھونک کر پی لے۔ کہتے ہیں کہ میر چاکر خان رند خوبصورت اور پری چہرہ عقلمند اور دانا حانی کی اسی عقلمندی پر بزار دل وجان سے فریفتہ ہوا۔ تب وہ اس تاڑ میں رہا کہ کسی نہ کسی طرح سے حانی کو شہہ مرید سے حاصل کر کے اپنی بیوی بنالے۔ اُسے شہہ مرید سے حسد ہوگیا اور وہ اس محبت بھری داستان کا حقیقی ولن بن گیا۔

ایک دن میر چاکر نے اپنے مشیروں اور دوستوں کی مجلس سجائی جس میں اس کے قریبی دوستوں نے شرکت کی۔ کہتے ہیں کہ ایک سازش کے تحت میر چاکر نے یہ مجلس منعقد کی تھی اور اس کے کچھ خاص مقاصد تھے۔ لہٰذا اُس نے حاضرین کو خوب بھنگ کے کٹورے بھر بھر کر پلائے اور انہیں مدہوش کر دیا۔ اسی عالم مدہوشی میں میر چاکر نے کوئی قسم اٹھائی اور کہا کہ رند بہادروں آؤ اور آج ایک ایک ایسا قول دیتے ہیں کہ جو ہم ہر حال میں پورا کریں گے چاہے اس میں ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ سب سے پہلا قول میں دیتا ہوں اور وہ قول یہ ہے کہ میں کبھی بھی جھوٹ نہیں بولوں گا اور چاہے کچھ بھی ہو میں سچ ہی بولوں گا اور اس کے لیے میں رندی قول دیتا ہوں۔ اس کی دیکھا دیکھی دیگر مصاحبین نے بھی کسی نہ کسی کام کے لیے قول وقسم اٹھایا۔ جیسا کہ بلوچ شاعر کہتا ہے:

"رنداں قول کتگ دیوان ءَ
یکےِ چاکرءَ شہک ءَ
اقرار انت منامن زندءَ
دروگ ءَ نہ بنداں وس ءَ
قول کتہ جاڑو جڑیں مستءَ

آنکه منی ریش ءَ ہجنت دست ءَ
زیندغ نیلانی دل ءَ کست ءَ
ھیبتاں میر ءَ مس رند ءَ دیوان ءَ قول کته
ہپت براں راستیں دست ءَ مس نوحتاں جته
آں کسے ڈاچی منی بگ ءَ گوں کپت
قول انت مولا کنڈ گ ءَ شادیم ءَ چریت"

ترجمہ:
رندوں نے مجلس میں عہد کیا
پہلے چاکر بن شہک نے کہا
میں عہد کرتا ہوں کہ زندگی بھر
کبھی جھوٹ نہ بولوں گا
جیالے جاڑو نے اقرار کیا
جو شخص میری داڑھی کو ہاتھ لگائے گا
مجھے وعدہ ہے کہ میں اُسے کبھی زندہ نہیں چھوڑوں گا
میر ھیبتان نے رندوں کے دیوان میں عہد کیا
اور سات مرتبہ مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کہا
جس کا بھی اونٹ میرے اونٹوں کے گلے میں آ کر ملے گا
وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس اونٹ کو ہرگز واپس نہیں لوٹا دوں گا

(اثیر (1994):61-60)

جب شہہ مرید کی باری آئی تو انہوں نے مدہوشی کے عالم میں رندی قسم اٹھاتے ہوئے کہا: کہ میں ایک صوفی ہوں اور جمعرات کی رات شب بھر بیٹھ کر اللہ کی عبادت کرتا ہوں، اس رات کوئی بھی سوالی میرے در سے خالی نہیں جاتا چاہے وہ کچھ بھی مانگ لے میں اسے سونپ دیتا ہوں، میں رندی قسم اٹھاتا ہوں کہ جمعرات کی رات کو مجھ سے جو کچھ بھی مانگا جائے گا میں دینے سے انکار نہیں کروں گا۔ اُس نے گنگناتے ہوئے کہا:

"قول کتہ مرید دیوانگ ءَ
قول انت مناچو عومرءَ
چو عومرءَ قول انت منا
کسے بلوٹیت دادن ءَ
من دادن ءَ بند نہ باں
بند بیگی مردے نے یاں"

ترجمہ:

مرید نے یوں عہد کیا
میں عمر کی طرح قول کرتا ہوں
قول کرتا ہوں عمر کی طرح
کوئی مانگنے والا مجھ سے بخشش مانگنے آئے
تو میں بخشش دینے میں ہرگز پس وپیش نہیں کروں گا
میں رُکنے والا شخص نہیں ہوں۔

(اثیر (1994):61-62)

میر چاکر خان رند شہہ مرید کی اس قسم سے بہت خوش ہوا کیونکہ اُسے اپنے مقصد میں مکمل کامیابی حاصل ہوئی تھی اور اُس نے بالآخر حانی کو حاصل کرنے کے لیے راستہ ہموار کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ چاکر نے رند سرداروں میں سے ہر اُس سردار کو آزمایا جس نے اُس کے دربار میں سوگند اٹھائی تھی۔ جاڑو، میر ھیبتان، میر حدے، شہہ کٹے، حتیٰ کہ سب کو آزمایا اور سب ہی اپنے قول اور وعدے کے پکے نکلے۔ اب شہہ مرید کی باری تھی جس سے چاکر کا اصل مقصد بندھا ہوا تھا اور اب اس سے اس کے قول کی پاسداری کروانی تھی۔ لہٰذا جمعرات کی رات میر چاکر نے منصوبے کے تحت قبیلہ کے گویوں (ڈومب) کو شہہ مرید کے گھر کی جانب بھیجا جو اُس وقت یادِ الٰہی میں مشغول تھا۔ گویے اُس کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر موسیقی کی لے پر اور ترنم کے ساتھ گا گا کر اسے اُس کا وعدہ یاد دلانے لگے جو اس نے دربارِ چاکری میں اٹھایا تھا۔ شہہ مرید اپنے کمرے یا حجرے سے باہر آیا اور ڈومبوں کی

باتیں سنیں اور جواب میں کہا کہ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے مانگو تم لوگ کیا مانگتے ہو؟

شہہ مرید کو کیا پتہ تھا کہ اس کے خلاف کیا کھیل کھیلا جا چکا ہے اور کس طرح اس کی زندگی کی مسرتوں اور خواہشوں کا خون ہونے والا ہے، اسے کیا پتہ تھا کہ اُس کی خوش وخرم زندگی اور اس کی حسین دنیا لٹنے والی ہے اور وہ تباہ و برباد ہونے والا ہے، اس کی حانی اُس سے چھن جانے والی ہے۔ گویوں نے گا گا کر اسے کہا کہ ہمیں تو آپ سے اور کچھ نہیں چاہیے ہم تو فقط حانی کو مانگنے آئے ہیں آپ ہمیں حانی سونپ دو ہم کو صرف حانی چاہیے۔ ڈومبوں کی اس خواہش کو سن کر شہہ مرید پر جیسے بجلیاں گر پڑی ہوں، اس کی دنیا اندھیر ہوگئی، اسے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آنے لگی، روشنیاں اس کی زندگی سے نکل چکی تھیں اور اب صرف اور صرف اندھیروں کا راج ہونے والا تھا۔ وہ اگر قول پورا نہ کرتا تو اس کی پوری قوم میں سُبکی اور بے عزتی ہوتی اور اس کے اس فعل کو انتہائی معیوب اور بُرا سمجھا جاتا، اور اگر وہ قول پورا کرتا تو پھر اُس کے لیے مزید زندہ رہنے کا مقصد ہی ختم ہو جاتا، کہ اس کی پوری دنیا اُس کی حانی تھی، جب حانی ہی نہیں رہے گی تو اُس کے لیے دنیا کس قدر بے کیف اور بے مزہ ہوگی۔ مگر وہ ایک مرد تھا اور ایسی قوم سے تعلق رکھتا تھا کہ جس کے نزدیک قول کی پاسداری سے بڑھ کر کوئی شئے اہم نہیں تھی، قول اور قسم کی پاسداری ہی بلوچوں کی میراث ہے اور قول وقسم کو پورا نہ کرنے والے کے لیے قوم اور قبیلہ میں کوئی جگہ نہیں ہوتی، للہٰذا شہہ مرید نے آنسوؤں اور آہوں کے ساتھ حانی سے دستبردار ہوا اور اُن سے کہا کہ حانی کو اس کے والد کے گھر سے لے جاؤ اور اسے چاکر کے محل میں پہنچا دو۔ اس طرح اس نے حانی کو اُن کے سپرد کر دیا اور اس طرح حانی اپنے گھر سے چاکر کے محل منتقل ہوئی۔

گویوں کی اس حرکت اور حانی کو لے کر چلے جانے پر سوختہ جان مرید بے ساختہ پکار اٹھا:

"لانگھوں بُرتہ حانی گریوانہ
دیم پر میریں چاکرے بانہ
شاہ وت زانت قادر لاشکیں
دیم پدیم دوستانی اوغ سیکھیں"

ترجمہ:

گانے والے روتی ہوئی حانی کو لے کر چل پڑے

وہ چاکر کے (محل) کی جانب چلے گئے

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں،

خدا گواہ ہے کہ جیتے جی دوستوں کی جدائی کتنی جان لیوا ہوتی ہے

(گمی (1990):93)

شہہ مرید کی خوشیاں حانی کے ساتھ وابستہ تھیں جبکہ ظالم میر چاکر خان جو قوم کا سب سے بڑا معزز ترین سردار تھا، اس کی حانی کو حیلہ سے اس سے چھین چکا تھا اور اس کی دنیا اُجاڑ دی تھی۔ شہہ مرید اور حانی کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ قوم کا سب سے بڑا سردار اتنی چھوٹی حرکت بھی کر سکتا ہے۔ شہہ مرید کو اس بات کا یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن اور شاید بہت جلد میر چاکر خان رند اسے بُلا کر کہے کہ اے میرے دوست شہہ مرید وہ آپ کی حانی ہے میں تو صرف مذاق کر رہا تھا اور آپ دونوں کی محبت کا امتحان لے رہا تھا۔ شہہ مرید کو یقین تھا کہ میر چاکر خان رند قوم کا سردار ہے اور اس کے ساتھ شاید دل لگی کر رہا ہے اور وہ اس کی حانی اسے ضرور واپس کر دے گا۔ شہہ مرید راتوں کو محل کے اردگرد چکر لگاتا کہ کسی نہ کسی طرح حانی کے ساتھ اس کا رابطہ ہو سکے اور وہ اس سے کوئی بات کر سکے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ میر چاکر خان کے قلعہ کے اردگرد گھومتا رہتا تھا بالآخر ایک دن اس کا حانی سے رابطہ ہوا تو حانی نے اسے شاہی اصطبل میں آکر ملنے کا کہا۔ بعض روایات کے مطابق میر چاکر حانی کی جاسوسی کرتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ حانی کے دل سے شہہ مرید ابھی تک نہیں اُترا اور وہ ابھی تک شہہ مرید سے محبت کرتی ہے لہٰذا وہ تاک میں رہتا تھا کہ کہیں وہ اور شہہ مرید آپس میں ملتے تو نہیں، جب حانی نے شہہ مرید کو اصطبل میں ملنے کا کہا تو کسی نہ کسی طرح میر چاکر خان رند کو بھی اس بات کی بھنک پڑ گئی لہٰذا وہ رات کا انتظار کرنے لگا۔ دوسری جانب شہہ مرید رات کو کسی نہ کسی طرح پہریداروں کی آنکھ بچا کر اصطبل پہنچا اور ایک کونے میں بیٹھ کر حانی کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر بعد حانی بھی آ گئی اور وہ ایک کونے میں بیٹھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ حانی نے اپنے دیر سے آنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ میر چاکر خان جاگ رہا تھا اس لیے اس کے سونے کا انتظار کیا ابھی وہ

سوئے ہیں لہٰذا میں اس طرف آ گئی۔ دوسری طرف میر چاکر خان رند بھی جھوٹ موٹ کے سوئے تھے جوں ہی حانی کمرے سے نکل کر اصطبل کی جانب آئی تو میر چاکر خان بھی اسی جانب اٹھ کر آ گئے۔ جب حانی اور شہہ مرید نے میر چاکر خان کو اصطبل کی طرف آتے دیکھا تو اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اس نے فوراً شہہ مرید سے کہا کہ وہ کہیں چھپ جائیں مگر شہہ مرید نے انکار کیا تو حانی اس کی منتیں کرنے لگی کہ اس طرح میر چاکر خان ہم دونوں کو مار ڈالیں گے۔ حانی نے اسے کہا کہ وہ میر چاکر خان سے اس طرف آنے کا کوئی بہانہ کریں گے۔ لہٰذا شہہ مرید گھاس کے ایک ڈھیر میں چھپ گئے مگر میر چاکر خان نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے اصطبل میں داخل ہوتے ہی حانی سے کہا کہ وہ یہاں کیا کر رہی ہے تو جواب میں حانی نے انتہائی بے رُخی سے کہا کہ ایک گھوڑا کھل گیا تھا اس کی آوازیں پریشان کر رہی تھیں میں اسے باندھنے آئی تھی۔ میر چاکر خان نے اس کے ہاتھ سے گھوڑے کی رسی لے کر گھاس کے اُس ڈھیر کی طرف آئے جہاں شہہ مرید چُھپا ہوا تھا اور گھاس کے ڈھیر میں اس کا پاؤں تلاش کر کے اور ایک بڑی کیل (کھونٹا) لے کر اسے اس کے پاؤں میں ٹھونک دیا جو شہہ مرید کے پاؤں کو چیرتی ہوئی زمین میں پیوست ہوگئی اور اس کھونٹے کے ساتھ اس نے گھوڑے کی رسی باندھ دی۔ پھر اس نے حانی سے کہا کہ اب یہ گھوڑا کبھی بھی ایسی مستی نہیں کرے گا چلو سو جاؤ۔ حانی نے یہ سب کچھ دیکھ لیا مگر اس نے اپنی زبان سے کچھ بھی نہیں کہا البتہ شہہ مرید کی حالت پر اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں میر چاکر خان کو بددعائیں دے رہی تھی۔ میر چاکر خان رند کے جانے کے بعد شہہ مرید نے اپنا پاؤں اس کھونٹے سے نکال لیا اور شدید زخمی حالت میں اپنے گھر کی جانب چل دیا۔

اسی طرح کہتے ہیں کہ شہہ مرید کی دیوانگی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور وہ اعلانیہ حانی کے لیے اشعار اور چاکر کے لیے ہجو کہتا رہتا تھا۔ وہ میر چاکر خان کی اصطبل والی حرکت کے باوجود بھی حانی کا دیدار کرنے سے باز نہیں آیا۔ اب وہ محل کے آس پاس گھوم پھر کر حانی کے لیے فراق اور جدائی کے گیت گاتا تھا کہ شاید حانی ان گیتوں کو سُن کر محل کی بالکونی میں یا چھت پر آ جائے اور اپنے رُخِ زیبا کا دیدار سے شہہ مرید کی آنکھوں کی تشنگی بجھائے۔ ایک رات وہ تین بار قلعہ کی فصیل کے باہر اپنے اشعار گاتا ہوا گزرا اور ہر بار حانی اس کی آواز سُن کر قلعہ کے

بُرج پر جاتی تا کہ وہ اسے دیکھ سکے۔ جب وہ پہلی بار گئی تو ننگے سر تھی، جب وہ دوسری بار گئی تو دوپٹے سے سر کو ڈھانپے ہوئے تھی اور جب وہ تیسری بار گئی تو اس کے بال بکھرے ہوئے تھے جو ہوا سے اُڑ اُڑ کر اس کے چہرے کو چھپا رہے تھے۔ اس وقت میر چاکر خان بھی جاگ رہا تھا اور وہ حانی کو دیکھ رہا تھا۔ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ وہ اصطبل میں چُھپے شہہ مرید سے ملنے آ جا رہی تھی۔ جب میر چاکر خان نے اس سے اصطبل کے گھوڑوں کی بے چینی کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ بجلی کی کڑک اور چمک سے پریشان ہو رہے تھے۔ میر چاکر خان حیران ہوا کہ آسمان تو صاف ہے پھر بجلی کیسے کڑکی اور چمکی ہے۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ حانی اصطبل میں شہہ مرید سے ملنے گئی تھی۔ صبح جب دربار سجا اور میر چاکر خان رند کے تمام مصاحبین اور درباری حاضر ہوئے تو میر چاکر خان رند نے اہلیانِ دربار کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا کہ کل رات کتنی بار بجلی چمکی تھی۔ اہلیانِ دربار حیران رہ گئے کیونکہ کل آسمان صاف تھا اور رات کو آسمان پر ستارے چمک رہے تھے جبکہ بادلوں کا دور دور تک کوئی نام ونشان نہ تھا۔ وہ سردار کے اس سوال پر پریشان ہو گئے اور انھیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سردار میر چاکر خان رند کے سوال کا آخر مطلب کیا ہے۔ دربار میں شہہ مرید اور اس کا والد شہہ مبارک بھی بیٹھے ہوئے تھے، شہہ مرید نے میر چاکر خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں اس سوال کا جواب دوں؟ بالکل دو میں ناراض نہیں ہوں گا۔ میر چاکر خان رند نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اجازت ملنے پر شہہ مرید کہنے لگا۔ رات تین بار بجلی چمکی تھی۔ پہلی بار تیز روشنی ہوئی، دوسری بار وقفے وقفے سے دھیمی روشنی ہوئی، اور تیسری بار جب بجلی چمکی تو بادل بھی چھائے ہوئے تھے۔ اہلیان دربار کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا کہ سردار کا سوال کا کیا مقصد تھا اور شہہ مرید نے جو جواب دیا اس کا کیا مطلب تھا؟ شہہ مرید نے سوچا کہ یہ باتیں سُن کر میر چاکر خان رند آگ بگولہ ہو جائیں گے مگر اس نے دیکھا کہ میر چاکر خان کے چہرے پر اس جواب سے کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ شہہ مرید نے سوچا کہ رند سردار نے ناراض نہ ہونے کا وعدہ کیا ہے اور وہ اس کے جواب سے ناراض نہیں ہوں گے لہٰذا اُس نے اہلیانِ دربار کی حیرانگی کو دیکھتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ بجلی تو دراصل سردار چاکر خان رند کی بیوی حانی تھی جو تین بار قلعہ کے برج میں آئی اور ہر بار بجلی گراتی رہی۔ شہہ مرید نے بھری محفل میں رندوں

کے سب سے بڑے سردار میر چاکر خان رند کی توہین کردی تھی، اگر میر چاکر خان رند نے ناراض نہ ہونے کا وعدہ نہ کیا ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ اسی وقت شہہ مرید کو قتل کرنے کا حکم دیتے مگر اس نے اپنے قول کا پاس کرتے ہوئے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا۔ اس محفل میں شہہ مبارک بھی موجود تھا اس نے اپنے بیٹے شہہ مرید سے کہا: کہ تمہیں سردار کی عزت کرنی چاہیے اور اس کی منکوحہ کے بارے میں ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔ جواب میں شہہ مرید نے اپنے والد کو درج ذیل اشعار سنائے جن کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

"اے میرے والد محترم: حانی احسن آگ کی طرح ہے
اور تم اب تک حسن کی آگ میں نہیں جلے
اے میرے والد: حانی دنیا کی حسین ترین عورت ہے
اگر تم حانی کے عشق مین مبتلا ہو جاؤ تو
خوشی سے پاگل ہو جاؤ گے اور
برہنہ ہو کر رقص کرنے لگو گے"

شہہ مبارک بیٹے کے یہ گستاخانہ اور توہین آمیز اشعار سُن کر آگ بگولا ہو گیا اور اس نے بھری محفل میں اپنا جوتا اتار کر اسے دے مارا۔ اس طرح بھری محفل میں شہہ مرید کی بے عزتی ہوئی جبکہ یہ بے عزتی کسی اور نے نہیں خود اس کے باپ نے کی تھی جس کو وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کرلیا کہ اب وہ یہاں نہیں رہے گا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور چلا جائے گا۔ اس نے اس موقع پر اپنے والد شہہ مبارک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اے میرے بزرگ باپ
تم نے مجھے جوتا مار کر میری بے عزتی کی ہے
قسم ہے، میں اپنا سر منڈوا لوں گا
اور بہت جلد چلا جاؤں گا
دور کسی ملک میں جا بسوں گا
اپنے گراں بہا ہتھیاروں کو چھوڑ دوں گا

اور اپنے قیمتی ملبوسات بھی چھوڑ جاؤں گا‘‘

(عقیل (2002):266)

اب تو شہہ مرید کی دنیا مکمل طور پر لُٹ چکی تھی اور وہ دیوانگی کے عالم میں پہاڑوں اور ویرانوں کی خاک چھاننے لگا تھا۔ وہ پہاڑوں اور ویرانوں میں بھٹکتا اور فریاد و آہ وزاری کرتا رہتا تھا۔ اُس کا صبر و شکیب جاتا رہا، وہ دوستوں کو دُکھ کی داستان سناتا رہا، اپنی محبوبہ کی یادوں کے بوجھ تلے جھکا رہا، تاروں بھری راتوں میں آہ و فغاں کرتا رہا، وہ جنگلوں، پہاڑوں، وادیوں اور ویرانوں میں دیوانہ وار گھومتا رہا، لیکن اس کے دل کو قرار نہ آیا۔ وہ صوفی تھا، اس نے خود اذیتی میں تسکین چاہی اور گرم گرم سلاخوں سے اپنا جسم داغ ڈالا، لیکن اس کے دل کو قرار نہ ملا، اس کی روح بے چین تھی، اور اسے سکون قلب کی تلاش تھی مگر سکون و قرار اب اس کی دنیا سے نکل چکے تھے اور ازلی بیقراری اور دیوانگی اس کے نصیب میں تھیں۔ جب سبی اور مضافات کے پہاڑوں اور ویرانوں میں بھی دل کو قرار نہ ملا اور حانی کی یادیں اس کے لیے جان لیوا ثابت ہونے لگیں تو اُس نے سکونِ قلب اور حانی کی یادوں سے قرار پانے کی خاطر اللہ کے گھر کی راہ لی اور مکہ چلا گیا۔

محققین کے مطابق اُس نے تیس سال مکہ میں گزارے اور اللہ کی بیت کے سامنے پڑا رہا۔ مگر وہاں بھی حانی کی یادیں اُس کے ساتھ رہیں اور کوئی بھی لمحہ ایسا نہ تھا کہ حانی کی یاد اسے نہ آتی وہ ہر وقت اس کی یادوں میں کھویا رہتا اور اشک اُس کی آنکھوں سے رواں رہتے۔ اپنے ان جذبات کا اظہار انہوں نے اپنے کلام میں بھی کیا ہے۔

تیس سالوں تک یہ عاشقِ مستانہ درِ خدا پر بیٹھ کر حانی حانی پکارتا رہا اور اللہ سے اپنے لیے قرار و سکون مانگتا رہا۔ مکہ میں بیٹھ کر بھی وہ اپنے حانی سے باتیں کرتا رہتا تھا اور ہواؤں کو، چاند تاروں کو اور کبوتروں کو اپنا قاصد بنا بنا کر حانی کے نام پیغام بھیجتا رہتا تھا اور اُس سے ہمکلام ہوتا رہتا تھا۔ وہ مکہ میں بیٹھ کر حرم مکہ کے کبوتروں کو اپنا قاصد بنا کر حانی کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجتا تھا:

’’اے مکہ کے بام پر بیٹھنے والے کبوتر!

تو رات بھر مجھے کیوں پریشان کرتا ہے

میں تو تجھ سے زیادہ دکھی اور درماندہ ہوں
تو مجھے اپنے غمگین نغموں سے زیادہ آزردہ خاطر نہ بنا
نیچے آتا کہ میں تجھے ڈھاڈر بھیجوں
میرا پیغام لے جا۔ میری محبوبہ کے پاس
(گمی (1990 سیکنڈ ایڈیشن):94)

اور جواب میں حانی ڈھاڈر کے آسمان پر منڈلانے والے بادلوں سے کہتی:
اے بادلو! یہاں کیوں برستے ہو
مکہ معظمہ پہنچو
وہاں میرا مرید ہوگا
جان لیوا تپتی ریت میں اُسے سایہ کرو"
(گمی (1990 سیکنڈ ایڈیشن):95-94)

بالآخر تیس سالوں کے بعد یہ عازمِ وطن ہوا اور براستہ سمندر مکہ سے اپنے وطن کے لیے روانہ ہوا۔ دوسری طرف حانی کا بھی سکھ وچین فنا ہو چکا تھا اور اس کی ساری کائنات لٹ چکی تھی، چاکر نے اس کی زندگی اور خوشیوں کو غارت کر دیا تھا، چاکر نے اُس سے شادی کی لاکھ کوشش کی۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ چاکر نے اس کے ساتھ شادی کر لی تھی مگر حانی کے لیے شادی ایک بے معنی سی شئے بن چکی تھی اسے زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی، وہ اب بھی اپنے گمشدہ اور دور دراز ملکوں کو جانے والے مرید کے لیے چشم براہ تھی اور اپنے اشعار میں ہر وقت اُس سے ہمکلام ہوتی تھی اور اپنے محبوب سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ میر چاکر خان رند سردارِ قبیلہ کا محل اور قلعہ اُس کے لیے قید خانے اور اذیت گاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے جہاں اُس کا دم گھٹتا تھا اور جہاں اُس کی پاکیزہ محبت کے دشمن ہر وقت اُس کے سامنے ہوتے تھے جنہیں دیکھ کر اُس کا خون کھول اٹھتا تھا۔ چاکر کے دیے ہوئے کپڑے اور زیورات اس محبت کی ماری اور حالات کی ستائی ہوئی شہہ مرید کی محبوبہ کو سانپ اور بچھو اور آگ کے لبادے محسوس ہوتے تھے اور وہ چاکر کی دی ہوئی ان اشیاء سے سخت نفرت کرتی تھی۔ وہ اپنے ان جذبات کا اظہار اپنے اشعار میں کرتی ہے اور اپنی محبت کے دشمنوں کو خوب بددعائیں دیتی ہے اور کوستی

رہتی ہے۔ لہٰذا حانی چاکر کو بددعائیں دیتی ہوئی کہتی ہے:

"چاکر تئی میری بہ ندرات
لوگ تئی آسے کپات
بورءِ تئی دزے برات
دستءِ نشانی گار بیات
دل تئی گناہاں بار بیات"

ترجمہ:

اے چاکر: تیرا محل جل جائے
تیرے گھر میں آگ لگ جائے
تیرے گھوڑے کو قزاق لے جائیں
تیرا نام ونشان مٹ جائے
تیرا دل گناہوں سے بار ہو

(اثیر (1994):75-74)

تیس سال کی جلاوطنی اور جدائی کی آگ میں جلنے کے بعد شہہ مرید بالآخر اپنے وطن آ پہنچا۔ اب وہ اس دنیا کا انسان باقی نہیں رہا تھا، نہ ہی عام انسانوں کی طرح اس کی حسیات تھیں بلکہ اب وہ ایک درویش تھا اور عشق مجازی نے عشق حقیقی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ وہ ایک دراز قد اور سفید ریش بزرگ تھا کہ جس کے چہرے سے متانت، سنجیدگی اور دانائی ٹپکتی تھی جبکہ اس کے چہرے کے باطن میں صدیوں کی ویرانی اور محبوب سے جدائی کی تکلیف اب کسی کو نظر نہیں آتی تھی۔ اسی حالت میں وہ اپنے علاقے ڈھاڈر (درہ بولان کے مشرق دھانے پر واقع ایک معروف قصبہ جو سبی سے مغرب کی جانب صرف سولہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے) پہنچا۔ وہ جوں ہی اپنے علاقے کی سرحد میں داخل ہوا تو اسے ہر طرف حانی کی خوشبو اور مہک محسوس ہوئی اور وہ اس خوشبو سے سرشار آگے بڑھتا رہا۔ جب وہ ایک جگہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ خیموں کا ایک شہر آباد ہے جبکہ اردگرد دیگر آبادی پھیلی ہوئی ہے۔ خوب گہما گہمی اور چہل قدمیاں ہو رہی ہیں۔ لوگوں کے جم غفیر ہیں جبکہ ایک جگہ بچے اور نوجوان کھیل

کودا اور نشانہ بازی کر رہے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ کر نوجوانوں کی نشانہ بازی والی جگہ پہنچا اور انہیں نشانہ بازی کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب اس کے قبیلے کے بچے اور جوان ہیں اور یہ علاقہ بھی رندوں کا ہے یعنی سبی کے مضافات کا علاقہ ہے اور یہ چاکر کے محل کے قریب کا ہی کوئی مقام ہے۔ اس نے ہواؤں کی سرسراہٹ میں حانی کی سرگوشیاں سنیں جو اب بھی اس کے لیے محوِ انتظار تھی اور روزانہ اپنے مرید کی راہ تکتی رہتی تھی۔ وہ صبح سے شام تک محل کی اونچی بالکونی میں کھڑے ہو کر مغرب کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی تھی جہاں سے مرید کے آنے کی امید تھی۔ وہ روز بالکونی میں کھڑے ہو کر مرید سے سیکڑوں باتیں کرتی، کبھی گلے شکوے کرتی تو کبھی مرید کی بلائیں لیتی، کبھی مرید کو کھانا کھلا رہی ہوتی تو کبھی اس کے گھوڑے کو پانی پلا رہی ہوتی۔ وہ روز مرید سے کہتی کہ مرید مجھے بھولنا نہیں مجھے امید ہے کہ اللہ ہم پر رحم کرے گا کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں کوئی میر چاکر ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا۔ بس ایک بار آ جاؤ اور پھر دیکھو میں کیسے آپ کی بنتی ہوں۔ میرے پیارے مرید اب اپنے وطن لوٹ آؤ۔۔۔ لوٹ آؤ۔

اور اب مرید سبی کی فضاؤں میں، ہواؤں میں حانی کی یہ ساری باتیں اور فریادیں سن رہا تھا، اس کا دل پسیج رہا تھا، وہ عجیب سی مستانہ کیفیت میں مبتلا تھا، اس کا دل چاہا کہ وہ اڑ کر شاہی محل کی اس بالکونی میں پہنچ جائے جہاں حانی اس کی منتظر ہے، ہائے کاش یہ سب کچھ ممکن ہوتا اور وہ ایسا کر پاتا۔ کاش۔۔۔ انہی خیالوں میں غلطاں و پیچاں وہ نوجوانوں کے اُس مجمع میں آ پہنچا جہاں نشانہ بازی ہو رہی تھی۔ رندوں کی نئی پود کے شوخ طبع نوجوان ایک کھلے میدان میں ایک مخصوص جگہ پر اپنے تیروں سے نشانہ لگا رہے تھے اور سخت مقابلہ ہو رہا تھا مگر اب تک کوئی بھی تیرانداز صحیح نشانہ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ مرید مجمع میں کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس کا بھی دل چاہا کہ وہ نشانہ لگائے کیونکہ اپنے زمانے میں وہ رندوں میں سب سے بہترین تیرانداز تھا اور اس کا نشانہ کبھی بھی نہیں چُوکتا تھا۔ میر چاکر اور دیگر رند بہادر بھی اس کی نشانہ بازی کے معترف تھے۔ لہٰذا اس نے منتظم پر اپنی خواہش ظاہر کی۔ جس پر سب نے انہیں خوش آمدید کہا اور تیراندازی کا سامان فراہم کیا۔

یہاں پر دو روایات ملتی ہیں اول یہ کہ مرید کو کئی کمان دیے گئے مگر جب وہ چلہ پر تیر

چڑھا کر کھینچتا تو کمان ٹوٹ جاتی۔ سب اُن کی طاقت پر حیران رہ گئے اور پھر منتظم نے انہیں وہ کمان لا کر دی جو کبھی خود شہہ مرید کی اپنی تھی۔ اُس نے جب اپنے کمان کو دیکھا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور اُن سے آنسو بہنے لگے تب اُس نے چلہ پر تیر چڑھایا اور تاک کر نشانے پر مارا، تیر ٹھیک اُس مخصوص نشان کے بیچوں بیچ پیوست ہوا، حاضرین کی طرف سے آفرین آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں، پھر شہہ مرید نے لگا تار دو مزید تیر تاک دیے جو آگے پیچھے یک دوسرے کے ساتھ پیوست ہوتے گئے۔ حاضرین میں کچھ پُرانے اور ادھیڑ عمر لوگ موجود تھے جو شہہ مرید کے ہم عمر تھے، انہوں نے اُسے پہچان لیا اور ایک دم اُس سے لپٹ گئے اور اس طرح شہہ مرید اپنے علاقے میں آ پہنچا اور اپنے لوگوں کے ساتھ تیس سال بعد ملاقات کی مگر وہ بھی ایک مستانہ ملنگ مست الست کے روپ میں۔

جبکہ دوسری روایت کچھ یوں ہے کہ جب اسے نشانہ بازی کی دعوت دی گئی اور اسے اس کی اپنی کمان اور تیر دیے گئے تو اس نے تاک کر نشانہ مارا اور لوگوں سے خوب داد وصول کی۔ پھر ایک تیر شاہی محل کی جانب چلایا تو حانی حسب عادت بالکونی میں موجود تھی، اس نے تیر کی سنسناہٹ سُنی تو ایک دم سے چیخ پڑی ''شہہ مرید''۔ بعض کہتے ہیں کہ اسی آواز پر لوگوں نے مرید کو پہچان لیا تھا اور وہ اسے گھیر کر اس کے ساتھ لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔

بعض زبانی روایات یہ بیان بھی دیتے ہیں کہ مقابلہ کے میدان سے وہ چاکر ماڑی (چاکر کے قلعہ یعنی شاہی محل) کی جانب روانہ ہوا اور ایک کشکول ہاتھ میں لے کر محل کے دروازے پر صدا لگائی۔ حانی اسی طرح بالکونی میں کھڑی اُس جانب دیکھ رہی تھی جہاں سے وہ تیر آیا اور محل کے اوپر سے گزر کر آگے نکل گیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اور بھیگی پلکوں کے ساتھ اپنے شہہ مرید کی پیار بھری مہک کو سانسوں میں محسوس کرتے ہوئے اُس جانب نگاہ لگائے کھڑی تھی کہ اچانک ایک مستانہ ملنگ کی صدا بلند ہوئی۔ حانی پہلے تو دم بخود ہوئی اور پھر چیخ مار کر شاہی محل کے دروازے کی جانب بھاگی اور کسی کا کوئی خیال کیے بغیر اور بے خوف ہو کر محبت کے جنون کی ماری نے شاہی محل کا دروازہ کھول دیا تو سامنے اُس کی بھیگی ہوئی، آنسوؤں سے تر بتر، برسوں سے منتظر، شدت انتظار کی ماری آنکھوں کے سامنے ایک مست و ملنگ درویش کھڑا تھا

جس کے ایک ہاتھ میں کشکول اور دوسرے میں ایک لاٹھی تھی یہ کوئی اور نہیں تھا بلکہ اُس کا اور صرف اُس کا شہہ مرید تھا۔ وہ مرید جس کی فراق میں تیس سال اُس نے لمحہ لمحہ فراق کے انگاروں پر گزارے تھے اور جل بُن گئی تھی۔ اس نے اس انتظار میں رند سردار اور بہادر میر چاکر رند کو منہ تک نہیں لگایا اور بس مرید مرید۔۔۔۔ مرید مرید پکارتی رہی۔۔۔۔۔ تیس سال۔۔۔۔ ایک عمر ہوتی ہے۔۔۔ ایک بچہ اتنے عرصہ میں جوان ہو کر کئی بچوں کا باپ بن جاتا ہے۔ مگر حانی منتظر رہی اپنے مرید کی۔ شاہی محل اور قلعہ اُس کے لیے قید خانہ اور اذیت گاہ تھے، چاکر اُس کے لیے ایک نامحرم اجنبی تھا، وہ اُسے اپنا سب سے بڑا دشمن خیال کرتی تھی اور ہر وقت اُسے کوستی اور بددعائیں دیتی رہتی تھی۔ اور اب تیس سال بعد اس کا مرید ایک درویش کی شکل میں اُس کے سامنے کھڑا تھا اور ٹکٹکی باندھے اپنی برسوں پرانی پیاسی آنکھوں کی تشنگی بجھا رہا تھا۔ دونوں کی آنکھوں سے اشک مانندِ سیلِ آب رواں تھا، دونوں کے چہرے اور گریبان بھیگ چکے تھے، مرید کے چہرے، داڑھی اور گریبان پر سے آنسو یوں بہہ رہے تھے جیسے آب رواں ہو اور حانی کے ڈھلتی عمر کے باوجود خوبصورت اور حسین چہرے اور رخساروں پر آنسو مثلِ آب بہتے ہوئے اس کے گریبان اور دامن کو تر کر رہے تھے۔ حیرت و استجاب اور بے یقینی کی یہ کیفیت کافی دیر تک رہی۔ دونوں کو اپنے اردگرد کے ماحول کی کوئی خبر نہ تھی، انہیں اس بات کا کوئی علم نہ تھا کہ میر چاکر سمیت کئی لوگ وہاں جمع ہو چکے ہیں اور وہ دونوں کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ مگر یہ دونوں عاشق اور برسوں سے بچھڑے محبت کے مارے دنیا و مافیا سے بے خبر ایک دوسرے کی جانب ٹکٹکی باندھے ایسے دیکھ رہے تھے کہ جیسے سب کچھ تھم سا گیا ہو۔

اس کے بعد مرید دوبارہ پہاڑوں کی جانب چل پڑا۔ حانی نے اسے روک کر کہا کہ رک جاؤ اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو مگر مرید نے حانی سے کہا کہ، میں یہ دنیا چھوڑ چکا ہوں، میرا پیچھا نہ کرو۔

لیکن حانی نہ مانی۔ کہتے ہیں کہ اسی اثناء میں ایک سفید اونٹ نمودار ہوا اور وہ دونوں اس پر بیٹھ کر پہاڑوں میں اوجھل ہو گئے۔ بلوچ قوم اور بالخصوص رند قبائل کا عقیدہ ہے کہ شہہ مرید اب بھی زندہ ہے اور وہ بولان کے پہاڑوں اور وادیوں میں گھومتا رہتا ہے اور بعض لوگوں نے اُسے دیکھا بھی ہے۔ رندوں میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ: ”جب تک یہ دنیا باقی ہے شہہ

مرید زندہ ہے''

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ چاکر نے حانی سے شادی کر لی تھی مگر اس کی اور حانی کی ساری زندگی نہیں بنی اور حانی اسے منہ تک نہیں لگاتی تھی اور اس سے لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ جب مرید واپس آیا اور اس نے حانی سے ملاقات کی تو قبیلہ کے بڑے بوڑھے لوگوں نے چاکر کی منت سماجت کی کہ وہ اب حانی کو چھوڑ دے اور ان دو محبت کرنے والوں پر مزید ظلم نہ کرے اور انہیں ایک ہونے دے۔ کہتے ہیں چاکر نے لوگوں کا مشورہ سنا اور اس نے حانی کو طلاق دے دی تب حانی شہہ مرید کے ساتھ چلی گئی۔

شہہ مرید کے زندہ ہونے یا دونوں کے زندہ غائب ہوجانے کی روایات بلاشبہ افسانوی ہیں اور ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے اور دوم یہ کہ شہہ مرید جب تیس سال بعد اپنے وطن واپس آیا تب تک چاکر پنجاب کی جانب نکل چکا تھا۔ لہٰذا شہہ مرید کی حانی سے دوبارہ ملاقات اگر ہوئی بھی تھی تو وہ اُس کے اپنے گھر میں ہوئی ہوگی، مگر یہ بھی واضح ہو کہ حانی میر مندو کی بیٹی تھی جو شہک کا ایک خاص معتمد تھا اور شہک نے اسے قلات کا حاکم مقرر کیا تھا۔ (نصیر (2000):14) جس نے بیس سال قلات پر حاکمیت کی اور پھر میر بجار میروانی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ لہٰذا داستان کا آخری حصہ کافی مشکوک ہے جس پر نئے سرے سے تحقیق کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ شہہ مرید نے مکہ میں اتنا طویل عرصہ نہ گزارا ہو اور شاعری میں اس عرصہ کو کچھ مبالغہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔

بہرحال اس کے باوجود حانی و شہہ مرید کی داستان کو بلوچستان کی رومانوی لوک داستانوں میں وہی مقام حاصل ہے جو عربوں میں لیلیٰ اور قیس، پنجاب میں ہیر اور رانجھا، سندھ و بلوچستان میں سسی اور پنوں، ایرانیوں میں شیریں اور فرہاد کی داستانوں کا ہے۔ غالباً سولہویں صدی کے ابتدا میں ہی یہ واقعہ رونما ہوا تھا اس کے بعد رند و لاشار قبائل کی خانہ جنگی شروع ہوئی تھی۔ حقائق بھی یہی کہتے ہیں اور واقعات کی کڑیاں بھی اسی طرح آپس میں ملتی ہیں۔ ممکن ہے کہ چاکر اور گواہرام کی آپس کی خانہ جنگی اور تباہی حانی و شہہ مرید کی بددعاؤں کا نتیجہ ہو کہ جو بالآخر چاکر کی اپنے وطن سے ہمیشہ کے لیے جلاوطنی اور بے دخلی و مہاجرت پر منتج ہوئی۔

غوث بخش صابر نے حانی اور شہہ مرید کے کلام کا بیشتر حصہ لوک ورثہ اسلام آباد

پاکستان کی جانب سے کتابی شکل میں شائع کیا ہے جبکہ دیگر محققین اور مصنفین نے بھی اس سلسلے میں کافی مواد اکھٹا کیا ہے۔ جناب محمد سردار خان گشکوری بلوچ نے اے لٹریری ہسٹری آف بلوچز کے عنوان سے جو کتاب دو حصوں میں شائع کی ہے اُس کے حصہ اول میں اس داستان اور حانی وشہہ مرید کے کلام کا کچھ حصہ محفوظ کیا ہے جبکہ شیر محمد مری، میر مٹھا خان مری، جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری نے بھی اس سلسلے میں گرانقدر کام کیا ہے اور ان دونوں کی داستانِ عشق اور شاعری کو محفوظ کرنے کی سعی کی ہے۔ علاوہ ازیں اثیر عبدالقادر، جمیل زبیری، سلم خان گمی اور کئی دیگر اہلِ قلم نے بھی اس سلسلے میں کچھ کام کیا ہے۔ ان تحریروں کے پڑھنے سے نہ صرف اس پوری داستانِ محبت پر روشنی پڑتی ہے بلکہ صدیوں پرانی بلوچی شاعری پڑھنے اور اسے سمجھنے کا موقع بھی ملتا ہے اور یہ بات بھی آشکارا ہوتی ہے کہ بلوچ سماج میں عورت کو جو درجہ حاصل تھا وہ حانی کی بلند پایہ شخصیت، اس کی بے لوث محبت اور اعلیٰ درجے کی عشقیہ شاعری سے ہی واضح ہوتا ہے۔ یقیناً پانچ سو سال قبل بھی بلوچ سماج میں نسوانی آزادی اور احترامِ نسواں کا بلند و بالا تصور موجود تھا۔

سسی پنوں:

سسی پنوں کی داستان کا تعلق سرزمین مکران وسندھ سے ہے۔ اور یہ داستان سندھی اور پنجابی زبانوں سے بلوچستان اور بلوچی زبان تک آ پہنچی ہے۔ یہ داستانِ محبت بھی بین الاقوامی شہرت رکھتی ہے اور برصغیر کے علاوہ ایشیاء کے باقی خطوں نیز ایشیاء سے باہر بھی اس داستان کے بارے میں اہلِ علم و دانش بہت کچھ جانتے ہیں۔ اس داستان کو سب سے پہلے پنجابی زبان کے مشہور و معروف صوفی شاعر ہاشم شاہ نے قلمبند کیا اور اس کی کہی ہوئی داستان سسی پنوں نے بڑی شہرت پائی۔ یہ تمام تر داستان پنجابی زبان میں منظوم انداز میں بیان کی گئی ہے۔ مشہور محقق اور مترجم جناب شفیع عقیل نے اس کلام کو بمعہ اردو ترجمہ کے 2002ء میں بک ہوم والوں کی جانب سے شائع کروایا۔ یہ کتاب سسی پنوں کے عنوان سے دستیاب ہے۔ علاوہ ازیں اس داستان کو سندھ کے مشہور و معروف صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بھی اپنی کتاب شاہ جو رسالو میں تفصیل کے ساتھ سندھی زبان میں بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس

داستان کے بارے میں اردو، بلوچی، سندھی، پنجابی، سرائیکی اور انگریزی زبان میں بھی کافی مواد دستیاب ہے اور اس سلسلے میں کئی محققین اور مصنفین کی کاوشیں نظر آتی ہیں۔ان تمام محققین اور مصنفین کی کاوشیں اور تحریریں اپنی جگہ مگر جو چاشنی، خوبصورتی اثر انگیزی ہاشم شاہ کے پنجابی کلام میں ہے وہ کسی اور بیان کردہ داستان میں نہیں ملتی۔ یقیناً ہاشم شاہ نے سسی پنوں کی داستان کو جس طرح امر کیا اسی طرح اس داستان نے ہاشم شاہ کو بھی دنیا بھر میں پہچان دی اور نیک نام کیا۔

ہاشم شاہ کی کہی ہوئی داستان سسی پنوں کا پہلا نسخہ 1871ء میں منظر عام پر آیا (اعجاز (2007):21) لیکن طبع آزماؤں نے اس منظوم داستان میں کئی غیر معقول اضافے کر کے اس کی کشش اور ادبی اہمیت کو سخت نقصان پہنچایا اور کئی اغلاط، ترمیمات اور اضافات اس میں شامل کیے گئے جس کی وجہ سے ہاشم شاہ کی اپنی کہی ہوئی باتیں اور متن ان اغلاط ناموں میں دب کر رہ گئیں۔ بعد ازاں بعض اہلِ علم نے اصل متن کو منظر عام پر لانے کی سعی و جدو جہد کی۔ ان اہل علم و دانش میں ایس سنت سنگھ، گلاب سنگھ، منشی عزیز دین، سیٹھ آدم جی عبداللہ اور ملک بشیر احمد شامل تھے۔ جناب شفیع عقیل نے ان درج بالا حضرات کے بیان کردہ اور تالیف کردہ مواد کو سامنے رکھ کر زیادہ بہتر انداز میں ہاشم شاہ کے کلام کے اصل متن کو منظر عام پر لانے کی سعی کی ہے اور ساتھ ہی اس متن کا اردو ترجمہ بھی تحریر کر کے اس داستان کی اہمیت بڑھا دی ہے۔ شفیع عقیل نے کوشش کی ہے کہ وہ ہاشم شاہ کے بیان کردہ اصل متن کو سامنے لا سکے جس میں انہیں کافی حد تک کامیابی ہوئی ہے اور وہ اس داستان کے بڑے حصے کو محفوظ کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر انوار احمد اعجاز نے ہاشم شاہ کے پورے منظوم کلام کو بمعہ اردو نثری ترجمہ کے 2007 میں شائع کروا کے گویا ہاشم شاہ کے اصل کلام کو زیادہ بہتر انداز میں محفوظ کیا۔ یہ کتاب دستیاب ہے اور اس میں ہاشم شاہ کی کہی ہوئی پوری داستانِ سسی پنوں منظوم انداز میں بیان ہوا ہے اور ساتھ ہی ڈاکٹر انوار احمد اعجاز صاحب نے بڑے ہی اچھے انداز میں اس کا اردو نثری ترجمہ بھی تحریر کیا ہے جس کی وجہ سے اُن حضرات کو اس پوری داستان کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے جو پنجابی زبان سے نابلد ہیں۔

محققین اور مصنفین کے مطابق سسی پنوں کی رومانوی داستان سندھ اور بلوچستان کے خطوں سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا تعلق بارہویں صدی عیسوی کے زمانے سے ہے مگر بعض حضرات اس کے سال وسنہ اور خطہ ومقام تک سے اختلاف رکھتے ہیں اور خود اختراع کردہ آرا دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض حضرات سسی اور پنوں کے ناموں تک سے اختلاف رکھتے ہیں مگر عجیب بات ہے کہ وہ سسی پنوں کی داستان کی سچائی اور وقوع پذیر ہونے سے کوئی اختلاف نہیں رکھتے اور سب اس بات پر متفق ہیں کہ یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ امکان یہی ہے کہ یہ واقعہ سندھ اور بلوچستان سے تعلق رکھتا ہے اور گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کے دوران پیش آیا تھا جب مکران پر ہوت قبیلہ کی حاکمیت قائم تھی اور مکران کے سندھ کے ساتھ گہرے تجارتی تعلقات قائم تھے اور دونوں خطوں کے تاجر ایک دوسرے کے علاقوں میں آتے جاتے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب وسط ایشیاء میں منگول طوفان نے سر اٹھانا شروع کیا تھا اور چنگیز خان بڑی تیزی کے ساتھ ایشیاء پر اپنے پنجے گاڑھ رہا تھا اور ہر طرف تباہی وبربادی پھیلا رہا تھا۔ چنگیزی طوفان سے قبل ہی مکران پر ہوت قبیلہ کی حاکمیت قائم ہو چکی تھی۔

ہاشم شاہ کے بیان کے مطابق سسی بھنبھور کی حکمران جام آدم کی بیٹی تھی (بعض دیگر نے حکمران کا نام دلورائے لکھا ہے جو کہ غلط ہے)، جو اپنے دور کا ایک عظیم حکمران تھا۔ ہاشم شاہ جام آدم کے سطوت وجبروت کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

آدم جام بھنبھور شہر دا صاحب تخت کہاوے
وحوش، طیور، جناور، آدم ہر اک سیس نواوے
جاہ جلال سکندر والا خاطر مول نہ لیاوے
ہاشم آکھ زبان نہ سکدی کون تعریف سناوے

ترجمہ:

آدم جام بھنبھور شہر کا تاجدار واقلیم سلطنت تھا
اس کی سلطنت کے باسی سبھی درند، چرند،
پرند آدم زاد اس کے آگے تعظیمی سجدہ بجالاتے تھے
سکندری جاہ وجلال کا حامل وہ ایسا بادشاہ تھا کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا

ہاشم! زبان کو عجز کلام ہے، پھر بھلا کون اس کی مدح وتعریف بجالا سکتا ہے

(اعجاز (2007):31-30)

ہاشم شاہ کے بیان کے مطابق جام آدم ایک عظیم حکمران تھا مگر اور اس کی سلطنت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، اس کے پاس عظیم لشکر تھے، مال و دولت تھی، جاہ وحشمت تھی، تاج و تخت تھا، بیویاں تھیں حتیٰ کہ دنیا کی کسی نعمت کی کمی نہ تھی اگر کمی تھی تو اولاد جیسی نعمت کی جس سے جام آدم محروم تھا اور ہر وقت اللہ سے دعائیں کیا کرتا تھا اور فقیروں، ملنگوں اور سادھوؤں کی خدمت کرتا تھا، غریبوں کی مدد کرتا تھا اور لوگوں کے کام آتا تھا ان کی ضروریات پوری کرتا تھا، کہ شاید اللہ تعالیٰ اُس سے راضی ہو اور اسے اولاد جیسی نعمت سے بھی سرفراز کرے جو اس کے بعد اس کی یہ وسیع وعریض سلطنت کی حفاظت کر سکے اور حکومت کر سکے۔ ہاشم شاہ جام آدم کی بے اولادی اور اولاد کی خواہش کے لیے اس کی عجز وانکساری کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

امیر وزیر غلام کروڑاں لشکر فوج خزانے
بیرک سرخ نشان ہزاراں، شام کھتان سہانے
کھاون خیر فقیر مسافر صاحب ہوش دیوانے
ہاشم ایس غمیں وچ عاجز، ہووس اولاد نہ خانے

ترجمہ:

آدم جام کے امرأ، وزرأ اور غلام اور مسلح لشکر کروڑوں (لاتعداد) میں تھے
اور خزانے بسیار تھے
شام ہوتے ہی اس کے سرخ رنگ کے پرچم ہزاروں کی تعداد میں ہر طرف
لہرا نے لگتے تھے
اس کے لنگر پر ہمیشہ فقیر، مسافر، صاحب ہوش وخرد اور دیوانے ملنگ سب
کھاتے تھے
مگر ہاشم! اس کے ہاں اولاد نہ ہونے کا غم اسے سخت عاجز ورنجور کیے
ہوئے تھا

(اعجاز (2007):31-30)

مزید لکھتا ہے کہ:

خواہس ایس اولاد ہمیشہ پیر فقیر مناوے

دے لباس پوشاک برہنیاں، بھکھیاں طعام کھلاوے

دیکھ اُجاڑ مسافر کھارن نال سرائے پواوے

ہاشم کرے جہان دعائیں آس سائیں ور لیاوے

ترجمہ:

وہ اولاد کی تمنا میں پیروں فقیروں کے آستانوں پر حاضر ہو کر انہیں راضی کرتا

اسی آرزو کے لیے وہ ننگوں کو لباس پہناتا اور بھوکوں کو کھانا کھلاتا

اس نے ویرانوں اور اجاڑ مقامات پر بھی مسافروں کے آرام کی خاطر سرائے بنائے

ہاشم! اس کی ان نیک کاموں کی وجہ سے اس کی تمام رعایا اس کے لیے دست بدعا تھا کہ اللہ اسے اولاد جیسی نعمت سرفراز کرے۔

(اعجاز (2007):32-33)

بالآخر اللہ تعالیٰ نے جام آدم اور اس کی رعایا کی دعائیں سن لیں اور فقیروں و محتاجوں کی التجائیں ' م آگئیں اور جام آدم کے گھر ایک چاند سی خوبصورت بیٹی پیدا ہوئی کہ جس کے حُسن و خوبصورتی کے سامنے لعل و جواہر اور ہیرے موتی بھی ہیچ نظر آتے تھے۔ اس کا حُسن اتنا ہی مکمل تھا جتنا کہ سورج کی تابناکی اور روشنی مکمل ہوتی ہے۔

سسی کی پیدائش پر جام آدم نے غریب غربا اور مساکین و ضرورتمندوں کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے اور خواب دولت لٹائی۔ پورے ملک میں جشن کا سا سماں تھا اور ہر طرف خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے۔ رسم و رواج کے مطابق جام آدم نے دور دراز سے جوتشیوں کو بُلایا تا کہ وہ اس کی خوبصورت اور حسین و جمیل بیٹی اور چاند جیسے روشن چہرہ والے بیٹی کے مستقبل کے بارے میں اُسے بتائیں۔ کئی علاقوں اور بھانت بھانت سے جوتشی اور علماء اس کے دربار میں آئے جو اپنے اپنے علم و فن میں کمال رکھتے تھے اور یکتائے روزگار تھے۔

مگر جب جوتشیوں نے جام آدم کی چاند جیسی خوبصورت بیٹی کا فال دیکھا اور اس کے مستقبل کے بارے میں حساب کتاب لگایا تو انہیں اصل بات بادشاہ جام آدم کو بتانے کی جرأت نہ ہوسکی کیونکہ اُن تمام جوتشیوں کے حساب اور علم کے مطابق جام آدم کی بیٹی جوان ہوکر عشق و محبت کے چکروں میں پھنس جائے گی جو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوگا۔ یہ منظر نامہ باجبروت حکمران جام آدم کے سامنے بیان کرنا اتنا آسان نہ تھا وہ ان کی کھالیں کھینچ سکتا تھا اور انہیں اس طرح کے بیانات پر عبرتناک سزا دے سکتا تھا۔ لیکن بتانا تو تھا اور جام آدم نے بھی تو آخر ان جوتشیوں سے ان کے حساب کتاب کے نتائج بھی تو پوچھنا تھا، آخر انہیں بلایا بھی تو اسی مقصد کے لیے تھا۔ لہٰذا تمام جوتشیوں نے متفقہ طور پر اپنے نتائج کو جام آدم کو بتادیا۔ جب جام آدم نے اُن سے بار بار نتائج بتانے کا کہا تو انہوں نے اُسے واضح الفاظ میں بتایا کہ:

شاہ دوبار کیہا چُپ کیہی کھو جواب کیہ آوے؟
عرض کیتی دربار ساتھیں سخن کلام نہ آوے
راست زبان نہ آکھن جوگی جھوٹھا ایمان ونجاوے
ہاشم کرن لگاؤ بتھیرا، پر قسمت کون مٹاوے
اوڑک خوف اُتار نجومی بات کہی من بھانی
عاشق ہوگ کمال سسی جد ہوگ جوان سیانی
مست بے ہوش تھلاں وچ مرسی درد فراق رنجانی
ہاشم داغ لگاوگ کل نوں ہوگ جہان کہانی

(اعجاز (2007):39-38)

ترجمہ:

بادشاہ نے نجومیوں کو خاموش پاکر دوبارہ کہا یہ خاموشی کیسی ہے؟ مجھے بتاؤ سسی کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔

نجومیوں نے عرض کیا بادشاہ سلامت! بھرے دربار میں ہم میں کچھ بھی بتانے کی ہمت نہیں ہے۔

سچی بات زبان پر لائی نہیں جارہی ہے اور جھوٹ بولنے سے ہمارا ایمان چلا

جائے گا۔

ہاشم! حقیقت کو بھلے کتنا ہی کیوں نہ چھپایا جائے مگر قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے؟

بالآخر نجومیوں نے دل سے خوفِ ملامت نکال کر حق بات کہہ ہی ڈالی

کہ بادشاہ سلامت! جب سسی کامل جوان ہوگی تو کمال درجے کی سچی عاشق ہوگی

وہ دردوفراق کی اذیتیں سہتی، رنج والم برداشت کرتی بیابانِ صحرا تھل میں اپنی جان دے گی

ہاشم! سسی اپنے خاندان کو بدنامی کا داغ لگائے گی اور اس کی سچی محبت کی کہانی ہمیشہ زندہ رہے گی۔

(اعجاز (2007):39-38)

نجومیوں کی باتیں سن کر جام آدم پر سکتہ طاری ہوا اور وہ بالکل ایسے ساکت ہوا جیسے اسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو اور اس کی سانس قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ہو۔ کافی دیر تک جام آدم اسی کیفیت میں رہا، اس کے سوچنے سمجھنے کی حسیات نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جن سے اس کا چہرہ اور دامن تر ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ وہ جوتشی بھی رو رہے تھے جو سسی کی مستقبل کے بارے میں بتانے آئے تھے۔ سب ہی گریہ کناں تھے اور اُن کی آنکھوں سے سسی کی اس بدقسمتی اور جام آدم کے اللہ کی جانب سے اس کڑے آزمائش پر اشک مانندِ سیل رواں تھے کہ جیسے تیز بارش کے بعد دریا میں طغیانی آئی ہو اور اس کے کناروں سے ہر طرف پانی ہی پانی بہہ نکلا ہو، بالکل اسی طرح اُس وقت جام آدم اور جوتشیوں کا حال تھا کہ جن کی آنکھوں سے بہنے والا پانی سیلاب کی طرح بہہ نکلا تھا جن سے اُن کے چہرے، داڑھیاں اور دامن تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ گریہ کناں تھے کہ اے رب! جام آدم کے لیے ایسی آزمائش۔۔ برسوں اُسے اولاد کی نعمتوں سے محروم رکھا، پھر لاکھوں دعاؤں، التجاؤں اور مناجاتوں کے بعد اسے اولاد دی اور وہ بھی نرینہ نہیں بلکہ پیاری سی بیٹی جس کی پیدائش پر وہ خوش، مطمئن، صابر اور شاکر تھا، اس نے دل کھول

کر خوشیاں منائیں اور تشکر کی خاطر آپ کی راہ میں دولت کے انبار لٹائے اور نیکی کی انتہا کر دی، کہ لنگر خانوں سے بھوکوں کے پیٹ بھر گئے، ننگوں کو لباس فراہم کیا گیا، مفلسوں کی افلاس ختم کر کے انہیں مالا مال کر دیا گیا، محتاجوں کی محتاجی دور کر دی گئی حتیٰ کہ جام آدم نے آپ کی رضا اور خوشنودی کی خاطر شکرانے کے نوافل ادا کیے اور سجدہ شکر بجالایا۔ مگر یا اللہ یہ اُس کی بیٹی کی کیسی قسمت لکھی کہ وہ باپ کی نیک نامی کی بجائے اُس کی بدنامی کا باعث بن جائے گی اور تخت و تاج کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی بجائے صحراؤں اور ویرانوں میں بے کسی کی موت مر جائے گی۔ یا اللہ یہ امتحان بہت کڑا ہے جام آدم ایک انسان ہے اس کی کیا کیفیت ہوگی، وہ یہ سب غم اور اور صدمے کیسے برداشت کرے گا، وہ اتنی بڑی بدنامی کے بعد کیسے جی سکے گا اور کسی کا سامنا کر سکے گا، یا اللہ وہ حکمران ہے اور نیک و عادل حکمران ہے، اس کی رعایا اس سے راضی و مطمئن ہے اور سب اس کے زیرِ سایہ امن و سکون اور عافیت کی زندگی گزار رہے ہیں، یا اللہ وہ اپنی رعایا کا سامنا کیسے کر پائے گا۔۔۔۔ سب رو رہے تھے اور گریہ وزاری کر رہے تھے، وہ سسی کے لیے بھی رو رہے تھے کہ وہ ایک معصوم اور بے گناہ بچی ہے اور ابھی ابھی پیدا ہوئی ہے، اسے کیا پتہ قسمت کسے کہتے ہیں، وہ تو ابھی تک پستانِ مادر کو بھی دبوچ نہیں سکتی، اسے بھلا کیا پتہ کہ محبت، عشق، دربدری کیا شئے ہیں، وہ تو گود مادر میں اپنے چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھ پاؤں چلا کر غوں غوں کرنے لگی ہے، ابھی تو صرف چند دن کی ہی تو ہے، اور بھوک لگنے پر بلک بلک کر رونے لگتی ہے۔ ہائے اُس بیچاری کو کیا پتہ کہ اُس کے بارے میں محل میں جوتشی اور اس کے والد کیا سوچ رہے ہیں، اسے تو یہ بھی نہیں پتہ کہ جوتشی کیا ہیں یا اس کا والد کون ہے، وہ تو ابھی تک کسی بھی رشتے کی پہچان نہیں رکھتی کہ ابھی وہ بہت معصوم اور نازک سی ہے، پھولوں سے بھی زیادہ نازک، ریشم سے بھی زیادہ نرم۔ ہائے سسی! ہائے اے پیاری سی گڑیا! یہ جوتشی آپ کے بابا سے کیا کہہ رہے ہیں اور آپ کے بارے میں اُن کے دل میں کیسی بدگمانی پیدا کر رہے ہیں، ہائے اے پیاری سی معصوم سی پھولوں جیسی بیٹی! دیکھو یہ جوتشی آپ کے بابا کو یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ سسی کو ابھی اور اسی وقت گھر سے نکال دے یا جان سے مار دے۔ مگر سسی۔۔۔ سسی تو ان سازشوں سے دور پنگوڑے میں پڑی غوں غوں کرتی اپنے نرم و نازک اور مرمریں ہاتھوں کو چوس رہی تھی۔ اس معصوم کو کسی بھی بات کا کوئی علم نہ تھا اور ہوتا بھی تو کیسے

ابھی تو اس کی عمر ہی چند دن تھی، اسے تو ہفتہ بھی پورا نہیں ہوا تھا، اسے کیا پتہ کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ وہ پنگوڑے میں پڑی کلکاریاں کر رہی تھی اور دنیا کی بے رحم سازشوں سے بے خبر اپنی معصوم اور سوچوں سے خالی دنیا میں پڑی تھی۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ اس کا مہربان، ہمدرد اور خدا ترس والد اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے؟ وہ معصوم تو جوتشیوں کی سازشوں سے بھی بے خبر تھی جو اس کے والد کو یہ کہہ رہے تھے کہ اس معصوم سے جان چھڑاؤ جو جوان ہو کر اُن کی بدنامی کا باعث بنے گی۔ ہائے سسی تیرا کیا ہوگا۔ اے معصوم سی کلی، اے چاند کے ٹکڑے تیرا کیا ہوگا۔ دیکھو تو سب تیرے پیچھے پڑے ہیں اور تم سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔

جوتشیوں کی باتوں نے جام آدم کا سکھ وچین چھین لیا اور اسے شدید پریشانی میں مبتلا کیا۔ وہ حیران تھا کہ اس معصوم سی بچی کو جو بڑی منتوں اور التجاؤں کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی تھی، کو کیسے مار دے یا اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ وہ حیران و پریشان تھا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، اللہ نے اسے بہت بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ اس معصوم کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے جس کے مستقبل کے بارے میں اسے انتہائی بُری اور افسوسناک خبر سنائی گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ صرف شک کی بنیاد پر معصوم سی بچی کا خاتمہ کیوں کرے، جبکہ بات اس کے آنے والے مستقبل کے بارے میں کی گئی ہے۔ کچھ بھی تھا جام آدم، وہ بادشاہ تھا، باجبروت اور بہادر تھا، سخی وغنی تھا، امیر وکبیر تھا، عاقل و دانش تھا، ملک و میراث کا مالک تھا، فوجوں کا مالک تھا مگر تھا وہ آخر کار ایک باپ، ایک والد۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا، اس کے اعضاء جواب دے رہے تھے، اس کا جسم ساکت ہو رہا تھا، اس کا سارا وجود ہل چکا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ۔۔۔ کہ وہ کیا کرے، اس آزمائش پر کیسے پورا اُترے، اس مسئلے کو کیسے حل کرے۔ اس نے اپنے انتہائی قریبی وزیر سے مشورہ کیا جو عقل و دانش میں یکتا سمجھا جاتا تھا اور آدم جام کا انتہائی وفادار ساتھی تھا۔ اس نے آدم جام کو مشورہ دیا کہ وہ اس بچی کو قتل نہ کرے کہ لوگ اسے ملامت کریں گے اور وہ اللہ کے ہاں مجرم ہوگا کہ یہ بچی اللہ نے اسے عطا کی ہے لہٰذا آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا اور نہ ہی آپ کا مقام ومرتبہ ایسا ہے کہ اس معصوم بے گناہ بچی کے خون میں اپنے ہاتھ رنگ دیں۔ وزیر نے تھوڑا توقف کیا اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے جام آدم کو یوں مشورہ دینے لگا: کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس بچی کو اللہ

کے سپرد کر دیں جس نے یہ آپ کو عطا کی ہے، اس طرح آپ مجرم بھی نہیں ہوں گے اور گناہگار بھی نہیں۔ آپ کے دل پر بوجھ ضرور ہوگا مگر یہ بوجھ خونِ ناحق سے بہرحال کم ہوگا اور آپ کا ضمیر بھی آپ کو ملامت نہیں کرے گا۔

جام آدم نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا کہ میں کیسے اسے اللہ کے سپرد کر سکتا ہوں ایسا کون سا راستہ ہے کہ یہ بچی بھی محفوظ رہے اور مجھے بھی اطمینان ہو؟

وزیر اپنے حکمران جام آدم کے اس تجسس بھرے سوال کے جواب میں سرخم کرتے ہوئے یوں گویا ہوا:

حضور جان کی امان پاتا ہوں، تو جام آدم نے فوراً اسے امان دیتے ہوئے بے چینی کے ساتھ کہا کہ مجھے وہ طریقہ جلد بتاؤ کہ جس سے اس معصوم سی بچی کی جان بچ جائے اور میں کسی جرم کے ارتکاب سے محفوظ رہوں۔

وزیر نے تحمل سے جواب دیتے ہوئے کہا: حضور ایک لکڑی کا بڑا اور محفوظ سا صندوق بنوائیں جو پانی کی سطح پر تیر سکے اور ڈوبنے سے محفوظ ہو، اس میں اس معصوم سی بچی کو رکھ کر دریا میں بہا دیں اور ایسے ہی جیسے موسیٰ نبی نُوان کی والدہ نے فرعون کے شر سے محفوظ رکھنے کی خاطر دریا نیل میں بہا دیا تھا، آپ بھی اللہ پر توکل کر کے اس بچی کو دریا میں بہا دیں خدا نے چاہا تو وہ محفوظ رہے گی اور کہیں نہ کہیں پہنچ کر کسی کے ہاتھ لگ جائے گی اور اس کی پرورش بھی ہو جائے گی۔ اس طرح آپ عذاب الٰہی سے بھی محفوظ ہو جائیں گے اور یہ اطمینان بھی ہوگا کہ اللہ کی امانت تھی لہٰذا اسی کے حوالے کر دی ہے وہ ذات کبریا خود اس کی حفاظت کا بندوبست کرے گا۔

اتنا کہہ کر وزیر نے خاموشی اختیار کی اور جام آدم کے ردِعمل کا انتظار کرنے لگا۔ جام آدم وزیر کی بات سن کر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کافی دیر بعد اس نے وزیر کی طرف دیکھا اور کہا کہ وزیر محترم مجھے آپ کا مشورہ اچھا اور مناسب لگا۔ اس طرح ایک نبی کی سنت بھی پوری ہو جائے گی، میرا پردہ بھی ہوگا اور قتل جیسے گناہ سے بھی بچ جاؤں گا۔ لہٰذا جام آدم نے ایک بڑا سا لکڑی کا بکس یعنی صندوق بنوایا جو ہر طرح سے محفوظ تھا، پھر اس میں سکے اور سونے و جواہرات رکھے، ایک نرم و گداز سا بستر بچھایا اور پھر جام آدم نے آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ معصوم سی

بچی کو اس بستر پر لٹایا اور اسے دریا کے تند و تیز لہروں کے سپرد کر دیا۔

سسی کے واقعہ کے اس حصے میں محققین آپس میں اختلاف رکھتے ہیں یعنی یہ کہ اس صندوق کو کس مقام پر دریا میں ڈال دیا گیا تھا؟ نیز وہ دریا کون سا تھا؟ کوئی اسے راوی، کوئی جہلم تو کوئی دریا سندھ کی کوئی شاخ لکھتا ہے جبکہ بعض مصنفین اسے اپنے اپنے علاقوں کی ندیوں میں شمار کرتے ہیں۔ الغرض ہمیشہ اختلافات رکھنے والے محققین اس بات پر بھی اختلاف ہی رکھتے ہوئے قارئین کو الجھانے کی کوشش کرتے ہیں، اسی طرح بعض تو ہوت کو قبیلہ ہی نہیں مانتے بلکہ اسے پنوں کا خطاب یا لقب لکھتے ہیں جبکہ رچرڈ ٹمپل تو پنوں کے کردار سے ہی منحرف ہے اور لکھتا ہے کہ اس کردار کو بعد میں اس کہانی میں شامل کیا گیا ہے جبکہ اصل مرکزی کردار کوئی اور ہوگا۔ (عقیل (2002):22) البتہ اکثریتی مورخین دریا کو دریا سندھ تسلیم کرتے ہیں جبکہ وہ حاکم جو سسی کا اصل والد تھا وہ بھنبھور ہی کا حکمران تھا، اور وہ مقام جہاں پر سسی کو دھوبی محمد (بعض مصنفین دھوبی کا نام اتا لکھتے ہیں) نے بچا لیا تھا وہ شاہی محل سے صرف دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ دریا کی آہستہ آہستہ خرام خرام، نغمگی کے ساتھ بہنے والا پانی سسی کے صندوق کو کنارے کی طرف بہا تا رہا جہاں دھوبی محمد کی اس پر نظر پڑی اور اسے پانی سے کھینچ نکالا۔ دھوبی محمد ایک بے اولاد انسان تھا اور شادی کو کافی عرصہ گزر جانے کے باوجود اولاد جیسی نعمت سے محروم تھا۔ وہ اور اس کی بیوی ہر وقت اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر اولاد کے لیے دعائیں مانگتے رہتے تھے۔ وہ ایک رحم دل انسان تھا اور اس کے کئی چیلے تھے جو اس کے ساتھ گھاٹ پر کام کرتے تھے۔ تحفۃ الکرام کا مصنف نہ تو علاقہ بھنبھور سے سسی کا نسبی تعلق تسلیم کرتا ہے اور نہ ہی اسے جام آدم کی بیٹی مانتا ہے بلکہ وہ اس کے اصل ماں باپ کو برہمن لکھتا ہے جبکہ اس کا علاقہ بھانبھرواہ یا برہمن آباد لکھتا ہے۔ وہ عطا دھوبی کی بجائے منیھہ یا ''لار'' نامی دھوبی کا تذکرہ کرتا ہے جس کے پانچ سو شاگرد تھے۔ (عقیل (2002):21) مگر درست حقیقت یہی ہے کہ سسی بھنبھور ہی کے حاکم کی بیٹی تھی جسے اس نے بدنامی کے ڈر سے دریا بُرد کر دیا تھا مگر اللہ کو اس بچی کی زندگی عزیز تھی لہٰذا اس کے بچانے کی سبیل ہوگئی اور وہ محمد نامی ایک مقامی باشندے کے ہاتھ آیا جو پیشے کے لحاظ سے دھوبی تھا اور طبیعت کے لحاظ سے انتہائی رحمدل اور خداترس تھا جبکہ وہ طویل عرصہ سے شادی شدہ ہونے کے باوجود اولاد جیسی نعمت سے محروم تھا۔

لہٰذا محمد اس معصوم اور خوبصورت بچی کو پا کر بے حد خوش ہوا اور اسے اپنے اور اپنی بیوی کی دعاؤں کا نتیجہ کہہ کر اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوا اور بچی کو اٹھا کر خوشی خوشی گھر آیا۔ اور اپنی بیوی کو آواز دیتے ہوئے کہا کہ دیکھو اے نیک بخت عورت اللہ نے ہماری دعاؤں کا کیا ثمر دیا ہے آؤ بھاگ کر آؤ، جلدی آؤ۔ شوہر کی حواس باختگی پر اس کی بیوی تقریباً بھاگتی ہوئی باہر آئی اور بوکھلائی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی کہ کیا ہوا کیوں چلا رہے ہو، کیا لائے اور یہ تم نے ہاتھوں میں مرمریں و مخملیں کپڑوں میں کیا چیز لپیٹ کر اٹھایا ہے؟؟ اس کی بیوی نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

دھوبی محمد نے ہنستے ہوئے اور بیحد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو اے نیک بخت ہم بے اولاد تھے اور ہر وقت اللہ سے اولاد کے لیے دعائیں مانگتے تھے، میں آج گھاٹ پر کپڑے دھو رہا تھا کہ ایک صندوق بہتا ہوا دریا کے کنارے آیا تو میں نے اسے باہر نکالا۔ اس صندوق میں اس نرم و گداز بستر کے اندر یہ خوبصورت اور حسین و جمیل بچی لیٹی ہوئی تھی اور اطمینان سے اپنا انگوٹھا چوس رہی تھی اور اس کے ساتھ کچھ زیورات اور سکے بھی رکھے ہوئے تھے۔ یقیناً یہ بچی اللہ تعالیٰ نے ہماری دعاؤں کے نتیجے میں ہمیں دی ہے۔

دھوبی محمد کی نیک دل بیوی نے بھی اسے تحفہ خداوندی سمجھ کر قبول کیا اور سسی کی خوب ناز و نعم میں پرورش ہونے لگی۔ دھوبی اور اس کی بیوی ہی نے اس کا نام سسی یعنی چاند رکھا۔ سسی کے ملنے کی خوشی میں انہوں نے اپنے برادری کی دعوت کی اور خوب جشن منایا۔ اس طرح سسی شاہی محل سے ایک دھوبی کے گھر منتقل ہوئی مگر اس کے ساتھ ہی دھوبی کے گھر خوش بختیاں بھی ساتھ لے کر آ گئی۔ اس کے ملنے کے بعد دھوبی دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہا اور اس کا کاروبار خوب پھیلا۔ اس نے اپنے چیلوں کی تعداد میں اضافہ کیا اور کاروبار کو خوب پھیلایا۔ اس طرح وہ دن بدن دولت مند ہوتا گیا۔ سسی بھی خوب ناز و نعم میں پل کر بڑی ہوتی گئی اور دن بدن اس کی حسن لاجواب میں مزید نکھار آتا گیا اور جوں جوں وہ جوان ہوتی جا رہی تھی اس کی حسن و خوبصورتی بھی اسی طرح بڑھتی جا رہی تھی۔ اس طرح زندگی کے دن گزرنے لگے۔

دھوبی محمد نے جب خوب دولت کمائی تو دریا کنارے ایک بڑی سی زمین لی اور اس پر ایک باغ لگایا جسے اس نے سسی کے نام سے منسوب کرتے ہوئے سسی باغ کا نام دیا۔ یہ ایک

خوبصورت باغ تھا جس میں پھل دار درخت، سایہ دار درخت، قسم قسم کے پھول اور آرائش اور تفریح کی دیگر چیزیں موجود تھیں۔ اس باغ میں سسی اپنی ہمجولیوں کے ساتھ سیر سپاٹے اور دریا کنارے گھومنے کے لیے آتی تھی جو اس کے روز کا معمول تھا۔ اس نے باغ میں سسی کے لیے ایک خوبصورت محل بنوایا اور اس میں زندگی کی تمام آسائشیں مہیا کیں۔ اس طرح سسی اس پائیں باغ اور شاہی طرز کے محل میں تیزی کے ساتھ جوانی کی منزلیں طے کرنے لگی اور دن بدن اس کی خوبصورتی اور حسن میں نکھار آتا گیا اور وہ بے مثال ولاجواب حسن کی ملکہ بنتی گئی۔ ہاشم شاہ کے مطابق اسی محل میں محل بنانے والے غزنی کے کاریگر نے مختلف ممالک کے شہزادوں کی تصویریں نقش کی تھیں جن میں کیچ کے شہزادہ پنوں کی تصویر بھی شامل تھی۔ اور سسی اسی تصویر کو دیکھ کر پنوں پر فریفتہ ہوگئی تھی۔ لکھتا ہے کہ:

سسی کہیا بُلا مصور شابش ویر بھراؤ
جس صورت دی مورت کیتی مینوں آکھ سناؤ
کہڑا شہر، کون شہزادہ، ٹھیک پتا دس جاؤ
ہاشم! پھیر سسی ہتھ جوڑے تھاں مکان بتاؤ

ترجمہ:

سسی نے مصوروں کو بُلا کر کہا، بھائی تمہیں شاباش ہو
یہ جس حسین نوجوان کی تصویر ہے مجھے اس کی بابت بتاؤ
یہ کس شہر کا باسی اور کون شہزادہ ہے مجھے اس کا ٹھیک پتہ بتادو
ہاشم! پھر سسی نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ براہ کرم مجھے اس کا اتا پتا بتادو

(اعجاز (2007):67-66)

پھر وہ لکھتا ہے کہ سسی کے اس طرح بے چین اور ملتجی ہو کر پوچھنے سے اس کاریگر کا دل پسیج گیا اور اس نے اسے بتایا کہ یہ کیچ کا شہزادہ ہے اور اس کا نام پنوں ہے۔ لکھتا ہے کہ:

کیچم شہر ولایت تھل دی ہوت علی تس والی
سدا اُپت پنّوں شہزادہ عیب ثوابوں خالی
صورت اوس حسابوں باہر صفت خداوند والی

ہاشم! عرض کیتی اُستاداں، چنگ ککھاں وچ ڈالی

ترجمہ:

مصوروں نے جواباً کہا تھل ملک میں ایک کیچ شہر ہے وہاں کا تاجدار ہوت علی ہے

یہ اس کا بیٹا شہزادہ پنّوں ہے جو ہر عیب سے پاک اور بے پناہ خوبیوں کا مالک ہے

اس کی خوبصورتی اتنی بے حساب ہے کہ بس خدا کی تعریف کی جائے گی

ہاشم! مصوروں نے تو اپنا جواب عرض کر دیا مگر حقیقت میں انہوں نے سوکھے تنکوں کو چنگاری دی تھی

(اعجاز (2007):68-69)

ہاشم شاہ نے اس لوسٹوری میں مزید ڈرامائی اور افسانوی رنگ بھرنے کی خاطر یہ دعویٰ کیا ہے وگرنہ سسی نے اس سے پہلے کبھی پنوں کو نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی کوئی تصویر دیکھی تھی اور نہ کبھی اس کا ذکر سنا تھا۔ بہر حال سسی کے محل، باغ اور ہمجولیوں کو چھوڑ کر ذرا پنوں کی طرف چلتے ہیں۔

سندھ کے ہمسایے میں مغرب کی جانب علاقہ مکران واقع تھا جہاں کی حکمرانی بلوچ قبیلہ ہوت کے پاس تھی اور میر عالی خان ہوت اس زمانے میں وہاں کا حکمران تھا۔ بعض معتمد بیانات کے مطابق یہ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کا زمانہ تھا۔ پنوں میر عالی خان ہوت کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا جو وجاہت، خوبصورتی اور بہادری میں یکتا تھا۔ مکران اور سندھ کے مابین زمانہ قدیم سے ہی گہرے ثقافتی اور تجارتی تعلقات قائم تھے اور دونوں ممالک کے تاجر مال تجارت لاتے لے جاتے تھے۔ پنوں بھی اکثر تجارتی کاروانوں کے ساتھ سندھ آتا جاتا تھا۔ اس طرح تجارتی کاروانوں کی آمد کا سلسلہ سارا سال جاری وساری رہتا تھا۔

بھنبھور اس زمانے میں بڑا اور تجارتی شہر تھا۔ ٹھٹھہ کے علاوہ دوسرے شہروں میں مال تجارت لانے والے کاروان زیادہ تر یہیں سے گزر کر آگے جاتے تھے کیونکہ یہ ایک ساحلی شہر اور بندرگاہ بھی تھا اس لیے یہاں تجارتی سرگرمیاں ہر وقت جاری و ساری رہتی تھیں۔

بالخصوص کیچ اور مکران کے دیگر حصوں سے کاروانوں اور مال تجارت کی آمد کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا۔ مکران سے آنے والے قافلے یہاں پڑاؤ کرتے اور کچھ دن آرام کرنے کے بعد مزید آگے روانہ ہو جاتے اور اندرونِ سندھ مال تجارت لے جاتے۔ اس طرح سندھ میں داخل ہونے یا مکران کی جانب عازم سفر ہونے کے لیے بھنبھور مکران کے تاجروں کا اہم پڑاؤ مرکز ہوتا تھا اور یہاں قیام کے بعد ہی قافلے اپنی منزلوں کی جانب گامزن ہو جاتے تھے۔

محمد دھوبی اب شہر کے بااثر رؤسا میں شمار ہوتا تھا اور اس کا باغ اور محل لبِ دریا اور ساحل کنارے تھا لہٰذا آنے جانے والے کاروان اکثر اس کے باغ میں قیام کرتے اور اس کی مہمان نوازی سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہاں قیام کرنے والے مسافر اور تاجر لوگوں سے سسی کے حسن کا چرچا بھی سنتے رہتے تھے کیونکہ اس کی خوبصورتی کا شہرہ دور و نزدیک تک پھیل چکا تھا اور جب لوگ آپس میں باتیں کرتے تو وہ سسی کے حسن و رعنائی کے تذکرے ضرور کرتے تھے۔ اس طرح مسافر اور تاجر حضرات جب اپنے اپنے خطوں میں واپس چلے جاتے تو اپنے ساتھ سسی کے حسن لاجواب کے قصے بھی ساتھ لے جاتے اور اپنے اپنے علاقوں میں جا کر اپنے اپنے حلقوں میں اس کے تذکرے کرتے۔ کہتے ہیں کہ مسافروں کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ بھنبھور میں اپنے قیام کے دوران ایک بار سسی کا چہرہ حسین و دلربا کو دیکھ لیں تو وہ دنیا کے خوش قسمت ترین انسان ہوں گے۔ ایسا مسافر اپنے وطن جا کر سسی کے حسن اور خوبصورتی کو ان الفاظ میں بیان کرتا کہ سننے والے کو بھی اس بات کا اشتیاق رہتا کہ کاش وہ بھی ایک بار سسی کو دیکھ لے۔ اسی طرح ایک بار ایک کاروان کیچ مکران سے آیا اور حسبِ معمول کچھ دن بھنبھور میں ٹھہر کر واپس چلا گیا۔ اس کاروان کے لوگوں نے بھی سسی کے حسن و خوبصورتی کے چرچے سنے اور کسی خوش قسمت کی نظر بھی شاید سسی پر پڑی کہ جس نے عالمِ مدہوشی میں کیچ پہنچ کر جس طرح سسی کے حسن و رعنائی کی تصویر کھینچی کہ لوگ سن کر دنگ رہ گئے۔ کاروان کے لوگوں نے میر عالی ہوت حاکمِ مکران کے بیٹے پنوں سے بھی سسی کے حسن کے تذکرے کیے اور اسے یہ باور کرایا کہ سندھ تو سندھ پورے مکران اور پوری دنیا میں ایسی حسین و خوبصورت لڑکی کوئی نہیں ہے۔ وہ بلاشبہ حسن و رعنائی میں یکتا ہے اور اُس جیسا اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں۔ بتانے والے نے یہ بھی بتایا کہ جو ایک بار سسی کو دیکھ لیتا ہے پھر اس کی آنکھوں کو اور کچھ بھی نہیں بھاتا،

حتیٰ کہ وہ اپنے ہوش وحواس تک کھو بیٹھتا ہے۔

نوجوان اور خوبرو شہزادہ پنوں نے جب ہر ایک سے سسی کے حسن وخوبصورتی کے بارے میں یہ باتیں سنیں تو اس کے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی ایک بار سسی کو دیکھ لے۔ وہ خود گوکہ حسین وجوان تھا مگر سسی کے تذکرے سن سن کر وہ دیوانہ ہوا جارہا تھا۔ وہ جوں جوں اس کی تعریف سنتا، لوگ اس کے بارے میں باتیں بتاتے، تو اس کا جنون اور بھی بڑھ جاتا۔ ان حالات میں جب دل کی بے قراریاں بہت بڑھ گئیں اور سکھ چین جانے لگے، راتوں کی نیندیں حرام ہوگئیں اور ساری رات آنکھوں میں کٹنے لگی اور ساری ساری رات پنوں کی ستاروں کے ساتھ سرگوشیاں ہونے لگیں تو اُس نے بھی اپنے دل میں مصمم ارادہ کیا کہ نتائج خواہ کچھ بھی ہوں وہ ایک بار سسی کو ضرور دیکھے گا۔ اس نے اپنے دوستوں اور مصاحبوں کے ساتھ مشورہ کیا کہ وہ کوئی سبیل کریں کہ وہ سسی کا ایک بار دیدار کر کے اپنی ان بے چین آنکھوں کو سکون اور تڑپتے ہوئے دل کو آرام پہنچا سکے۔

مصاحبوں نے جب پنوں کی یہ بے قراری دیکھی تو انہوں نے اُسے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ:

''ایک قافلہ تیار کیا جائے جو مشک و عنبر لے کر بھنبھور جائے اور آپ ایک بیوپاری کی حیثیت سے اس قافلے میں شامل ہوجائیں۔''

پنوں کو اپنے مصاحبین اور دوستوں کی یہ تجویز پسند آئی کیونکہ اس طرح اسے یقین تھا کہ وہ سسی تک پہنچ سکے گا اور اس کے دیدار سے بھی مشرف ہوگا۔ چنانچہ اس نے اپنے باپ سے اجازت لی اور ایک کاروان تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس کاروان میں تجارت کے لیے مشک و عنبر اور دیگر خوشبویات کا سامان تھا اور شہزادہ پنوں ایک بیوپاری کی حیثیت سے اس میں شامل تھا۔ جب یہ کاروان بھنبھور پہنچا اور اس نے وہاں کر پڑاؤ کیا تو سارا شہر خوشبوؤں میں نہا گیا۔ ہر طرف خوشبو ہی خوشبو مہکنے لگی اور شہر بھر میں یہ خبر پھیل گئی کہ کیچ مکران سے ایک تاجر پنوں خوشبوؤں کی تجارت کرنے آیا ہے۔ پنوں کے کاروان اور اس میں موجود خوشبویات کا سن کر لوگ مشک و عنبر اور دیگر خوشبوؤں کی خریداری کے لیے اس طرف جانے لگے جہاں کاروان ٹھہرا تھا۔ ادھر یہ خبر جب سسی تک پہنچی تو وہ بھی اپنے سہیلیوں کو ساتھ لے کر پنوں کے

کاروان میں پہنچی۔

ہاشم شاہ کہتا ہے کہ جب سسی نے پنوں کی تصویر دیکھی اور اس پر فریفتہ ہوگئی تو شب روز اس کے انتظار میں رہتی تھی۔ اس نے یہ حکم دیا تھا کہ اگر کیچ کی طرف سے کوئی کاروان آئے تو اس کی اسے اطلاع ضرور دی جائے۔ اس دوران ایک برس بیت گیا اور کوئی مسافر کیچ کی جانب سے نہیں آیا اور پھر بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں اور سسی کو اطلاع ملی کہ کیچ کی جانب سے کچھ بہت ہی وجیہہ وخوبصورت تاجر سامان تجارت کے ساتھ آئے ہیں۔ ہاشم شاہ لکھتا ہے کہ:

برس ہویا جد پھیر سسی نوں محنت زُہد اٹھائے
کیچ ولوں رل وہاجن اوٹھ سوداگر آئے
صورت ناز نیاز بلوچاں ویکھ پری بھُل جائے
ہاشم ویکھ بلوچ زلیخا یوسف چا بھلائے
کہیا آن غلام، سسی نوں نال زبان پیاری
گھاٹ اُتے اک راہ مسافر اُترے آن بپاری
کیچ کنوں کر آکھن آئے اوٹھ بے انت شماری
ہاشم طور لباس بھرا واہر ہر چال نیاری

ترجمہ:

سسی کو اسی حالت عشق میں صبر و استقلال سے اپنی خواہش کرتے پورا ایک برس بیت گیا

ایک دن کیچ شہر کی طرف سے کچھ شتر سوار سوداگر اپنا مال فروخت کرنے (بھنبھور شہر) کو آئے

یہ بلوچ سردار اتنے حسین وجمیل اور نازک اندام تھے کہ کوئی پری بھی انہیں فقط اِک نگاہ دیکھنے سے اپنا راستہ بھول جاتی

ہاشم! اگر زلیخا بھی ان بلوچوں کو دیکھ لیتی تو حضرت یوسفؑ کو بھول جاتی

سسی کے ایک شیریں ذہن غلام نے اسے اطلاع دی

کہ گھاٹ پہ چند مسافر (جو کہ سوداگر ہیں) آ کر اترے ہیں
وہ کہتے ہیں کہ وہ کیچ کی طرف سے آئے ہیں اور ان کے پاس بے شمار اونٹ
اور مال ومتاع ہے
ہاشم! ان کے پہناوے اور طور طریقے بہت معقول اور منفرد ہیں اور ان کی
چال ڈھال بڑی نیاری ہے۔

(اعجاز (2007):72-73)

پنوں سسی ہی کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ مال تجارت اور خوشبوؤں کا سن کر وہ حسین وجمیل لڑکی کاروان کی طرف ضرور آئے گی اور جب سسی اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کاروان میں پہنچی تو پنوں جو بے تاب نگاہوں سے اس حسن کی دیوی کا منتظر تھا اور بے قراری کی سی کیفیت میں مبتلا تھا، سسی کے پہنچنے پر جب اس پر نظر پڑی تو پہلے ہی نظر میں وہ پوری طرح تیرِ عشق سے گھائل ہوا اور دل وجان سے اس پری جمال چاند چہرہ حسین وجمیل اور خوبصورت لڑکی پر عاشق ہوا اور اسے دل دے بیٹھا۔ پنوں نے سسی کے حسن وخوبصورتی کے بارے میں جو سنا تھا وہ ان بیانات سے کہیں زیادہ حسین وجمیل اور خوبصورت نکلی۔ شہزادہ پنوں بھی خوبصورتی اور خوبروئی میں کسی سے کم نہ تھا بلکہ وہ اپنے وقت کا حسین ترین نوجوان تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر دیکھتے ہی رہ گئے۔ پہلی نظر میں ہی دونوں تیرِ عشق سے گھائل ہو گئے اور دونوں کو ایک دوسرے سے پہلی ہی نظر میں عشق ہو گیا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے۔ عقیل ہاشمی لکھتا ہے کہ:

"پنوں جو مشک وعنبر کی تجارت کرنے آیا تھا دل کی تجارت کر بیٹھا اور سسی جو خوشبو خریدنے گئی تھی وہ اپنا آپ فروخت کر بیٹھی تھی وہ بھی بغیر کسی قیمت کے" (عقیل (1997):103)

کاروان والی جگہ سے سسی واپس اپنے گھر چلی آئی مگر وہ اپنا دل، دماغ اور سارا وجود وہیں چھوڑ آئی تھی۔ اسے ہر طرف پنوں کا چہرہ نظر آ رہا تھا وہ جہاں دیکھتی، اسے پنوں ہی پنوں کا وجود محسوس ہوتا، پنوں اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کی رگ رگ میں بس چکا تھا اور وہ تیرِ عشق سے بُری طرح گھائل ہو چکی تھی کہ کسی مرہم کسی وید وحکیم کی دواؤں سے اسے آرام نہیں

مل سکتا تھا، اب تو اس کا سارا آرام پنوں کی دیدار میں پنہاں ہو چکا تھا۔ گھر آ کر اس کی بے چینیوں میں مزید اضافہ ہوا اور وہ پریشان اور بکھری بکھری سی ہو گئی، نہ کھانا اچھا لگ رہا تھا نہ پینا۔ نہ بیٹھنے میں چین تھا نہ لیٹنے میں سکون تھا۔ وہ بے قرار و بے تاب تھی کہ آخر کرے بھی تو کیا کرے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اُڑ کر کاروان سرائے پہنچے اور اپنے پنوں کا دیدار کرے، اس سے باتیں کرے اور اس کے ساتھ اپنی ساری زندگی بتائے۔

تُم تو صرف دیدار کے لیے آئے تھے پنوں یہ کیا کر دیا تم نے:

''خود کو گھائل کر دیا اور مجھ کو پاگل کر دیا''

جب بے قراری حد سے بڑھی اور سُکھ چین بالکل جاتے رہے تو اُس نے اپنے انتہائی قریبی سہیلی کو اپنی ساری کیفیت بتا دی اور ساتھ ہی اس سے مشورہ مانگا کہ کوئی ایسی تجویز دو کہ پنوں ہمیشہ کے لیے میرا ہو جائے۔ سسی کی بات سن کر اس کی سہیلی پہلے تو دنگ رہ گئی پھر وہ گہری سوچ میں پڑ گئی۔ بالآخر اسے ایک تجویز سوجھی اور وہ سسی کو چھوڑ کر محمد دھوبی اور اس کی بیوی کے پاس گئی اور اُن سے سسی کی دلی کیفیت اور اس کا سارا حال بیان کر دیا اور یہ بھی کہا کہ سسی کو پنوں نامی سوداگر سے عشق ہو گیا ہے اور وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ شفیع عقیل اپنی کتاب پاکستان کی لوک داستانیں میں لکھتا ہے کہ:

> ''وہ پنوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گی۔ پھر یہ رشتہ بھی بُرا نہیں ہے۔ پنوں شہزادہ ہے، جوان ہے، خوبصورت ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ سسی کی پسند ہے۔' اس پر محمد دھوبی نے جواب دیا کہ: 'پنوں ایک تو پردیسی ہے، پھر اس کی ذات پات کا پتہ نہیں، پھر کیسے یہ رشتہ کر دیا جائے؟ ہم اپنی بیٹی کا رشتہ برادری سے باہر نہیں کر سکتے پھر کیسے یہ رشتہ کر دیا جائے؟' سہیلی نے اپنی بات بنتے دیکھی تو جلدی سے بولی کہ میں نے معلوم کر لیا ہے اگرچہ وہ مشک و عنبر کی تجارت کرتا ہے مگر وہ بھی ذات کا دھوبی ہے۔ آپ لوگ اسے آزما کے دیکھ سکتے ہیں۔'' (عقیل (1997):103-04)

اس پر محمد دھوبی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا کہ اگر یہ بات ہے اسے بلواؤ میں اسے آزما کے دیکھتا ہوں۔ اتنا سننا تھا کہ سسی کی سہیلی بھاگتی ہوئی سسی کے پاس چلی گئی اور اسے یہ

خوشخبری سنائی کہ میں نے تمہارے والدین سے بات کرلی ہے وہ اس شرط پر مان گئے ہیں کہ پنوں اگر ذات کا دھوبی ہے تو وہ اسے اپنی فرزندی میں لینے کو تیار ہیں۔ اس نے سسی کے ساتھ لپٹتے ہوئے کہا کہ تمہاری خوش قسمتی کا دروازہ کھلنے والا ہے تم نے پنوں مانگا تھا سو وہ تمہیں ملنے والا ہے۔ اس کے بعد سسی کی سہیلی پنوں کے پاس گئی اور اسے بھی سمجھایا بجھایا کہ سسی کو حاصل کرنے کا بس یہی ایک ہی راستہ ہے۔ اگر تم محمد دھوبی کو اس بات کا یقین دلاؤ کہ تم بھی ذات کے دھوبی ہو اور یہ مشک وعنبر کی تجارت تو وقتی گزارے اور شوق کے لیے کرتا ہوں تو یقیناً وہ تمہیں سسی سونپ دے گا۔ پنوں ہر قیمت پر سسی کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ لٰہذا جب وہ محمد دھوبی کے پاس پہنچا اور اسے کہا کہ وہ بھی ان ہی کی ذات برادری کا ہے یہ تجارت تو وقتی کام ہے وگرنہ وہ بھی دھوبی ذات ہے۔ تو محمد نے اسے کپڑے کا ایک بڑا گھٹا دے کر کہا کہ جاؤ یہ کپڑے دھو کر لاؤ۔ پنوں جو ناز ونعم میں پل بڑھ کر جوان ہوا تھا اور اپنے مملکت کا شہزادہ تھا۔ اس نے کبھی اپنا کوئی کام خود نہیں کیا تھا لیکن سسی کے عشق میں اُس نے کپڑے کا یہ بڑا گھٹا سر پر رکھا اور دھوبی گھاٹ کی جانب چل پڑا۔

بلوچ سماج میں ویسے بھی گھر کے سارے کام کاج خواتین کرتی ہیں جبکہ مرد گھر کے کام کرنے کو معیوب سمجھتے ہیں، پنوں تو پھر بھی شہزادہ تھا اس نے کبھی گلاس پانی کا خود نہیں پیا تھا بلکہ اس کے غلام اور لونڈیاں اس کی خدمت میں ہمہ وقت موجود رہتے تھے پھر بھلا کپڑے کا یہ گھٹا کیسے دھو سکتا تھا۔

"ہائے عشق تیرا بُرا ہو تو کیا کیا کام کرواتا ہے"

شہزادہ پنوں نے کپڑے پانی میں بھگوئے اور انہیں دھونے لگا، کوئی تجربہ ہوتا یا کبھی ایسا کام کیا ہوتا یا کرتے ہوئے دیکھا ہوتا تو بھی شاید کچھ نہ کچھ کر لیتا مگر وہ تو ان کاموں سے بالکل ہی نابلد تھا۔ لٰہذا اس اناڑی پن کی وجہ سے اس کے ہاتھ زخمی ہوگئے، وہ بُری طرح مجروح ہوا، کپڑے بھی اکثر پھٹ گئے مگر پھر بھی صاف نہیں ہوئے۔ اس صورتحال پر وہ گھبرا گیا اور سسی کو بتا دیا۔ سسی بھی پریشان ہوئی کہ اب وہ اپنے والد کو کیا جواب دے گی۔ پھر اسے ایک ترکیب سوجھی اُس نے پنوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہ جن لوگوں کے کپڑے پھٹ گئے ہیں ان کے کپڑوں میں سونے کا ایک ایک سکہ رکھ دے اس طرح وہ شکایت سے باز رہیں

گے۔ پنوں کو یہ تجویز پسند آئی اور اس نے سونے کے سکے کپڑوں میں رکھ کر گاہکوں کو واپس کر دیے۔ وہ بھی پھٹے ہوئے کپڑوں میں سونے کے سکے دیکھ کر خاموش ہو گئے بلکہ اس بات پر خوش ہو گئے کہ کپڑوں کی اصل قیمت سے کئی گنا زیادہ قیمت مل گئی ہے۔ لہٰذا انہوں نے محمد دھوبی سے کوئی شکایت نہیں کی بلکہ اسے مزید کپڑے دھونے کے لیے دیے جس کی وجہ سے اس کے کاروبار میں مزید تیزی آ گئی۔ اس بات سے محمد دھوبی کو بڑی خوشی ہوئی اور اسے اس بات کا بھی یقین ہوا کہ پنوں واقعی دھوبی ذات سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا اس نے سسی کی شادی پنوں کے ساتھ کرنے کی حامی بھر لی۔

مگر شادی سے پہلے دو رکاوٹیں سامنے آ گئیں جن کی وجہ سے سسی اور پنوں کو نئی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک تو بہت بڑی پریشانی اس وقت لاحق ہوئی جب جام آدم کو جو ملک کا حکمران تھا کسی نے سسی کی خوبصورتی اور لاجواب حسن کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ لگتی نہیں کہ کسی دھوبی کی بیٹی ہے بلکہ وہ ایک شہزادی لگتی ہے اس کا حسن و جمال اتنا مکمل ہے کہ کہ سورج کی چمک اور پریوں کا جمال بھی اس کے سامنے ماند پڑ جائے۔ جام آدم نے جب سسی کے حسن کی اتنی تعریف سنی تو فوراً محمد دھوبی کو پیغام بھیجا کہ سسی کو ان کے محل میں بھیج دیا جائے تاکہ وہ اسے اپنی ملکہ بنالیں۔ اس پر محمد دھوبی، سسی اور پنوں بہت پریشان ہوئے۔ ہاشم شاہ کے بیان کے مطابق محمد دھوبی نے وہ صندوق جس میں سسی بہتی ہوئی دریا میں جارہی تھی محمد دھوبی نے اسے بچالیا تھا، جام آدم کے پاس بھیج دیا یا کوئی تعویز جو سسی کے گلے میں بچپن میں بندھا ہوا تھا اور محمد دھوبی نے اسے محفوظ رکھا تھا جام آدم کے پاس لے گیا اور کہا کہ ”سسی دراصل اس کی بیٹی نہیں ہے بلکہ وہ اس صندوق میں بہتی ہوئی دریا میں آرہی تھی کہ اس نے اسے بچالیا اور یہ تعویز اس کے گلے میں بندھا ہوا ملا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس نے سسی کی اپنی اولاد کی طرح پرورش کی، اسے زندگی کی تمام سہولتیں فراہم کیں اور اس کا ہر طرح خیال کیا۔ اب جو بادشاہ کا حکم ہوگا میں وہی کروں گا۔ یہ سن کر جام آدم سر سے پاؤں تک کانپ گیا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ تھوڑی دیر توقف کرنے کے بعد اس نے کانپتے ہوئے اور شرمندہ لہجے میں دھوبی سے کہا کہ سسی دراصل ان کی بیٹی ہے جس کو انہوں نے خود دریا میں بہادیا تھا کیونکہ ہمیں جوتشیوں نے بتایا تھا کہ یہ لڑکی جوان ہو کر ہماری بدنامی کا باعث

بنے گی۔ مگر ہائے افسوس کہ ہم نے جوتشیوں کی باتوں پر عمل کیا اور اللہ پر توکل نہیں کیا کہ جس نے ہمارے گھر میں چاند کی چاندنی کو بھیجا تھا اور ہمارے بے کیف زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا تھا۔ ہائے افسوس ہم نے کفرانِ نعمت کی اللہ نے ہم سے اپنی رحمتیں چھین لیں۔ جب سے بیٹی کو دریا میں بہایا ہے تب سے میں اور میری بیوی یعنی ملکہ عالیہ ایک لمحے کے لیے بھی سکون سے نہیں رہے، نہ سوئے نہ آرام آیا۔ تب سے اب تک ہم اپنی معصوم بیٹی کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ کاش میں نے اپنے مشیروں کے مشورے پر یا جوتشیوں کے کہنے پر عمل نہ کیا ہوتا اور اپنی بیٹی کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتا۔ کاش میں نے اس کو دریا بُرد نہ کیا ہوتا اور آج وہ میری آنکھوں کے سامنے اپنے حسن و بالاد کے ساتھ گھوم پھر رہی ہوتی اور میں کسی شہزادے کے ساتھ دھوم دھام کے ساتھ اس کی شادی کرتا اور اپنی ساری سلطنت اسے سونپ دیتا۔

ملکہ عالیہ یعنی سسی کی والدہ روتی اور سسکتی ہوئی بولی: کہ اے بھائی آپ نے میری سسی کی جان بچائی، یقیناً یہ آپ کا ہم پر احسانِ عظیم ہے، پھر اس کی پرورش اپنی اولاد کی طرح کی اور اسے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کیں یقیناً ہم آپ کا احسان کبھی بھی نہیں چکھا سکیں گے اور ہمیشہ یہ احسان ہم پر رہے گا۔ بس ایک بار۔۔۔۔ ہاں بس ایک بار ہمیں ہماری بیٹی دکھا دو کہ ان آنکھوں کو سکون اور اس بے چین دل کو قرار آئے اور ایک دکھیاری ماں کے کلیجے کو ٹھنڈک ملے۔ بس ایک بار میری بیٹی سے مجھے ملا دو کہ میں اسے جی بھر کے دیکھوں اور اپنے ان ویران آنکھوں کی ویرانی دور کروں کہ یہ چشم یعقوب بن چکے ہیں اور ان میں کوئی بینائی نہیں رہی ہے جب سسی کا دیدار کروں گی تو ان کی بینائی یقیناً لوٹ آئے گی۔ اے بھائی آپ کو رب کا واسطہ بس ایک بار میری بیٹی کو مجھ سے ملا دو آپ کو خدا کا واسطہ کہ میں بہت دکھیاری ماں ہوں۔ گو کہ ایک سلطنت کی ملکہ ہوں مگر میں دنیا کی بدنصیب ترین عورت ہوں کہ جس نے اپنے کلیجے کو خود چبا ڈالا۔ اے بھائی بس ایک بار۔۔۔ ملکہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا جاری تھے، جام آدم بھی رو رہا تھا اور محمد دھوبی سکتے کے عالم میں یہ سب کچھ سن رہا تھا۔

محمد دھوبی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو بچی دریا سے اس کے ہاتھ لگی وہ ان کے حکمران کی بیٹی ہے اور بادشاہ نے خود اپنی بیٹی کو دریا کے بے رحم لہروں کے سپرد کر دیا تھا۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا اور اس نے سسی کی جان محمد دھوبی کے ہاتھوں بچائی۔ اور اب قسمت دیکھو کہ

جب سسی کے ہاتھ اعزاز کے ساتھ پیلے ہونے والے تھے اور وہ عزت واحترام کے ساتھ نکاح کر کے اپنے جیون ساتھی کے ساتھ رخصت ہونے والی تھی تو اچانک قدرت اس کے اصل ماں باپ کو منظر عام پر لے آئی اور سسی و پنوں کے لیے ایک نیا امتحان شروع ہوا۔ محمد دھوبی کافی دیر تک خاموشی اور سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا رہا۔ محل کے اس کمرے میں بادشاہ اور ملکہ کی سسکیوں اور بلکنے کی آوازیں ماحول کو عجیب گھمبیر اور افسردہ بنا رہی تھیں جبکہ محمد دھوبی کی خاموشی سے اس اداسی میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ بالآخر کافی دیر توقف کے بعد اس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے بھرائی ہوئی اور کانپتے ہوئے لہجے میں کہا کہ حضور مجھے تو اس کا کوئی علم نہیں تھا میں تو اسے خدا کا تحفہ سمجھ کر گھر لے گیا اور اسے اپنی بیٹی بنایا کیونکہ میں اور میری بیوی بھی بے اولاد تھے اور روز اپنے خدا سے اولاد کے لیے دعا کرتے تھے۔ جب یہ صندوق بہتا ہوا میرے ہاتھ لگا اور اس میں سے وہ بچی مجھے ملی تو میں نے اسے اپنی عاجزانہ دعاؤں اور اپنی بیوی کی فریادوں اور خدا سے اولاد کی طلب کا نتیجہ سمجھا۔ آج آپ فرما رہے ہیں کہ وہ آپ کی بیٹی ہے تو یقیناً وہ آپ ہی کی بیٹی ہوگی کیونکہ اس کی حسن اور خوبصورتی اور اس کے عادات و خصائل کسی شہزادی کی طرح ہیں۔ میں جا کر اس سے بات کرتا ہوں کہ اس کی اس بارے میں کیا رائے ہے اور وہ آپ لوگوں سے کیسے مل سکتی ہے اور کب؟ میں ابھی جا کر اپنی بیٹی سے بات کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ کورنش بجالایا اور الٹے قدموں محل کے اس کمرے سے نکلا اور اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ وہ سخت پریشان تھا اور اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں سسی کو کیسے بتائے کہ وہ ان کی بیٹی نہیں بلکہ جام آدم کی بیٹی ہے۔ وہ خود بھی یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ جس بچی کی اس نے دل و جان سے پرورش کی اور اپنی اولاد ہی کی طرح اسے رکھا آج اس پر کسی اور نے وارث ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے۔ اور دعویٰ کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ حاکم وقت ہے کہ جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی بھی جرأت نہیں۔ پھر بھلا محمد دھوبی کی کیا حیثیت تھی کہ وہ بادشاہ کے حکم سے انکار کرتا۔ وہ مختلف پریشان کن خیالات میں غلطاں و پیچاں لڑکھڑاتے اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنے گھر کی جانب رواں تھا۔

جب وہ گھر پہنچا تو اس کی بیوی اس کے چہرے کے تغیرات سے اس کی پریشانی بھانپ گئی اور اسے گلاس پانی پیش کرتے ہوئے انتہائی ملائمت اور محبت سے پوچھا کہ کیا بات

ہے آپ بہت پریشان لگ رہے؟ کیا جام آدم نے کوئی بات کی ہے یا کوئی نیا حکم نامہ جاری کیا ہے؟ آپ تو اس سے ملنے گئے تھے ناں؟

محمد دھوبی نے پانی کا گلاس اپنی بیوی کے ہاتھ سے لے کر اور چند گھونٹ پی کر تھوڑا توقف کیا اور پھر ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور اسے محل سرا کے اس کمرے میں بادشاہ، ملکہ اور اس کے مابین ہونے والی ساری گفتگو اور روداد سنادی۔ اس کی بیوی یہ سن کر تھوڑی دیر کے لیے سکتے میں آگئی اور پھر چیخ مار کر بولی: نہیں نہیں سسی میری بیٹی ہے کسی جام آدم کی بیٹی نہیں ہے اور نہ ہی جام آدم کا دعویٰ سچ ہے۔ وہ میری بیٹی کی خوبصورتی کا سن کر اسے مجھ سے چھیننا چاہتے ہیں۔ محمد دھوبی کی بیوی نجانے کیا کیا کچھ کہنے لگی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ محمد دھوبی نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا کہ حاکم کے سامنے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ دوسری بات یہ کہ سسی ہمیں دریا میں بہتی ہوئی ملی تھی اور جام آدم اور اس کی بیوی کا بھی یہی کہنا ہے کہ انہوں نے جوتشیوں کے کہنے پر بدنامی کے ڈر سے اسے دریا بُرد کر دیا تھا۔ وہ حاکم ہے اور میں اس کے دعویٰ کے سامنے بے بس تھا۔ میں نے اسے کہا ہے کہ میں سسی سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں۔ اے میری پیاری اور وفا شعار بیوی ہم سسی سے بات کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ ہمیں سسی سے اس بات کو نہیں چھپانا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح ہم نے اس کی پرورش کی ہے وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں جائے گی۔ محمد اور اس کی بیوی وہاں سے اٹھ کر سسی کے کمرے کی جانب گئے۔

جب وہ سسی کے کمرے میں پہنچے تو سسی اپنے ماں باپ کو ایک ساتھ مگر انتہائی پریشان اور بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دیکھا تو اس کا کلیجہ منہ کو آیا اور وہ سخت گھبرا گئی اور اسی گھبراہٹ میں اس نے پوچھا: امی جان، بابا جان خیر تو ہے آپ لوگ بہت پریشان نظر آرہے ہو اور آپ لوگوں کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ ہوگئی ہیں اور اب بھی ان میں آنسو تیر رہے ہیں۔ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں اے میرے مہربان والدین کہ یہ سب میرے لیے دیکھنا ناقابلِ برداشت ہے۔ مجھے بتاؤ کہ کیا ماجرا ہے؟ اور آپ لوگوں کی ایسی حالت کیوں ہورہی ہے؟

محمد دھوبی اور اس کی بیوی خاموش رہے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہوا اور آہستہ آہستہ ان کی سسکاریاں بلند ہونے لگیں۔ سسی تڑپ اٹھی اور خود بھی رونے لگی اور بلند آواز میں روتے ہوئے پوچھا اے میرے شفیق و ہمدرد ماں باپ! اگر آپ مجھے کچھ نہیں بتائیں گے کہ کیا بات ہوئی ہے اور یوں ہی روتے جائیں گے تو میں مر جاؤں گی۔ خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ کیا ماجرا ہے؟ میرے صبر و قرار کا مزید امتحان نہ لو۔ اے میری مہربان ماں اے میرے شفیق بابا جان! آپ لوگوں کو خدا کا واسطہ مجھے بتاؤ کہ میرا دل ڈوبا جا رہا ہے اور مزید برداشت مجھ سے ممکن نہیں۔ خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ کیا بات ہے جس کی وجہ سے آپ لوگ رو رہے ہو۔ کیا مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہے؟ کیا میرے پنوں نے کوئی بات کی ہے؟ جبکہ وہ ایسا نہیں ہے اور نہ میں نے کوئی ایسی حرکت کی ہے کہ جس کی وجہ سے آپ لوگوں کو کسی کے سامنے شرمسار ہونا پڑے۔ اے میری عظیم ماں اے میرے اچھے بابا جان! مجھے جلدی بتاؤ کہ میں غم سے نڈھال ہو رہی ہوں مجھ سے آپ لوگوں کی یہ حالت مزید دیکھی نہیں جا سکتی۔ سسی کی حالت کو بگڑتے دیکھ کر اس کی ماں آگے بڑھی اور اسے تھام کر بستر پر بٹھایا اور خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ محمد دھوبی ان کے سامنے کمرے میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا اور اپنی بیٹی کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ اس کے سامنے وہ سارا منظر گھومنے لگا جب اس نے سسی کو بہتے پانی سے نکالا تھا اور اپنے گھر لا کر وہ اللہ کے حضور اس کی داد پر سر بسجود ہوا تھا۔ پھر وہ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آیا جب اس کی دولت بڑھنے لگی اور اس کا کاروبار خوب پھیلنے لگا۔ اس نے سسی کے لیے زمین خریدی، اس میں محل تعمیر کروایا اور ایک خوبصورت باغ لگایا۔ اس میں طرح طرح کے درخت اور پھولوں کے پودے لگائے اور اس کی خوبصورتی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پھر اس نے سسی کی جوانی کا منظر اپنی آنکھوں میں گھومتے دیکھا اور اسے باغ میں چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھتا رہا، اور آخر میں جام آدم اور اسی کی بیوی کی آہ وزاری اور فریادیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے سسی کی جانب دیکھا اور لرزتی و کانپتی ہوئی آواز میں اسے جام آدم کے دعویٰ اور اس کے حکم کے بارے میں الف سے ے تک سب کچھ بتا دیا۔

یہ باتیں سن کر سسی پر بھی کچھ دیر کے لیے سکتہ طاری ہوا اور وہ صمن بکمن بت بنی

بیٹھی رہی اور حیرت واستجاب بھری نظروں سے محمد دھوبی کی جانب دیکھنے لگی۔ کافی دیر تک اس کی یہ کیفیت رہی اور تینوں خاموشی کے ساتھ بغیر کوئی مزید بات کیے سسکتے اور بلکتے رہے۔ ماحول پر عجیب سے بے کیف مردنی اور اداسی سی چھا گئی تھی اور وہ گھر جس میں دو محبت کرنے والوں کے بیاہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں اب ماتم کدہ اور غم واندوہ کا گڑھ بنتا جا رہا تھا۔ تینوں ہی اداس اداس اور آنسو بہاتے آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور رو رہے تھے۔ اچانک سسی اپنے بستر سی اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا بھیگا ہوا چہرہ اپنے دوپٹے کے پلّو سے صاف کرتے ہوئے ایک دم سے سنجیدہ ہوگئی اور اپنے باپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے عزم اور وقار کے ساتھ یوں گویا ہوئی:

لہو گرم ہویا دل بریاں پھر اولاد پیاری
ماں پیو نال سسی دے چاہن بات کیتی اِک واری
سسی صاف دِتونے کھولھ حقیقت ساری
ہاشم ملن حرام تُسانوں روڑھ دتی اِک واری

ترجمہ:

جوشِ محبت میں ان کا خون بیقرار ہوا کیونکہ ہر ماں باپ کو اولاد پیاری ہوتی ہے۔
سسی کے ماں باپ چاہتے تھے کہ ایک بار کسی طرح اس سے بات کرلیں
مگر سسی نے ساری حقیقت کھولتے ہوئے صاف انکار کردیا
ہاشم! تم لوگوں سے ملاقات مجھ پر حرام ہے کہ آپ نے مجھے دریا میں بہا دیا تھا۔

(اعجاز (2007):63-62)

سسی نے اپنے والدین کو تسلی دی کہ آپ مطمئن رہیں میں کسی جام آدم کو نہیں جانتی اور نہ کسی جام کی بیٹی ہوں۔ میں محمد دھوبی کی بیٹی ہوں اور وہی میرا شفیق و مہربان باپ ہے۔ میں اس شخص کو کیسے باپ تسلیم کروں کہ جس نے مجھے براہِ راست موت کے منہ میں دے دیا تھا۔ میں اس جام آدم کی بیٹی کیسے ہوسکتی ہوں کہ جس کو خدا نے تاجداری دی، ملک و میراث دیا، حاکمیت دی، غلام، نوکر چاکر اور فوجیں عطا کیں، مال و دولت اور خزانے عطا کیے مگر وہ پھر بھی خدا کے وجود پر توکل کرنے کی بجائے جوتشی کی باتوں پر یقین کر بیٹھا اور اپنی اولاد اور جگر گوشے کو دریا

میں بہا دیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ براہِ راست موت کے منہ میں جا رہی ہے مگر کیا اُس لمحے جام آدم کو ذرا بھر بھی میری معصومیت اور بیگناہی پر ترس آیا؟ اور آج جب میں جوان ہوں، خوبصورت ہوں اور میرے ماں باپ نے زندگی کی ہر سہولت اور آسائش مہیا کی ہیں تو آج جام آدم کو اس کی بیٹی کی یاد آ گئی۔ وہ تو میرا رشتہ طلب کر رہا تھا یہ تو اچانک قدرت نے اسے آئینہ دکھایا کہ اے جام تو جس کا رشتہ طلب کر رہا ہے اور اسے اپنی ملکہ بنانا چاہتا ہے وہ دراصل تمہاری اپنی بیٹی ہے وہ بیٹی جسے تم نے کفرانِ نعمت کرتے ہوئے دریا کے منہ زور لہروں کے سپرد کر دیا تھا۔ اے میری پیاری ماں اور اے میرے شفیق باپ! آپ لوگ آزردہ خاطر نہ ہوں میں کبھی بھی آپ لوگوں کو چھوڑ کر جام آدم کے پاس نہیں جاؤں گی، میرا یہ گھر جس میں آپ لوگوں کے ساتھ میں رہتی ہوں میرے لیے جام آدم کا محل تو کیا جنت کے کسی محل سے بھی زیادہ پُرسکون اور آرام دہ ہے کیونکہ یہاں میرے محبت کرنے والے شفیق و مہربان ماں باپ میرے پاس ہیں اور اُن کا سایہ عاطفت ہمیشہ میرے سر پر ہے جس کی وجہ سے میں ہر مصیبت اور آفت سے محفوظ ہوں اور راتوں کو پُرسکون سوتی ہوں۔ اے میرے عظیم ماں باپ! آپ مطمئن اور پُرسکون رہیں میں ہمیشہ آپ لوگوں کے ساتھ رہوں گی اور کبھی آپ لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی کسی بھی جام آدم میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ مجھے یہاں سے لے کر جائے۔

اس کے بعد سسی نے جام آدم کو صاف صاف جواب بھیج دیا اور اسے خدا کا خوف دلاتے ہوئے کہا کہ اُس وقت تمہیں سوچنا چاہیے تھا کہ جب ایک نومولود کو تم نے اپنے ہاتھوں سے دریا کی تند و تیز لہروں کے سپرد کر دیا تھا اور یہ سوچ کر کہ اللہ کی امانت ہے سو اسی کے حوالے کیا۔ اب پھر میری یاد کیوں آ رہی ہے جب مجھے دریا بُرد کرتے وقت تمہیں خدا کا کوئی خوف نہیں رہا۔ اور اس پر توکل کرنے کی بجائے ان ہندو جوتشیوں کی لغو اور فرسودہ باتوں پر یقین کیا۔ میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں اور نہ ہی میرا آپ کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ میں محمد دھوبی کی بیٹی ہوں اور وہی میرا باپ ہے۔ آپ آئندہ کے لیے ہمیں تنگ نہ کریں مجھے آپ کو یا ملکہ عالیہ کو دیکھنے کا اور آپ لوگوں سے ملنے کا کوئی اشتیاق نہیں ہے۔ آئندہ مجھ سے کسی قسم کا کوئی تعلق یا رشتہ مت جوڑنا کہ وہ رشتے آپ خود توڑ چکے ہو۔ مجھے اللہ نے اس دنیا میں جس کے لیے بھیجا تھا اسی کے پاس پہنچا بھی دیا۔ اسی ذات اقدس نے دریا کی طوفانی اور تند و تیز لہروں سے میری حفاظت کی

اور محمد دھوبی کو اسی نے فرشتہ رحمت بنا کر بھیجا۔ اب وہی میرا باپ اور سرپرست ہے میں کسی جام آدم کی بیٹی نہیں ہوں۔

جام آدم بیٹی کا یہ جواب سن کر بہت مایوس ہوا۔ اس نے اور اس کی ملکہ نے ہر طرح کوشش کر کے دیکھ لی مگر سسی نے کسی بھی صورت ان کے پاس جانے اور ان سے ملنے سے انکار کیا اور ان سے کوئی بھی رشتہ جوڑنے پر راضی نہیں ہوئی۔ اس طرح جام آدم کو اپنے کیے کی سزا مل گئی اور اس کی زندگی مثلِ جہنم بن گئی۔ وہ اور ملکہ عالیہ رحم دل و مہربان ہونے کے باوجود اپنی بیٹی کی فراق میں دن رات آنسو بہاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔

سسی کی بہادری اور وفاداری سے پہلی مصیبت توٹل گئی مگر سسی اور پنوں دونوں کی شادی کی تاریخ طے ہونے سے کچھ دن قبل ایک اور مصیبت سامنے آئی جس نے نہ صرف پنوں کو پریشان کیا بلکہ اہل علاقہ اور سسی کے والدین بھی اس مسئلے کی وجہ سے پریشان ہوئے۔ دراصل ایک سنارن نے کاروان میں پنوں کو دیکھ لیا تھا اور اس کو دل دے بیٹھی تھی۔ پنوں کو اس کی کوئی خبر نہیں تھی جبکہ سنارن دل ہی دل اور من ہی من میں پنوں کو اپنا خیال کرنے لگی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ پنوں اور سسی کے مابین معاشقہ چل رہا ہے اور دونوں کی عنقریب شادی ہونے والی ہے تو وہ حسد کی آگ میں جل بھن گئی اور تہیہ کر لیا کہ وہ کسی بھی طور دونوں کی شادی نہیں ہونے دے گی بلکہ وہ خود پنوں سے شادی کرے گی۔ لہٰذا اس کم بخت عورت نے سسی پر بدچلنی کا الزام لگایا اور یہ مشہور کر دیا کہ یہ ایک بدکردار اور بدچلن لڑکی ہے۔ اس نے پنوں کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس لڑکی کا چال چلن خراب ہے اور وہ آپ کے کسی طور قابل نہیں ہے۔

اس بے ہودہ اور من گھڑت الزام نے سب کو سخت پریشانی میں .تلا کیا ماسوائے سسی کے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ بے گناہ ہے اور آج تک ایسا کوئی بھی گناہ نہیں کیا جس کی وجہ سے اس کا یا اس کے والدین کا سر شرم سے جھک جائے۔ مگر اس الزام کو غلط ثابت کرنا بھی ضروری تھا ورنہ علاقے کے لوگوں کا مطمئن ہونا یا بغیر کسی ثبوت کے سسی کی بے گناہی پر یقین کرنا ناممکن تھا۔

"اس زمانے میں یہ رسم تھی کہ جب کسی پر بُرے کردار کا الزام لگایا جاتا تھا تو

اسے اپنے آپ کو بیگناہ ثابت کرنے کے لیے آگ میں سے گزرنا پڑتا تھا۔
سسی سے بھی یہی مطالبہ کیا گیا کہ وہ آگ میں سے گزرے تا کہ اس بات کا
پتہ چل جائے کہ اس کا کردار اچھا ہے یا یہ الزام صحیح ہے۔ سسی جانتی تھی کہ
اس پر یہ الزام محض حسد کی بناء پر لگایا گیا ہے اور اس کا دامن صاف ہے اس
لیے وہ فوراً تیار ہوگئی۔ جب وہ دہکتی ہوئی آگ میں سے صحیح سلامت گزر گئی
اور اسے کوئی نقصان نہ پہنچا تو سب کو اس کی پاک دامنی کا یقین آ گیا"۔
(عقیل (1997):105)

محمد دھوبی نے اسی وقت دونوں کی شادی کی تیاریاں شروع کیں۔ سسی اس کی اکیلی بیٹی تھی اور وہ اس کی شادی پر اپنے سارے ارمان پورے کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح دونوں عاشقوں کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور محمد دھوبی نے بھی اپنی اکلوتی اولاد کی خوشیوں کے لیے دل کھول کر دولت لٹائی اور بڑی ضیافتوں کا انتظام کیا، دھوم دھام کیا اور جشن منایا اور اس طرح دو خوبصورت ترین انسانوں کو تزک و احتشام کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک کر کے رخصت کیا۔ پنوں شادی کر کے سسی کے محل میں آ گیا اور دونوں نے وہیں پر قیام کیا۔

شادی کے کچھ دن بعد جب پنوں کے ساتھیوں نے اسے کیچ واپس چلنے کا کہا تو اس نے صاف انکار کرتے ہوئے انہیں کہا کہ وہ اب بھنبھور میں ہی قیام کرے گا۔ انہوں نے اسے بہت سمجھایا مگر پنوں کسی طور راضی نہ ہوا اور اس نے بھنبھور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ قافلے میں پنوں کا بھائی چڑو بھی شامل تھا۔ اس نے بھی اپنے بھائی کو بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی مگر پنوں نہ مانا اور انہیں صاف صاف کہہ دیا کہ اب اس کا سب کچھ بھنبھور ہے۔ قافلے والے کچھ دن اس کے مزید انتظار میں رُکے رہے کہ شاید پنوں کا دل بھنبھور سے بھر جائے اور وہ اپنی دلہن کو ساتھ لے کر جانے پر راضی ہو جائے مگر پنوں پر ان کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا لاچار وہ واپس اپنے وطن کو چل دیے اور پنوں کو اس کی محبوبہ کے پاس بھنبھور میں ہی چھوڑ دیا۔ جہاں وہ ہنسی خوشی رہنے لگے تھے۔ ان کا ہر دن عید کا دن اور ہر رات شب برات کی رات تھی۔ ان کی زندگی خوشیوں اور مسرتوں کا گہوارہ بن چکی تھی اور وہ بہت ہی خوش وخرم دن گزارنے لگے تھے۔

قافلے والے واپس کیچ پہنچے اور میر چزو خان ہوت نے اپنے والد اور حاکم مکران میر عالی خان ہوت کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ پنوں نے وہاں سسی سے شادی کر لی ہے اور وہیں رہ گیا ہے، ہم نے اسے بہت سمجھایا مگر اس نے ہماری کوئی بات نہیں مانی۔ باپ نے یہ سنا تو بہت پریشان ہوا۔ پنوں اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اور والد کو اس سے بے حد محبت تھی۔ اس کی جدائی میر عالی کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس نے اسی وقت ایک قاصد بھنبھور کی طرف روانہ کیا اور پنوں کو پیغام بھیجا کہ فوراً واپس وطن آجائے۔ قاصد جب یہ پیغام لے کر بھنبھور پہنچا تو اس نے دیکھا کہ پنوں وہاں ایک گھاٹ پر دوسرے دھوبیوں کے ساتھ کپڑے دھو رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور قریب جا کر کہا:

"حضور یہ کام آپ کی شان کے خلاف ہے۔ آپ شہزادہ ہیں، واپس چل کر وطن میں سرداری کریں۔" (عقیل (1997):106)

اس نے باپ کا پیغام بھی پہنچایا لیکن پنوں نے واپس جانے سے صاف صاف انکار کرتے ہوئے قاصد سے کہا کہ:

"تم واپس جا کر میرے باپ اور بھائیوں سے کہہ دینا، وہ مجھے بھول جائیں اور میرے واپس آنے کی کوئی امید نہ رکھیں۔ میرا وطن وہی ہے جہاں میری سسی رہتی ہے۔" (اعجاز (2007):107)

قاصد نے پنوں کو بہت سمجھایا اور اسے اس کے والد کی حالت اور اہل وطن کے جذبات کے بارے میں آگاہ کیا، اس نے اپنی طرف سے تمام جتن آزمائے مگر پنوں نے پھر بھی جانے سے صاف صاف انکار کرتے ہوئے قاصد کو مایوس ومحروم واپس کیچ روانہ کر دیا۔ قاصد دن رات سفر کرتا ہوا کیچ پہنچا اور میر عالی کو ساری صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ پنوں سسی کے عشق میں اس حد تک ڈوب چکا ہے کہ اب اس نے سسی کے باپ کے ساتھ مل کر اس کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ اب وہ بھی دریا کے گھاٹ پر دھبیوں کے ساتھ مل کر کپڑے دھوتا ہے۔ اس نے آپ اور اپنے بھائیوں کے لیے یہ پیغام دیا ہے کہ وہ اسے بھول جائیں اب اس کی دنیا وہی ہے جہاں سسی رہتی ہے۔

میر عالی خان قاصد کا یہ بیان سن کر سخت پریشان ہوا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں

سے لبریز ہوگئیں۔ اس کا سکھ چین غارت ہوا اور بھوک پیاس مٹ گئی۔ اسے کسی بھی لمحے چین نہیں مل رہا تھا اور نہ ہی اسے کچھ سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ کرے بھی تو کیا کرے؟

بالآخر اس نے پنوں کے بھائیوں کو کہا کہ وہ تیز رفتار سانڈنی اونٹوں کا بندوبست کریں اور جا کر پنوں کو کسی بھی حالت میں اٹھا کر کیچ لے آئیں کہ میں اس کی فراق میں زندہ نہیں رہوں گا۔ میر عالی دن رات بیٹے کی فراق میں آنسو بہاتا اور اس کے غم میں بیمار ہوا جا رہا تھا۔ پنوں کے بھائیوں ہوتی، نوتی اور چزو نے جب اپنے والد کی یہ حالت دیکھی تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہمیں اپنے والد محترم کے لیے کچھ کرنا چاہیے اب تو اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ پھر انہوں نے آپس میں طے کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو ہمیں ہر صورت میں پنوں کو واپس لانا چاہیے۔

اگلے دن انہوں نے انتہائی تیز رفتار اونٹ تیار کیے اور تینوں بھائی اس پر سوار ہو کر بھنبھور کی طرف چل دیے۔ جب بھنبھور پہنچے تو پنوں اور سسی نے ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ پنوں نے اپنے بھائیوں کو کہا کہ یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ آپ لوگ میرے پاس آئے ہیں۔ جبکہ سسی نے انتہائی خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے آپ لوگوں کی خاطر مدارت اور تواضع کرتے ہوئے بیحد خوشی ہوگی۔ اس طرح پنوں اور اس کی بیوی نے مل کر پنوں کے بھائیوں کی خوب خاطر مدارت کی اور ان کی آمد کی خوشی میں جشن کا اہتمام کیا۔ طرح طرح کے پکوان بنائے گئے۔ ہر دن ان کے لیے نئے نئے کھانے بننے اور محفلیں سجنے لگیں۔ اس طرح وہ پنوں اور سسی کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے رہے لیکن وہ اپنے بھنبھور آنے کے مقصد سے غافل نہ تھے اور انہیں جب بھی تنہائی میں پنوں سے بات کرنے کا کوئی موقع ملتا وہ اسے سمجھاتے اور والد کی خراب حالت کے بارے میں اسے آگاہ کرتے۔ وہ اسے بتاتے کہ کہ اُن کا باپ کیسے پنوں کی جدائی کے غم میں سوکھ کر کانٹا ہوا جا رہا ہے، ہر وقت اسے یاد کرتا ہے اور روتا رہتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ دیکھو پنوں! اگر تم نہیں گئے اور والد سے نہ ملے تو ان کا زندہ رہنا مشکل ہے وہ زندہ نہیں رہ پائیں گے۔

مگر بھائیوں کی یہ ساری کوششیں اور پندونصائح بیکار گئے اور پنوں پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ کسی بھی طرح اپنی اس خوبصورت اور حسین دنیا کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔

اس نے اپنے بھائیوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس کی امید چھوڑ دیں، اور باپ سے بھی کہہ دیں وہ مجھے بھول جائے۔ تینوں بھائی اس کا دوٹوک جواب سن کر خاموش ہو گئے اور کوئی ایسی تجویز سوچنے لگے جس پر عمل کر کے اسے واپس اپنے وطن لے جایا جا سکے اور اپنے والد سے ملا سکیں۔

پنوں کے بھائی بھی یہ تہیہ کر چکے تھے کہ وہ بھی خالی ہاتھ واپس نہیں جائیں گے اور پنوں کو ساتھ لے جا کر والد کو پیش کریں گے۔ لہٰذا وہ موقع کی تاڑ میں رہے۔ ایک رات اسی طرح محفل جمی ہوئی تھی اور چاروں بھائی خوب مئے نوشی کر رہے تھے۔ پنوں کے بھائیوں کے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ وہ احتیاط کے ساتھ اور کم مقدار میں پی رہے تھے جبکہ انہوں نے پنوں کو خوب پلایا اور اس حد تک اسے پلایا کہ وہ اپنے ہوش کھو بیٹھا اور بے ہوش ہو گیا۔ دوسری طرف سسی بھی پنوں کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ اس پر بھی نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ وہ گہری نیند میں چلی گئی۔ پنوں کے بھائی اسی موقع کی تاڑ میں تھے۔ انہوں نے اپنے اونٹوں کو پہلے ہی سے تیار رکھا ہوا تھا اور ان کے پالان بھی ڈال کر خوب کس دیے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی بے ہوش پنوں کو اٹھایا اور اونٹ پر لاد دیا۔ وہ جلد از جلد بھنبھور کے حدود سے نکلنا چاہتے تھے۔ لہٰذا شہر سے نکلتے ہی انہوں نے تیزی کے ساتھ کیچ کا رخ کیا اور اپنے اونٹوں کو مکران کی جانب بڑی تیزی کے ساتھ ہانکنے لگے۔

ادھر جب صبح ہوئی اور سسی کی آنکھ کھلی تو اس نے پنوں کو بستر پر نہ پایا تو وہ پریشان ہو گئی اور محل میں ادھر ادھر دوڑنے بھاگنے لگی اور زور زور سے پنوں کو آوازیں دینے لگی۔ مگر پنوں وہاں ہوتا تو اس کی پکار کا کوئی جواب دیتا وہ تو اپنے بھائیوں کے ساتھ بے ہوشی کی حالت میں اونٹ پر پڑا بھنبھور کے حدود سے کوسوں دور نکل چکا تھا۔ پھر اس نے مہمان خانے میں جا کر اس کے بھائیوں سے پوچھنا چاہا تو وہ بھی وہاں نہ تھے بلکہ ان کا کوئی سامان تک وہاں نہ تھا۔ وہ بیچاری اور زیادہ پریشان ہو گئی اور محبت کی ماری اپنے شوہر کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگنے لگی، اسے زور زور سے پکارنے لگی پھر اچانک ہی اسے خیال آیا اور ایک جھٹکا سا لگا کہ ہو نہ ہو پنوں کو اس کے بھائی اغوا کر کے لے گئے ہیں اور وہ یقیناً کیچ کی طرف نکل گئے ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ مجھے پہلے ہی ان کی نیت پر شک تھا کہ وہ میرے اور پنوں کے ساتھ کچھ

نہ کچھ ضرور کریں گے۔ یہ سوچنے کے بعد وہ پاگلوں کی طرح چیختی چلاتی ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے لگی۔ اس کی چیخ پکار سن کر نوکر چاکر جمع ہو گئے، ماں باپ بھی آ گئے اور اسے سمجھانے لگے لیکن وہ تو جیسے واقعی دیوانی ہو گئی تھی۔ بار بار یہی پکار رہی تھی:

''میرا پنوں کہاں ہے؟ میں پنوں کو تلاش کروں گی۔!''

اس طرح چیختے چلاتے وہ سب کو چھوڑ کر دیوانوں کی طرح مکران کی طرف دوڑنے لگی۔ اسے بہت روکا گیا، سمجھانے کی کوشش کی گئی لیکن اس نے کسی کی بات نہ سنی نہ مانی اور دوڑتی ہوئی جنگل کی طرف چلی گئی۔ گھر والوں نے کچھ دور تک اس کا پیچھا کیا اور پھر مایوس ہو کر پلٹ آئے۔

سندھ کے ممتاز محقق اور دانشور جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب تحفۃ الکرام کے بیان سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''سسی بھنبھور سے چلی تھی اور پیر ضیا محمد جو گوٹھ کے مقام سے ہوتی ہوئی منگھو پیر گئی اور سفر کرتے ہوئے اس نے دریا حب کو عبور کیا اور پھر مختلف مقامات سے گزرتی ہوئی سنگھر پہنچی تھی۔ اس سارے سفر کا حساب پچھتر میل یعنی اڑتیس کوس بنتا ہے جو لگ بھگ تحفۃ الکرام کے تحریر کردہ فاصلہ کے برابر ہے۔'' (عقیل (2002:(26)

سسی دیوانہ وار بھاگتی ہوئی جارہی تھی۔ ویران اور سنسان بیابان، خطرناک پہاڑیاں اور کھائیاں، اونچے نیچے، ٹیڑھے میڑھے راستے، نوکیلے پتھر اور تپتی ہوئی ریت، وہ دوڑتی چلی جارہی تھی۔ اسے نہ یہ پتہ تھا کہ کہاں جارہی ہے اور نہ یہ جانتی تھی کہ اسے کہاں جانا ہے؟ کدھر جانا ہے؟ وہ تو بھاگی جارہی تھی اور پاگلوں کی طرح پنوں پنوں پکار رہی تھی۔ دو پہر کے وقت لسبیلہ کے گرم ترین علاقے میں سورج آگ برسا رہا تھا اور زمین تانبے کی طرح ہو چکی تھی۔ گرم ہواؤں کے تھپیڑے ایسے لگ رہے تھے جیسے جہنم کا کوئی دروازہ کھل چکا ہو اور وہاں سے تیز آگ نکل رہی ہو۔ پیاس کی شدت سے سسی کا حلق سوکھ چکا تھا اور اس کے پاؤں زخموں سے چھلنی ہو چکے تھے۔ پھر بھی وہ ہانپتی اور کانپتی ہوئی دوڑی چلی جارہی تھی، اس کی ہمت بار بار جواب دے جاتی اور ہر بار وہ ہمت کر کے آگے بڑھتی، پنوں کی محبت اور طلب اسے حوصلہ

دیتی اور وہ پھر آگے بڑھنے لگتی۔۔اسی طرح وہ تپتی ہوئی زمین پر سفر کرتی اور خطرناک راستوں سے گزرتی ہوئی تقریباً چالیس کوس (لگ بھگ اسی میل) تک چلی گئی اور اب وہ پب کی پہاڑیوں میں ماری ماری پھر رہی تھی۔اس کی پیاس کے مارے بُرا حال تھا۔اور اس کے لیے ایک قدم مزید اٹھانا بھی محال ہو رہا تھا۔اسی طرح چلتے چلتے اس پر غشی طاری ہونے لگی۔اوپر آگ برساتا سورج اور نیچے تپتی ہوئی تانبا کی طرح گرم وسرخ زمین، سسی چلتے چلتے چکرا گئی اور غش کھا کر گر پڑی۔اس کے لبوں پر پانی پانی کی پکار تھی اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں آگ کی طرح تپتی ہوئی زمین پر پڑی تھی۔اس موقع پر شاید قدرت کو اس پر رحم آگیا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں پانی کا ایک چشمہ پھوٹ پڑا اور زمین سے ٹھنڈا میٹھا پانی ابل ابل کر باہر آنے لگا۔اس نے جلدی سے پانی پی کر اپنی پیاس بجھائی تو اسے قدرے ہوش آیا۔اس نے کچھ دیر وہاں آرام کیا اور پھر اپنے نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہوگئی۔کہتے ہیں کہ چشمے کے اس پانی نے بعدازاں ایک تالاب کی شکل اختیار کی جو اب بھی اس مقام پر موجود ہے اور ہر وقت پانی سے بھرا رہتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس رات سسی نے وہیں پر گزاری اور رات کو مہندی کے پودے کی ایک شاخ اپنے ہاتھ میں لی تا کہ صبح تک اس کے ہاتھ پیلے ہو جائیں اور وہ سرخ ہاتھوں کے ساتھ اپنے پنوں سے ملے۔لہٰذا وہ ایک شاخ ہاتھ میں لے کر سوئی اور صبح وہ شاخ وہیں پھینک دی۔خدا کی قدرت کہ مہندی کی وہ شاخ ایک درخت بن گئی اور آج بھی اس مقام پر موجود ہے اور اس محبت کی ماری دکھیاری دیوی کے یادگار کی طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ (عقیل (1997):110)

اگلی صبح سسی تازہ دم ہو کر چشمے سے روانہ ہوگئی اور پہاڑی راستہ پر چلنے لگی۔ چھ سات کوس چلنے کے بعد اس کے پاؤں بری طرح زخمی ہوگئے اور اس کے لیے ایک قدیم بھی مزید اٹھانا محال ہو گیا تھا۔پیاس کی شدت نے ایک بار پھر اس کا بُرا حال کر دیا تھا اور اس کے حلق میں کانٹے چھب رہے تھے۔چشمہ اتنا پیچھے رہ چکا تھا کہ اس تک دوبارہ جانا محال تھا۔ ہمت کر کے وہ آگے بڑھنے لگی اور گرتے پڑتے ان پہاڑی ڈھلوانوں اور چڑھائیوں پر خود کو گھسیٹتی رہی۔دور دور سے ایک چرواہا جو اپنا ریوڑ چرا رہا تھا، نے دیکھا کہ ایک تنِ تنہا عورت جو بے حد خوبصورت اور حسین ہے، ان پہاڑوں میں بھٹکتی پھر رہی ہے، وہ بڑا حیران ہوا کہ اس

ویرانے اور سنسان سی جگہ پر یہ کون عورت گھومتی پھر رہی ہے؟ اس نے قریب پہنچ کر دیکھا تو ایک حسین وجمیل عورت کو پایا۔ سسی نے اسے دیکھتے ہی بے تابی سے پوچھا کہ اے بھائی کیا آپ نے میرے پنوں کو تو نہیں دیکھا؟

وہ چرواہا سسی کو دیکھ کر پہلے ہی سے بہت حیران تھا اب اس کے حسن وخوبصورتی کو دیکھ کر اس کی نیت خراب ہوگئی اور اس نے اس کے ساتھ دست درازی کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ تم ایک پنوں کی تلاش میں ہو اس دنیا میں ہزاروں پنوں آپ کے لیے حاضر ہیں۔ یہ کہہ کر وہ سسی کی عزت لوٹنے کی نیت سے آگے بڑھا اور دست درازی کی کوشش کی۔ سسی بھی اس کا ارادہ بھانپ گئی تھی مگر وہ اس ویرانے میں اپنی مدد کے لیے کسے پکار سکتی تھی؟ اس وقت وہ تو قسمت کی ماری ہوئی اپنی مصیبت میں گرفتار تھی۔ چرواہے سے کہنے لگی:

> "اے بے درد انسان! میں پیاس سے مری جارہی ہوں اور تو مجھ پر فریفتہ ہو رہا ہے۔ تجھے خدا کا خوف کرنا چاہیے اور پہلے میری پیاس بجھانی چاہیے۔" (عقیل (1997):111)

چرواہا یہ سن کر اپنے ریوڑ کی جانب بھاگا کہ وہاں سے پانی اور دودھ وغیرہ لا کر اس لڑکی کو دیدے، اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے بعد وہ اس کے ساتھ چلنے پر راضی ہو جائے گی۔ وہ ریوڑ کی جانب بھاگا اور ادھر بے کس وبے بس سسی نے اپنے اللہ کو پکارا اور اس ویرانے میں اپنی عزت وآبرو بچانے کی دعا کی۔ وہ اللہ کے حضور ان الفاظ میں گڑگڑائی:

> "اے بے بسوں کے چارہ ساز! اے مجبوروں کی فریاد سننے والے! اس مصیبت کے وقت میری مدد کر۔ میں پنوں کی امانت ہوں، میری پاک دامنی پر حرف نہ آئے۔ اس ویرانے میں تو ہی میری فریاد سننے والا ہے۔" (عقیل (1997):111)

بے کس وبے بس سسی کی دعا اللہ نے قبول کی، اسی وقت ایک چٹان میں شگاف پیدا ہو گیا اور سسی اس میں سما گئی اور شگاف پھر سے بند ہو گیا۔ اتفاق سے اس کے پلو کا کچھ حصہ باہر رہ گیا تھا۔ جب چرواہا دودھ لے کر واپس آیا تو وہاں سسی کو نہ پا کر بڑا پریشان ہوا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا اور جب اس کی نظر اس پتھر پر پڑی جس میں وہ سمائی تھی تو یہ عبرتناک منظر دیکھ کر

خوفزدہ ہوگیا۔ وہ اسی وقت سجدے میں گر کے اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ وہ تائب ہوا اور اس نے سسی کی قبر کے اردگرد کچھ پتھر نشانی اور پہچان کی خاطر رکھ دیے۔

دوسری طرف پنوں کے تینوں بھائی اسے ساتھ لے کر برق رفتاری کے ساتھ مکران کی جانب اڑے چلے جا رہے تھے انہوں نے پنوں کو ایک اونٹ پر باندھ رکھا تھا اور بڑی تیزی کے ساتھ اپنی منزل کی جانب گامزن تھے۔ وہ جلد از جلد اپنے باپ کے پاس پہنچنا چاہتے تھے تاکہ وہ پنوں کو اپنے بیمار اور اولاد کی جدائی میں بے قرار والد سے ملا سکیں کہ اسے صحت حاصل ہو سکے۔ پنوں کا نشہ آہستہ آہستہ اترتا گیا اور اسے ہوش آتا گیا، جب اسے مکمل ہوش آیا تو اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو خود کو بندھا ہوا پایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور ادھر ادھر دیکھا تب اسے پتہ چلا کہ وہ ایک اونٹ پر بندھا ہوا ہے اور اس کے بھائی اسے اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔ وہ ایک دم سارا ماجرا سمجھ گیا۔ گذشتہ رات کے سارے واقعات ایک فلم کی طرح اس کے دماغ اور آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ وہ سمجھ گیا کہ رات اس کے بھائیوں نے اسے کثرت سے شراب پلا کر بے ہوش کیا اور پھر اسی حالت میں وہ اسے اٹھا کر اونٹ پر باندھ دیا اور مکران کی جانب چل پڑے۔ اس نے اپنے بھائیوں کو آواز دیتے ہوئے کہا کہ تم لوگ مجھے دھوکے سے اغوا کر کے لے جا رہے ہو۔ اونٹ روکو اور میری رسیاں کھول دو۔ مجھے سسی کے پاس جانے دو میں مکران نہیں جاؤں گا، میں سسی کے بغیر مر جاؤں گا۔ خدا کے لیے اونٹوں کو روک دو اور میری رسیاں کھول کر مجھے واپس جانے دو۔ پنوں کی گڑگڑاتی اور روتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ مگر بھائیوں نے اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی بلکہ اونٹوں کی رفتار کو مزید بڑھا دیا۔

یہاں پر داستان بیان کرنے والوں کے بیانات میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کا بیان یہ ہے کہ پنوں نے راستے ہی میں اپنی رسیاں کھول دی تھیں اور اونٹ سے چھلانگ لگا کر اپنے بھائیوں سے فرار ہو گیا تھا۔ وہ فرار ہو کر سسی کی جانب چل پڑا تھا۔ جبکہ بعض مستند بیانات کے مطابق پنوں کو اس کے بھائی اسی حالت میں اپنے والد کے پاس لے گئے اور اسے اس کے حضور پیش کیا۔ والد اسے دیکھ کر خوش تو بہت ہوا مگر اس کی حالت دیکھ کر افسوس بھی کرنے لگا۔ پنوں بار بار کہہ رہا تھا کہ اسے واپس بھنبھور جانے دو وہ سسی کے بغیر نہیں

رہ سکتا، وہ رو رہا تھا اور اپنے باپ اور بھائیوں کی منتیں کر رہا تھا۔ اس کی یہ خستہ اور گھمبیر حالت دیکھ کر اس کے والد کو خوف لاحق ہوا کہ کہیں سسی کی جدائی میں اس کا بیٹا جان ہی نہ دے ڈالے۔ اس نے دو چار دن انتظار کیا اور پنوں کو ہر طرح سے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی مگر اس کی سسی سسی کی رٹ ختم نہ ہوئی۔ آخر مجبور ہو کر اس نے اپنے بیٹوں کو کہا کہ اس کو فوراً سندھ لے جاؤ اور وہاں سے سسی کو بھی ساتھ لے کر واپس مکران آ جاؤ۔ باپ نے سختی کے ساتھ اور بار بار سسی کو لانے کی تاکید کی۔ لہٰذا بھائیوں نے فوراً اونٹ تیار کیے اور مکران سے سندھ کی جانب چل پڑے۔ وہ سندھ کی جانب اُڑے چلے جا رہے تھے اور سب سے زیادہ پنوں کو جلدی تھی، وہ بار بار اپنے بھائیوں سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اور تیز چلو، اونٹوں کو اور تیز بھگاؤ۔ اسی طرح اونٹوں کو ہوا کی رفتار سے دوڑاتے اور سفر کرتے ہوئے وہ اس مقام پر پہنچے جہاں سسی پہاڑ میں سما گئی تھی تو اچانک پنوں کو کوئی غیبی آواز سنائی دی اور وہ فوراً وہیں رُک گیا۔ اس نے اپنے اونٹ کی مہار کھینچ لی اور اسے روک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تو اچانک اس کی نظر ان نشانات پر پڑی جو چرواہے نے سسی کی قبر کے اردگرد پتھروں سے بنائے تھے اور وہاں پر ایک کپڑے کا ٹکڑا باہر نکلا ہوا اسے نظر آیا۔ وہ بہت پریشان ہوا اور طرح طرح کے وسوسے اور بُرے خیالات اس کے ذہن میں آتے رہے۔ وہ پریشان ہوا کہ یہ غیبی آواز جس نے مجھے روکا کیسی تھی؟ یہ قبر کس کی ہے؟ یہ دوپٹہ کا پلو کس کا ہے؟ یہ کیوں کچھ شناسا سا لگتا ہے۔ یہاں کیا ہوا ہے؟ کیا کوئی انہونی سی بات ہوئی ہے یا کوئی عجیب و غریب واقعہ پیش آیا ہے کہ جس کی وجہ سے قدرت نے مجھے یہیں پر روک دیا اور میرے سامنے یہ قبر آ گئی ہے۔ وہ انہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک اسی وقت وہ چرواہا وہاں نمودار ہوا۔ اس نے پنوں کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ اے اجنبی تم کون ہو اور یہاں کیوں کھڑے ہو اس قبر کے پاس؟ تو پنوں نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے الٹا اس سے پوچھا کہ یہ قبر کیسی ہے پہلے تو نہ تھی اب یہ کہاں سے اچانک یہاں بن گئی ہے؟ لگتا ہے بالکل تازہ قبر ہے۔ اس سوال پر چرواہا رونے لگا اور اسے بتایا کہ کیسے دو چار دن قبل ایک بے بس عورت یہاں سے پنوں پنوں کہہ کر گزر رہی تھی اور یہاں آ کر وہ اس پہاڑی میں سما گئی کیونکہ میری نیت میں فتور آ گیا تھا اور وہ پاکباز عورت کسی پنوں نامی شخص کی بیوی تھی جسے شاید اس کے دشمن اٹھا کر لے گئے تھے اور وہ عورت اپنے شوہر

کی تلاش میں ان پہاڑوں میں بھٹک رہی تھی کہ اچانک یہ واقعہ پیش آیا۔ پنوں پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا ہو۔ وہ ایک دم سے اٹھا اور ایک چیخ ماری اور آسمان کی طرف دیکھ کر دعا کی:

''اے بچھڑے ہوؤں کو ملانے والے، اے ناامیدوں کی امید گاہ! مجھے میری سسی سے ملادے'' (عقیل (1997):111)

دعا کا مانگنا تھا کہ اچانک چٹان میں پھر سے شگاف پڑ گیا اور وہ سسی سسی پکارتا ہوا اس میں سما گیا۔ چٹان کا شگاف پھر سے بند ہوگیا اور اس طرح دو سچے پیار کرنے والے اور اس دنیا کے ہاتھوں ستائے ہوئے دو دل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لسبیلہ کے پہاڑی سلسلوں میں چٹانوں کے اندر سما کر ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے۔

یہ واقعہ دیکھ کر پنوں کے تینوں بھائی حیرت میں ڈوب گئے۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑے آنسو بہاتے رہے، پھر انہوں نے فاتحہ پڑی اور واپس مکران کی جانب چل پڑے۔ اس طرح محبت کی یہ عظیم داستان اپنے انجام کو پہنچی مگر جس طرح یہ دو محبت کرنے والے انسان زندہ درگور ہو کر امر ہو گئے اسی طرح ان کی محبت کی سچی داستان بھی لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے زندہ رہ گئی۔

سسی پنوں کا مقبرہ اب بھی لسبیلہ کے علاقہ پبی ناکہ کے قریب ہے اور مرجع خلائق ہے۔ لوگ دور دراز سے آتے ہیں اور ان دو محبتوں کرنے والے اور زندہ غائب ہوجانے والے انسانوں کی آخری آرام گاہ پر آ کر اپنی امیدوں کے بر آنے کی دعا کرتے ہیں اور نذر ونیاز دیتے ہیں۔

"سُن کے ہوت زمین پہ ڈگیا، کھا کلیجے کانی
کھلی گور پیا وچ قبرے، ہوت علی دل جانی
خاطر عشق گئے رل ماٹی، اکھتے خاک سمانی
ہاشم! عشق بلوچ سسی دا جگ جگ رہک کہانی"

ترجمہ:

یہ سنتے ہی ہوت پنوں زمین پر گر پڑا۔ اس کے کلیجے میں تیر لگا تھا
اگلے لمحے وہ قبر شق ہوگئی اور ہوت علی کا دل جانی پنوں کھلی قبر میں جا سمایا

سچے عشق کی خاطر جوانی حسن اور خوبصورتی سب کچھ مٹی میں مل گیا
ہاشم! بلوچ اور سسی کے عشق کی کہانی رہتی دنیا تک زندہ رہے گی
(اعجاز (2007):148-49)

دوستین و شیریں:

بلوچستان کی رومانوی لوک داستانیں دیگر ثقافتوں کی اکثر لوک داستانوں سے مختلف ہیں۔ اکا دکا داستانوں کو چھوڑ کر دیگر تمام داستانوں کے مرکزی کردار آپس میں پہلے ہی سے مضبوط رشتوں میں منسلک نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ حانی اور شہہ مرید کی بچپن ہی میں منگنی ہو جاتی ہے اور ان کی محبت دو منگیتروں کی محبت تھی جن کی کچھ عرصہ بعد شادی ہونے والی تھی، اسی طرح شہداد و مہناز کی داستان کے مرکزی کرداروں کا رشتہ بھی اسی نوعیت کا ہے، ماہ گل و شیر جان میاں بیوی کی شکل میں ملتے ہیں، الغرض چند ایک داستانوں کو چھوڑ کر اکثر داستانیں عام طور پر دیگر لوسٹوریوں سے مختلف نوعیت کی ہیں۔ شیریں اور دوستین کی داستان محبت کی نوعیت بھی ایسی ہی ہے۔ اس داستان میں انسانی سماج اور نفسیات کے کئی پہلو واضح طور پر نظر آتے ہیں علاوہ ازیں اس داستان کے مرکزی کردار بلوچی زبان و ادب کے بڑے مشاہیر میں شمار ہوتے ہیں۔ شیریں دوستیں کی داستان پر لکھنے والے بعض حضرات آپس میں اختلاف بھی رکھتے ہیں اور ان کی تحریروں میں اس داستان کے وقت اور مقام پر یہ اختلافات ملتے ہیں جبکہ باقی ماندہ داستان کو اکثر مصنفین اور ادیبوں نے اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس داستان کے بارے میں میر گل خان نصیر کی کتاب بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی میں کافی معلومات ملتی ہیں جبکہ سلیم خان گمی نے بلوچی ادب بلوچ ثقافت نامی کتاب میں اس داستان کو ڈرامائی طرز پر بیان کیا ہے اور اس کے سارے مکالمے ڈرامائی ہیں(گمی (1990 سیکنڈ ایڈیشن):60-126) جبکہ اس پورے ڈرامے میں بلوچی زبان میں دوستین اور شیریں کی شاعری کو بیان نہیں کیا گیا اور نہ ہی ڈرامے میں ان کی شاعری کو جگہ دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جمیل زبیری نے انگریزی زبان میں اس داستان کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے(زبیری (2002): 69-67) جبکہ بعض دیگر کتابوں میں بھی اس داستان کے

بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ مگر کسی نے بھی داستان کی مکمل تفصیلات بیان نہیں کیے ہیں۔ شیریں دوستین کی محبت بھری کہانی کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے:

کہ سولھویں صدی عیسوی کا زمانہ رند و لاشار قبائلی یونین کا زریں دور تھا۔ ان قبائل نے اس دور میں نہ صرف مادی لحاظ سے بہت ترقی کی بلکہ ان کے جغرافیائی دائرہ کار میں بھی زبردست اضافہ ہوا۔ ان قبائل کی ٭ ندہ قوت نے مغرب میں کرمان سے لے کر مشرق میں پنجاب کے حدود تک ایک وسیع و عریض خطہ زمین فتح کر کے عظیم الشان مملکت قائم کی۔ جہاں مادی، سیاسی اور جغرافیائی لحاظ سے ان قبائل کی ترقی بامِ عروج پر پہنچ گئی تو اسی عہد میں بلوچی ادب نے بھی اپنے عہد زریں کو پایا اور بلوچی منظوم ادب نے اس صدی میں وہ ترقی کی کہ اس سے پہلے یا اس کے بعد بلوچی ادب کی ایسی ترقی کہیں نظر نہیں آتی۔ شیریں دوستین کا عشقیہ کلام اسی عہد کی یادگار ہے جس کا بلوچی زبان اور ادب میں اونچا مقام ہے اور ان دونوں محبت کرنے والوں کی شاعری نے بلاشبہ بلوچی ادب کو دوام بخشا ہے۔

رند و لاشار عہد میں رندوں کے کسی ذیلی طائفہ کے سردار کا نام دوستین تھا جو جوان، خوبرو، قدآور، شجاع، بہادر، مہمان نواز، محنتی، ماہر تیرانداز، زبردست شاہسوار اور لاجواب شمشیرزن تھا۔ اس کی بہادری اور شجاعت کے قصے دور و نزدیک کے علاقوں میں مشہور تھے۔ بالخصوص وہ ایک بہترین شاہسوار اور خنجر باز کی حیثیت سے جانا جاتا تھا اور جنگوں اور معرکوں میں اپنے اس فن کا زبردست مظاہرہ بھی کرتا تھا۔ اس کی بہادری کے چرچا قریبی ریاستوں میں بھی پہنچ چکی تھیں اور ہر ایک یہ جانتا تھا کہ وہ سوائے اپنے قبائلی سردار میر چاکر خان رند کے اور کسی کی اطاعت اور فرمانبرداری نہیں کرتا۔ وہ ایک بہترین شاعر بھی تھا اور اس کی شاعری کے چرچے بھی قرب و جوار کے علاوہ دور دراز تک پھیل چکے تھے اور اس کی بہادری کی طرح اس کی شاعری بھی بڑی شہرت رکھتی تھی۔ وہ یتیم تھا اور اس کے ماں باپ کافی عرصہ قبل انتقال کر چکے تھے جبکہ اس کا صرف ایک چھوٹا بھائی تھا جس کا نام شیموں تھا۔ والد کی وفات کے بعد اس کے طائفے نے سرداری کی پگڑی ان کے سر پر رکھ دی تھی جس کی وجہ سے اس پر دہری ذمہ داری عائد تھی۔ ایک طرف وہ اپنے گھر کے سارے کام کاج کرتا کیونکہ ان کے گھر میں اس کے اور اس کے بھائی کے سوا اور کوئی نہ تھا جبکہ قبیلہ کے جملہ کاموں کی ذمہ داری بھی اس پر عائد ہوتی

تھی۔ اس کے علاوہ اپنی زمینوں کی دیکھ بھال، مال مویشیوں اور بھیڑ بکریوں وغیرہ کی نگہداشت کی ذمہ داریاں بھی اس پر عائد تھیں۔ اس کا بھائی شیموں چھوٹا تھا اور دوستین کو اس سے بہت محبت تھی۔ وہ ہمیشہ اسے اپنے پاس رکھتا اور اس کے سارے کام خود کرتا تھا۔ وہی اس کی ماں تھی اور وہی اس کا باپ تھا، وہی بھائی اور بہن کا کردار ادا کرتا تھا۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد ان کے دن بڑی مشکل سے کٹ رہے تھے اور یہ سب کچھ سنبھالنے میں دوستین کو بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا لہٰذا اس کا جگری دوست اور بچپن کا ساتھی جلمب (جلنب اور جلم بھی لکھا گیا ہے) ہمیشہ اسے کہتا کہ دوستین تم جلدی سے اپنی شادی کرو تا کہ گھر کے جھمیلوں سے جان چھوٹ جائے اور آپ دیگر امور پر توجہ دے سکو اور خود کو بھی سنبھال سکو۔ جلمب کے اس بات پر وہ ہمیشہ مسکرا کر یہی کہتا کہ ہاں یار بات کرتا ہوں شیریں کے ابا سے اس سلسلے میں۔ پھر وہ خاموش ہو جاتا۔

شیریں ایک اور رند طائفہ کے سردار لال خان کی بیٹی تھی جس کی منگنی بچپن میں ہی دوستین کے ساتھ ہوئی تھی۔ شیریں ایک معصوم و پاکیزہ، خوبصورت و حسین لڑکی ہونے کے ساتھ ساتھ بیحد ہمدرد اور محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ اسے دوستین سے بہت پیار تھا اور وہ بھی چاہتی تھی کہ اس کی جلد از جلد دوستین کے ساتھ شادی ہو جائے اور وہ نہ صرف اپنے محبوب کے پاس پہنچ جائے بلکہ وہ دوستین کی مشکلات بھی کم کر سکے اور اس کے گھر کے کام کاج کر کے اس کی ذمہ داریاں بانٹ سکے۔ شیریں بھی شاعرہ تھی اور بہت ہی اچھی، باا ثر، پُر معنی اور با مقصد شاعری کرتی تھی۔ دوستین کو اس کی شاعری بہت پسند تھی اور وہ ہمیشہ اس کی شاعری کی تعریف کرتا اور اس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

ایک دن شیرین اور دوستین کی ملاقات دوستین کی زمینوں پر ہوئی تو دوستین نے اس بے پناہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شیریں میں چاہتا ہوں کہ ہر وقت آپ میری نظروں کے سامنے رہو، میرے گھر میں اور میری زندگی میں تا کہ میری مشکلات کم ہوں اور میری زندگی میں بھی پُر کیف بہار اور خوشیوں کے رنگ بھر جائیں۔ اس تنہائی اور یکسانیت سے میں اُکتا گیا ہوں اور بہت تنگ آ گیا ہوں، چاہتا ہوں کہ جلد از جلد شادی ہو جائے اور تم میرے گھر آ جاؤ، اس طرح یہ چھپ چھپ کر ملنا بھی ختم ہو جائے گا اور میرے گھر میں بھی رونق آ جائے گی۔

شیموں کی بھی یہی خواہش ہے کہ آپ جلد از جلد اس کی بھابھی بن جائیں اور وہ آپ کے ہاتھ کے مزے مزے کے کھانے کھائے اور ایک ماں، ایک بڑی بہن اور ایک بھابھی کا پیار پا سکے۔ آپ جانتی ہو کہ مجھے اپنے چھوٹے بھائی سے کتنا پیار ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ جلد از جلد میرے گھر آ جاؤ تا کہ ہماری زندگی مکمل ہو جائے۔

دوستین کی اتنی لمبی بات سن کر شیریں نے بڑے پیار اور ملائمت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا کہ دوستین میرے پیارے دوستین! تو آپ اس سلسلے میں ابا سے بات کیوں نہیں کرتے ہو، ابا بھی جانتا ہے کہ آپ کے گھر میں کوئی نہیں اور آپ کے مسائل بہت زیادہ ہیں، اور ویسے بھی میرے ابا کی بھی یہی خواہش ہے کہ میں اب جوان ہوں لہٰذا میری جلد از جلد شادی ہو جانی چاہیے۔ شیریں کی اس بات کے جواب میں دوستین نے کہا کہ میں بہت جلد آپ کے ابا کے پاس آتا ہوں اور اپنی اور آپ کی شادی کی تاریخ طے کرنے کی بات کرتا ہوں۔

کچھ دنوں بعد دوستین نے میر لال خان سے جا کر اس سلسلے میں بات کی اور اسے بتایا کہ چونکہ آپ جانتے ہیں کہ میرا اس دنیا میں ایک چھوٹے بھائی کے سوا اور کوئی سرپرست، یا کوئی خاتون نہیں ہے لہٰذا میں خود اپنی شادی کی بات کرنے آیا ہوں۔ آپ مہربانی کر کے میری شادی کی تاریخ طے کریں تا کہ میں اور آپ دونوں اس اہم ترین فرض سے بخیر و خوبی سبکدوش ہو سکیں۔ میر لال خان بھی جانتا تھا کہ دوستین کے گھر میں کوئی خاتون نہیں ہے اور نہ ہی بڑی عمر کا کوئی فرد ہے، لہٰذا اس کی مشکلات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میر لال خان نے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ اسے دیدی کہ ایک ہفتہ بعد اس کا نکاح اور رخصتی ہوگی اور وہ آکر شیریں کو اپنے گھر لے جائے۔

دوستین خوش خوش گھر آیا اور اپنے بھائی کو یہ خوشخبری سنائی، شیریں کمرے میں دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر یہ سب باتیں سن رہی تھی اور مسرت کے ساتویں آسمان پر پہنچی ہوئی تھی، کیونکہ ایک ہفتہ بعد وہ اپنے خوابوں کی دنیا کو پانے والی تھی، اس کا دوستین ہمیشہ کے لیے اس کا ہونے والا تھا، وہ دوستین جو اس کے بچپن کا ساتھی تھا، وہ دوستین جو اس کی محبت اور اس کی منزل تھی، وہ دوستین جو اس کی شاعری کا موضوع تھا، وہ دوستین جو اس کا تھا صرف اس کا،

وہ ایک ہفتہ بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوستین کے گھر جانے والی تھی اپنے دوستین کی ہونے جارہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اُڑ کر کھیتوں اور وادیوں کی طرف نکل جائے اور خوب ناچے گائے اور خوشیاں منائے کہ اس کے خوابوں کی تعبیر اسے ملنے والی تھی اور دوستین ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسے اپنی بانہوں میں لینے کے لیے آنے والا تھا اس کا دوستین، صرف اس کا دوستین۔۔۔

دوستین نے اپنے دوست جلمب کو بھی اپنے گھر بلایا اور اسے بھی یہ خوشخبری سنائی۔ جلمب دوستین کے بچپن کا دوست اور جگری یار تھا۔ وہ ہمیشہ ایک ساتھ نظر آتے تھے اور ہر شکاری مہم یا معرکہ میں وہ ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ بچپن سے جوانی تک وہ ایک ساتھ رہے تھے اور انہیں ایک دوسرے سے بہت محبت تھی۔ پورے علاقے میں ان کی دوستی کی مثال دی جاتی تھی اور ہر ایک ان کی دوستی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ جلمب دوستین کی شادی کا سن کر پھولے نہیں سمایا اور دوستین سے کہا کہ میں گاؤں میں جا کر منادی کراتا ہوں اور شادی کے جشن کی تیاری کرتا ہوں، ظاہر ہے میرے یار کی شادی ہے جشن تو ہوگا اور ایسا جشن ہوگا کہ جو برسوں تک لوگوں کو یاد رہے گا۔ شاہسواری ہوگی، تیر اندازی ہوگی، شمشیر زنی ہوگی، ناچ گانے ہوں گے، مقابلے ہوں گے کہ میرے یار کی شادی ہے۔ جلمب خوشی میں پاگل ہوا جارہا تھا اور شیموں بھی قہقہے لگا رہا تھا اور خوب اچھل اچھل کر ناچ رہا تھا، دوستین نے ہنستے ہوئے کہا: اچھا ٹھیک ہے جلمب سب کر لینا، میں منادی کروانے کے لیے جانے والا تھا لیکن میں نے کہا کہ پہلے آپ کو ساری بات بتا دوں۔ ہم نے کل شکار کے لیے بھی جانا ہے دوستین نے جلمب کو یاد دلاتے ہوئے کہا، اور شیموں بھی ہمارے ساتھ جائے گا جبکہ ریوڑ میں کسی کے ذمہ لگا دوں گا۔ جلمب نے کہا کہ آپ کی شادی کی تیاری کرنی ہے اور آپ کو شکار کی پڑی ہے، شکار پر پھر کسی وقت چلیں گے، پہلے شادی کی تیاری۔ لیکن دوستین جو شکار کا بہت شوقین تھا نے کہا کہ کل شکار پر جانا ہے، ہتھیار سارے تیار ہیں، تیاری پوری ہے، رُکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جلمب دوستین کی کسی بات سے انکار نہیں کرتا تھا، جلمب تھوڑا جلد باز تھا اور وہ یہ جانتا تھا، جبکہ دوستین کی عقل و دانش کا وہ خود بھی قائل تھا۔ لہٰذا جب شکار کی بات دوستین نے کی تو جلمب بھی مان گیا اور اگلے دن وہ تینوں شکار کھیلنے چلے گئے۔

شکار سے واپسی پر جب وہ گاؤں پہنچے تو گاؤں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں اور سب

لوگ پریشان تھے۔ اس نے ایک معتبر شخص کو روک کر اس ہلچل اور بھگدڑ کی وجہ پوچھی تو اس معمر شخص نے کہا کہ دوستین اپ جب شکار پر گئے تو کسی مخبر نے آ کر ہمیں بتایا کہ ہمارے گاؤں پر ارند (ہڑند) کا مغل (ترک) حاکم حملہ کرنے والا ہے۔ اس کا لشکر یہاں سے کچھ فاصلے پر پڑاؤ کیے ہوئے ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ ہم اس کی اطاعت گزار اور باجگزار بن جائیں۔ یہ سن کر دوستین کا سارا وجود غصے اور غضب سے کانپ اٹھا اور اس نے انتہائی غصیلی آواز میں کہا کہ دنیا کی کوئی طاقت دوستین کو میر چاکر خان رند کی اطاعت سے ہٹا کر اپنی اطاعت پر مجبور نہیں کر سکتا۔ میری جان تو جا سکتی ہے مگر میری وفاداری کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی۔ یہ کہہ کر دوستین نے بھی طبل جنگ بجانے کا حکم دیا اور اپنے قبیلہ کو جنگ کی تیاری کرنے کا حکم دے دیا۔

ہڑند کے ارغون ترکوں نے رندوں پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں قیامت کا رن پڑا، اور میدان جنگ لاشوں سے بھر گیا، اور زخمیوں کی چیخ پکار سے دل دہلنے لگے، صبح سے شام تک دونوں لشکروں میں خونریز جنگ ہوئی جو بالآخر ترکوں نے جیت لی اور رندوں کو بُری طرح پامال کیا، سیکڑوں لوگ اس جنگ میں مارے گئے جبکہ دوستین اور جلمب کو ہڑند کے حاکم کے سپاہیوں نے زندہ گرفتار کر لیا۔ ہڑند کی فوج دوستین کے علاقے کو غارت کرنے کے بعد ہڑند کی قلعہ میں لوٹ آیا اور دوستین و جلمب کو ایک ایسے قید خانے میں بند کر دیا کہ جس کی دیواریں بہت اونچی اور مضبوط تھیں، ان میں نہ تو نقب لگایا جا سکتا تھا اور نہ ہی انہیں پھلاندا جا سکتا تھا یہ قید خانہ مضبوط تھا اور اس سے فرار ہونا ناممکن تھا۔ انہیں قید ہوئے کئی دن ہو چکے تھے، قید خانے پر متعین سپاہی انہیں صبح شام تھوڑا سا کھانا دیتے تھے اور دروازہ بند کر کے چلے جاتے تھے۔ وہ ان سے کوئی بات نہیں کرتے تھے اور نہ ان کی کوئی بات سنتے تھے، خاموشی سے آ کر اور کھانا رکھ کر، پہلے والے برتن اٹھا کر چلے جاتے تھے۔ ان کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے تا کہ وہ بھاگ نہ سکیں اور جس کمرے میں وہ بند تھے وہ چھوٹا سا اور تاریک کمرہ تھا جس کی دیواریں بہت اونچی تھیں جبکہ کافی اونچائی پر ایک چھوٹا سا روشن دان تھا جہاں سے ہوا آتی تھی۔ وہ روشن دان ایک تو کافی اونچائی پر تھا، دوسرا یہ کہ اس کا سائز بھی بہت چھوٹا تھا اور اس میں بھی لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ لہٰذا یہاں سے فرار کا خیال ہی عبث تھا کیونکہ دوستین جانتا تھا کہ یہ ناممکن ہے کہ وہ اس بند کمرے سے فرار ہو سکیں جس کی دیواریں سنگین ہیں بہت

موٹی اور مضبوط ہیں جبکہ راستے بھی مسدود ہیں، لہٰذا اس بندی خانے کے اندر سے فرار کی بجائے کوئی اور طریقہ سوچنا چاہیے۔

کافی دن گزرنے کے بعد ایک دن قید خانے کا دروازہ کھلا اور چند سپاہی اندر آئے جو شاہی فوج کے سپاہی لگتے تھے، انہوں نے دوستین اور جلمب کو اٹھ کھڑے ہونے اور ساتھ چلنے کا کہا۔ سپاہی آگے چل دیے جبکہ دوستین اور جلمب ان کے پیچھے پیچھے زنجیر بہ پا ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ وہ قید خانے سے باہر نکل کر قلعہ کے مختلف حصوں سے ہوتے ہوئے وہاں پہنچے جہاں ہڑند کا گورنر ان کا منتظر تھا کیونکہ اسی نے ہی دوستین کو طلب کیا تھا۔ سپاہیوں نے زنجیروں میں جکڑے ہوئے دوستین اور جلمب کو گورنر کے سامنے پیش کیا۔ اس نے کچھ دیر غور سے دونوں قیدیوں کی طرف دیکھا اور خشونت اور غرور و تکبر کے ساتھ کہا کہ اگر ہم چاہتے تو تم دونوں کو میدان جنگ میں ہی قتل کر سکتے تھے۔ اس پر دوستین نے جواب دیا کہ تو پھر آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا، جہاں ہمارے سیکڑوں دیگر ساتھی شہید ہوئے تھے ہم بھی وہیں شہید ہو جاتے، اس سے کیا فرق پڑتا۔ اس پر حاکم نے کہا کہ دوستین ہم نے تمہاری بہادری اور شہسواری کے بڑے چرچے سنے ہیں۔ ہم تماری بہادری کو کبھی بھی آزما سکتے ہیں۔ اس پر دوستین نے پوچھا کہ ہماری بہادری کو کس پیمانے پر ناپنا چاہتے ہو تو حاکم ہڑند نے کہا کہ ایک قیدی کو یہ پوچھنے کا حق نہیں۔ دوستین کہاں رکھنے والا تھا اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہو کہا کہ قیدی ضرور ہوں مگر بے غیرت نہیں ہوں، آپ مجھے اپنے کسی بھی مقصد کے لیے استعمال نہیں کر سکتے۔ آپ کا اندازِ گفتگو بالکل مناسب نہیں ہے۔

حاکم کو دوستین کی یہ گفتگو اور دلیری اچھی نہیں لگی اور اس نے داروغہ سے کہا کہ انہیں لے جاؤ اور اسی کوٹھڑی میں دوبارہ پھینک آؤ۔ لہٰذا دوستین اور جلمب کو دوبارہ اسی تنگ سے کوٹھڑی میں پھینک دیا گیا اور ان پر مزید سختیاں شروع ہو گئیں۔ چند دن بعد حاکم نے دوبارہ اسے طلب کیا۔ لہٰذا وہ دوبارہ حاکم ہڑند کے پاس پہنچایا گیا۔ حاکم ہڑند نے اس بار ذرا ملائمت اور نرمی سے گفتگو کا آغاز کیا اور یوں گویا ہوا: کہ اگر تم دونوں میری اطاعت قبول کرو تو میں تمہاری جان بخش کر تمہیں عزت کے ساتھ جانے دوں گا۔ لیکن دوستین نے اس کے اس مطالبہ کو شکریہ کے ساتھ ٹکرا دیا اور اس کی اطاعت کرنے سے انکار کیا۔ اس پر حاکم کو بہت تعجب

ہوا اور اس کی وجہ پوچھی تو دوستین نے صاف صاف کہا کہ ایک وقت میں ایک حاکم کی اطاعت کی جا سکتی ہے دو حاکموں کی نہیں، میں اپنا حاکم میر چاکر رند کو مانتا ہوں اور اسی کی اطاعت کرتا ہوں۔ اس کے سوا میرا کوئی دوسرا حاکم نہیں ہے۔ اس پر حاکم نے کہا کہ اگر میں تمہیں مار دوں تو۔۔۔ اس پر دوستین نے سینہ تان کر کہا کہ آپ ایسا نہیں کر سکتے ہو کیونکہ اگر آپ نے ایسا کیا تو میر چاکر رند آپ کو، آپ کی فوجوں کو اور آپ کے اس قلعہ کو تہس نہس کر کے رکھ دے گا۔ ہڑند کا حاکم دوستین کی اس دیدہ دلیری اور ہمت سے بیحد متاثر ہوا اور داروغہ سے کہا کہ انہیں لے جاؤ اور اگر یہ قید خانے سے متصل اصطبل کے صحن میں گھومنا پھرنا چاہیں تو انہیں اجازت ہے، پھر داروغہ کے کان میں سرگوشی کے سے انداز میں آہستہ سے کہا کہ پہرا کڑا رکھنا کیونکہ یہ بہت اہم لیکن خطرناک اور بہادر لوگ ہیں کہیں فرار نہ ہو جائیں۔ دوستین نے حاکم ہڑند کی یہ باتیں سن لی لہٰذا اس نے بلند آواز میں کہا کہ اطمینان رکھیے ہم جب تک آپ کی قید میں ہیں قیدی ہی رہیں گے اور اگر جانا ہوا تو آپ کی اجازت سے قید خانے سے نکلیں گے۔ ہم بزدلوں کی طرح فرار نہیں ہوں گے۔ چوری چھپے فرار ہونے میں ہماری ہی بے عزتی ہے۔ اس طرح دوستین اور جلمب کو حالت قید میں تھوڑی سی رعایت مل گئی۔

دوسری طرف دوستین کے علاقے میں حالات اس کے لیے ناموافق ہوتے گئے۔ جوں جوں اس کی قید کی مدت میں اضافہ ہوتا گیا اس کے قبیلہ کے لوگ اس کی طرف سے مایوس ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ بعض ناعاقبت اندیشوں نے اس کی موت تک کی افواہ پھیلا دی۔ شیموں اور شیریں ہی دو ہستیاں تھیں کہ جنہیں دوستین اور جلمب کے زندہ ہونے کا یقین تھا اور وہ دوسروں کو بھی سمجھاتے تھے کہ وہ دونوں ہڑند کے قید خانے میں بند ہیں اور بہت جلد وہاں سے چھوٹ کر آنے والے ہیں۔ مگر کوئی ان کی بات پر یقین کرنے والا نہ تھا۔ شیریں نے اپنی شاعری میں دوستین سے فراق اور جدائی کے ان لمحات کی وہ منظر کشی کی ہے کہ جو دورِ حاضرہ کے شعراء کے لیے بھی مثال اور نمونہ کی مانند ہے۔ شیریں کے ان لمحات کی شاعری بلاشبہ بلوچی ادب کے لیے بہت بڑا تحفہ ہے اور یقیناً ان کی شاعری میں فراق، جدائی، غم واندوہ، تکلیف قلب وروح، انتظار اور بے قراری کی وہ کیفیت نظر آتی ہے کہ صدیاں گزرنے کے باوجود اس شاعری کو پڑھنے والا اب بھی اپنے اندر وہ بے چینی اور بے قراری محسوس کرنے لگتا ہے جس

کیفیت کا سامنا شیریں کو کرنا پڑا تھا۔ اگر مناسب ہوا تو اس داستان کے آخر میں شیریں اور دوستین کے کلام کا کچھ حصہ شامل کیا جائے گا۔ بہر حال شیریں کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی مگر وہ روز شیموں کے پاس آتی، اس کے کام کرتی اور اس کو یقین و دلاسہ دیتی کہ اس کا بھائی زندہ ہے اور اس نے اسے خواب میں دیکھا ہے، وہ بہت جلد قید خانے سے رہا ہونے والا ہے اور چھوٹ کر آنے والا ہے۔ شیریں کی ان باتوں سے بھولے بھالے شیموں کی ڈھارس بندھتی اور اسے حوصلہ ملتا۔ مگر آخر کب تک میر لال خان رند دوستین کی واپسی کا انتظار کرتا، وہ دل ہی دل میں سوچتا کہ، انہیں قید ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں اور ان کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں چل رہا کہ وہ کس حال میں ہیں البتہ یہ افواہ زیادہ پھیلی ہوئی ہے کہ حاکم ہڑند نے انہیں قتل کر دیا ہے، لہٰذا یہ روح فرسا خبر لال خان سمیت دیگر قبائلی باشندوں کے لیے بھی بڑی اندوہناک اور افسوسناک تھی مگر اس خبر کی حقیقت واضح نہیں تھی صرف ایک افواہ تھی جو پھیلائی گئی تھی لہٰذا لوگ بھی گومگوں کی کیفیت میں تھے۔ لال خان نے کچھ عرصہ مزید انتظار کیا مگر دوستین اور جلمب کا کوئی اتا پتا نہ ملا لہٰذا برادری والوں کے دباؤ میں آ کر یا شیریں کی عمر کو دیکھتے ہوئے میر لال خان نے اس کی کہیں اور شادی کرنے کا ارادہ کیا اور اس مقصد کے لیے کوئی معقول رشتہ کا انتظار کرنے لگا۔ جب شیریں کو اپنے والد کے اس فیصلے کی بھنک پڑی تو وہ بہت روئی، فریادیں کیں، چیخی چلائی، پُردرد اشعار کہے، والدین کو دوستین کے زندہ ہونے کا یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی، مگر سب بے سود۔ اس کے والدین نے اس کی ایک نہ مانی اور ایک معقول جگہ دیکھ کر اس کی نسبت وہاں طے کر دی۔ حسنِ اتفاق کہ جس لڑکے سے اس کی نسبت طے ہوئی تھی اس کا نام بھی دوستین تھا مگر اس میں دوستین والی کوئی بھی خوبی نہیں تھی۔ نہ تو وہ بہادر اور مرد میدان تھا اور نہ ہی اچھا شمشیر زن اور شاہسوار تھا، وہ نہ تو شاعر تھا اور نہ ہی اس کا کوئی ادبی و رومانوی ذوق تھا۔ شیریں کا دوست تو لاجواب اور لاکھوں میں ایک تھا۔ وہ تو آسمان کے ستاروں کی طرح نایاب تھا، بڑے بڑے بہادر اور شجاع اس کے سامنے ہیچ تھے، اچھے سے اچھا شاہسوار بھی اس کے گھوڑے کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا تھا، منہ زور اور شریر سے شریر گھوڑا بھی اس کی شاہسواری کے سامنے بچھ جاتا تھا، دوستین تو دوستین تھا، مگر یہ دوستین شیریں کے لیے ایک ولن کی حیثیت رکھتا تھا جو دو محبت کرنے والوں کے بیچ میں آ گیا تھا اور دو زندگیاں برباد کرنے

پر تُلا ہوا تھا۔

دوسری طرف قید خانے میں بند دوستین اور جلمب کو جب حاکم نے تھوڑی سی رعایت دی تو وہ اصطبل میں آ کر گھوڑوں کو دیکھنے میں اپنا زیادہ وقت گزارنے لگے۔ ایک دن ایک منہ زور گھوڑا اصطبل میں لایا گیا جو کسی بھی طرح سے قابو میں نہیں آ رہا تھا اور اس نے کئی لوگوں کو زخمی بھی کر دیا تھا۔ جب اس نے داروغہ پر بھی حملہ کیا تو بہادر و شجاع دوستین نے فوراً اس گھوڑے کی ایال پکڑ لی اور اسے پیار سے پچکار پچکار کر معمول پر لانے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد گھوڑے کا غصہ اُتر چکا تھا اور وہ پُرسکون ہو گیا تھا۔ دوستین نے داروغہ کو سنبھالتے ہوئے کہا جناب داروغہ جی! کوئی چوٹ تو نہیں لگی۔ داروغہ نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آج تو میری جان گئی تھی اگر آپ نہ ہوتے۔ اس گھوڑے نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی آپ تو رحمت کا فرشتہ بن کر آ گئے اور میری زندگی بچائی۔ انشاءاللہ اگر کبھی موقع آیا تو میں آپ لوگوں کے کام ضرور آؤں گا۔ دوستین نے اس کے تعاون کا شکریہ ادا کیا۔ اس طرح داروغہ کے ساتھ دوستین کی دوستی ہو گئی اور وہ دن کا زیادہ حصہ اصطبل میں دارغہ کے ساتھ گھوڑوں کی دیکھ بھال میں گزارتا اور گھوڑوں کی نگہداشت اور خیال داری میں اصطبل والوں اور داروغہ جی کا ہاتھ بٹاتا۔ جلمب بھی اس کام میں بھرپور طریقہ سے شامل ہوتا اور وہ بھی دوستین کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ ایک دن جلمب نے ایک کاغذ کا ٹکڑا لا کر دوستین کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ دیکھو کسی فقیر نے یہ کاغذ دروازے کے جھروکے سے اندر پھینکا ہے، میں نے اسے دیکھ لیا تھا وہ فقیر تھا یا پھر فقیر کے لبادے میں تھا، مگر میں اسے نہیں پڑھ سکتا آپ پڑھ کر سنا دو کہ اس میں کیا لکھا ہے اور یہ کس نے بھیجا ہے۔ دوستین نے فوراً اس کے ہاتھ سے وہ کاغذ لے لیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اندھیرے میں وہ صحیح طرح اسے دیکھ نہیں پا رہا تھا، اور جب آنکھیں اسے پڑھنے کے قابل ہو گئیں تو اس نے ایک دم اس کاغذ کو بند کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو شیریں کا نامہ ہے اور تم جانتے ہو کہ میں شیریں کا نامہ کسی کے سامنے نہیں پڑھتا۔ جلمب سمجھ گیا اور وہ کمرے کے دوسرے کونے میں چلا گیا جبکہ دوستین اپنی محبوبہ اور منگیتر شیریں کا نامہ محبت پڑھنے میں منہمک ہوا۔

اگلے دن اس نے داروغہ کو کہا کہ وہ ہمارے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے تو داروغہ نے کہا

کہ آپ نے میری جان بچائی ہے میں آپ کے لیے جان کی بازی لگا سکتا ہوں۔ جلمب فوراً بول پڑا کہ ہمیں آج رات کی تاریکی میں دو تیز رفتار گھوڑے چاہیے اور ہمیں آپ حفاظت کے ساتھ قلعہ سے باہر نکالیے۔ آگے ہمارا کام ہے۔ داروغہ نے کہا کہ اس کام کے لیے بہت بہادری اور ہمت کی ضرورت ہے، ممکن ہے کہ کسی سے مقابلہ کرنا پڑے یا شاہی افواج آپ کا پیچھا کریں۔ جلمب نے کہا کہ وہ ہم دیکھ لیں گے آپ البتہ ہمارے لیے دو تیز رفتار گھوڑوں کا بندوبست کریں۔ مگر دوستین جوان کی گفتگو سُن رہا تھا، بول پڑا: کہ داروغہ صاحب ہم یہاں سے فرار نہیں ہو رہے ہیں اور نہ ہی ہمیں تیز رفتار گھوڑوں کی ضرورت ہے، لیکن جلمب نے ایک دم مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ دوستین جب ہمیں یہاں سے فرار ہونے اور اپنے وطن جانے کا موقع مل رہا ہے تو آپ کیوں اس موقع کو گنوانا چاہتے ہیں۔ دوستین نے جلمب کو جواب دیا کہ میں نے حاکم کو زبان دی ہے کہ میں قید خانے سے فرار نہیں ہوں گا۔ جلمب نے کہا کہ زبان آپ نے دی ہے میں نے نہیں، میں تو یہاں سے نکلوں گا۔ دوستین نے داروغہ سے کہا کہ مجھے ایک خنجر لا کر دیدیں، جلمب کو گھوڑا دے دیں تاکہ وہ فرار ہو سکے۔ جلمب نے جھلاتے ہوئے کہا کہ بس میں بھی اکیلا فرار نہیں ہوں گا۔ دوستین اس کی حالت دیکھ کر ہنسنے لگا اور کہا کہ دل کو بڑا رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ادھر شیریں کی ایک سہیلی آئی جس کا نام نور بانو تھا۔ نور بانو شیریں کے پاس آئی اور اس سے گپ شپ کرنے لگی۔ شیریں بہت اداس تھی۔ نوری نے اس سے استفہامیہ انداز میں پوچھا کہ سُنا ہے کہ تمہاری شادی طے ہوگئی ہے اور تیرے نئے منسوب کا نام بھی دوستین ہے۔ شیریں ایک دم رونے لگی اور اس کا دل بھر آیا۔ نوری نے فوراً اسے اپنے گلے لگاتے اور بھنیچتے ہوئے کہا: شیریں میرا مقصد آپ کی دل آزاری ہرگز نہیں تھی، میں تو آپ کا غم غلط کرنے آئی تھی تاکہ آپ کے دل کا بوجھ ہلکا کرسکوں۔ شیریں پہلی بار مایوس سی ہوگئی تھی اور کہنے لگی کہ میرا دوستین اگر زندہ ہوتا تو میرے پیغام کے بعد اب تک قید خانے کی دیواریں گرا کر پہنچ چکا ہوتا۔ اس کو کوئی فوج روک نہ پاتی، اور نہ ہی کسی طوفان کے بس میں تھا کہ اس کا راستہ روک سکتا۔ مگر اب تو میں بھی اس کی زندگی سے مایوس ہوتی جا رہی ہوں، مگر وہ میرے اندر ہمیشہ زندہ رہے گا، میں نئے دوستین کو کبھی بھی قبول نہیں کر پاؤں گی، یہ کہہ کر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ نور بانو نے

اسے امید اور دلاسہ دیتے ہوئے کہا کہ اللہ پر توکل رکھو شیریں تمہارا دوستین زندہ ہے اور وہ تمہاری شادی سے پہلے آئے گا اور وہی تم سے بیاہ کرے گا۔ دوستین ہی تمہارا رفیقِ حیات بنے گا بس اللہ پر بھروسہ رکھو اور نیک دعائیں مانگو انشاء اللہ تمہارا دوستین تمہیں ضرور ملے گا۔ نور بانو شیریں کی یہ حالت دیکھ کر تڑپ اٹھی تھی اور روتی ہوئی اس نے شیریں کو دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ دونوں رو رہے تھے اور ماحول انتہائی افسردہ اور گھمبیر سا ہو گیا تھا۔

حاکم ہڑند نے لاکھ کوشش کی کہ دوستین اس کی حمایت اور اطاعت قبول کرے اور اس کا ساتھی بن جائے مگر دوستین اپنی ضد پر اڑا رہا اور حاکم کو ہر بار انکار میں ہی جواب دیتا رہا۔ بالآخر حاکم نے اسے قتل کرنے کا مصمم ارادہ کیا اور یہ کام اپنے وزیر کو سپرد کیا۔ اس نے وزیر سے کہا کہ عید قریب آ رہی ہے عین عید کے دن گھوڑ دوڑ کے مقابلے کا اہتمام کیا جائے۔ اس مقابلے میں دوستین کو کسی منہ زور گھوڑی پر بٹھایا جائے، جب وہ گھوڑی لے کر آگے نکل جائے تو تمہارے پہلے سے متعین کردہ دو سپاہی اس کے ساتھ ساتھ گھوڑا دوڑاتے ہوئے آگے جا کر اسے قتل کر دیں اور ایک سپاہی پیچھے سے اس کو گھوڑے سے گرتے وقت اپنے گھوڑے کے سموں تلے روند ڈالے۔ اس طرح اس سرکش بلوچ سردار کا خاتمہ ہو جائے گا اور میرا ایک بڑا دشمن راستے سے ہٹ جائے گا۔ وزیر نے حاکم کے حکم کے سامنے سر جھکاتے ہوئے کہا کہ جو آپ کا حکم ہے ایسا ہی ہو گا حضور۔

اس کے بعد آخری بار حاکم نے دوستین کا بلایا اور کہا کہ تمہاری شاہسواری کا امتحان مقصود ہے۔ عید کے دن، ہم نے ایک مقابلے کا اہتمام کیا ہے جس میں مشہور شاہسوار اپنے اپنے گھوڑے دوڑائیں گے، ہم چاہتے ہیں کہ ہماری گھوڑی آپ جیسے عظیم شاہسوار کے ہمرکاب ہو۔ اگر آپ یہ مقابلہ جیت گئے تو میں آپ کی ہر خواہش پوری کروں گا۔ دوستین نے اس مقابلے میں حصہ لینے کی حامی بھر لی۔ جامب کو بھی مقابلے میں شامل کیا گیا۔ دوستین کو کسی طرح اس بات کا علم ہو گیا کہ دراصل حاکم ہڑند اسے اس مقابلے کی آڑ میں قتل کرنا چاہتا ہے کیونکہ اُس نے اس کی کسی بھی بات پر سرِ خم نہیں کیا اور نہ اس کی اطاعت کرنے پر راضی ہوا۔ لہٰذا اب حاکم اُس سے ناراض ہے مگر بلوچوں کے ساتھ تصادم کے خوف سے وہ دوستین کو براہ راست قتل کرنے سے ڈرتا ہے لہٰذا اس سازش کے تحت وہ اسے ختم کر کے یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ دوستین کو

اس نے آزاد کر دیا تھا وہ تو گھڑ دوڑ کے مقابلے میں گھوڑے سے گر کر ہلاک ہوا۔ دوستین حاکم کی اس سازش کو بھانپ گیا اور اب اس کی قید سے اسی کی گھوڑی اور ہتھیار (داروغہ کا دیا ہوا خنجر) کے ساتھ کھلے میدان سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ وہ ویسے بھی اب اس قید سے رہائی حاصل کرنا چاہتا تھا اور موقع کی تلاش میں تھا کیونکہ شیریں نے اسے خط میں اپنے والد کے ارادوں اور شادی کی تاریخ طے ہونے سے آگاہ کر دیا تھا۔ لہٰذا اب وہ ہر قیمت پر اپنی شیریں کے پاس پہنچنا چاہتا تھا چاہے اس کے لیے اسے جو بھی قیمت ادا کرنی پڑتی۔

عید کے دن اس نے فرار کے منصوبے کو حتمی شکل دی اور جلمب سے سارے منصوبے کو خفیہ رکھا تاکہ وہ اپنی جلد بازی کی وجہ سے کچھ غلط نہ کر بیٹھے۔ مقابلہ شروع ہونے سے کچھ دیر قبل اس نے جلمب سے کہا کہ اپنا گھوڑا میرے ساتھ ساتھ رکھنا اور جب میں اشارہ کروں تو اپنے گھوڑے کو چھوڑ کر اور کُود کر میرے پیچھے بیٹھ جانا۔ جلمب بڑا حیران ہوا اور پوچھا اس میں کیا مصلحت ہے تو دوستین نے کہا کہ جو میں کہہ رہا ہوں بس اسی طرح کرتے جاؤ کیا تم اپنے گھر نہیں جانا چاہتے۔ جلمب ایک دم ساکت ہوا اور تھوڑی دیر بعد اس نے مسکرا کر دوستین کی طرف دیکھا اور کہا کہ مجھے پتہ ہے کہ تمہاری عقل و دانش بہت زیادہ ہے اور یقیناً آپ نے جو بھی سوچا ہوگا، بہتر ہی سوچا ہوگا، لہٰذا میں ویسے ہی کروں گا جیسا آپ کہیں گے۔

مقابلے کے لیے شہر سے باہر ایک بڑے اور کھلے میدان کا انتخاب کیا گیا جو بہت آگے جا کر پہاڑوں کے ساتھ منسلک ہو جاتا تھا۔ عید کا دن تھا لہٰذا پورا شہر اس مقابلے کو دیکھنے کے لیے اُمڈ آیا تھا اور میدان میں جہاں جہاں لوگوں کے کھڑے رہنے یا بیٹھنے کی جگہیں مختص تھیں وہاں لوگوں کا اژدھام تھا اور اتنا شور و غل تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بادشاہ کے سپاہی اور دیگر منتظمین میدان کے حالات اور گھڑ دوڑ کے انتظامات سنبھالنے میں مصروف تھے اور ہر ایک اپنا کام انتہائی چابک دستی کے ساتھ کر رہا تھا۔ جہاں سے گھڑ دوڑ کا آغاز ہونا تھا وہاں مخصوص نشانات لگائے گئے اور گھڑ سواروں کے گھوڑوں کے لیے جگہیں مخصوص کی گئیں۔ تماشائیوں کو گھڑ دوڑ کے حدود سے کافی دور روکا گیا تاکہ کوئی ناخوشگوار واقعہ ہونے کی صورت میں ان کا نقصان نہ ہو۔ شور و غل ابھی تک جاری تھا جس کا مطلب تھا کہ حاکم شہر ابھی تک نہیں پہنچا اور نہ ہی نقیبوں نے اب تک اس کے آمد کی کوئی اطلاع دی تھی لہٰذا تماشائی خوب

شور مچا رہے تھے اور پورا میدان سر پر اٹھا رکھا تھا۔

اتنے میں نقیب نے حاکم ہڑند کے آنے کا اعلان کیا اس کے ساتھ ہی میدان میں جاری شور وغل آہستہ آہستہ تھمتا گیا اور پھر حاکم اور اس کے وزرا امرا اور دیگر افسران آ گئے، حاکم نے اپنی نشست سنبھالی اور تھوڑے سے توقف کے بعد وزیر اعظم کو بلا کر پوچھا کہ بندوبست کیسا ہے؟ اس کا مقصد دوستین اور جلمب کو مار ڈالنے کے بندوبست کے بارے میں آگاہ ہونا تھا۔ خادم الملک وزیر نے فوراً جواب دیا کہ حضور سب بندوبست اچھے اور بہتر انداز میں ہو چکے ہیں۔ پھر اس نے حاکم کے کان میں آہستہ سے کہا: حضور میرے دو ماہر شمشیر زن اور شاہسوار دوستین کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، میں نے ان کو اچھی طرح سے سمجھا بجھا دیا ہے کہ ایک دوستین کے ساتھ ساتھ رہے گا اور موقع ملتے ہی اسے گھوڑے سے گرا دے گا جبکہ پیچھے پیچھے آنے والا سوار اسے اپنے گھوڑے کے سموں تلے کچل دے گا۔ حاکم نے وزیر کی بات سن کر خوش ہوتے ہوئے کہا کہ وزیر اعظم تم بہت ہوشیار اور ذمہ دار انسان ہو، اس ذمہ داری کو بہ طریقِ احسن انجام دینے کے بعد تم انعام کے حقدار ہو۔ وزیر نے خوش ہوتے ہی ذرا پیچھے ہٹ کر سر خم کرتے ہوئے کہا کہ حضور کی ہر بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے آپ کی خوشنودی ہی زندگی کا مقصد ہے۔ حاکم نے وزیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ پھر کھیل شروع کر دیں۔ جی حضور سب آپ ہی کے اشارے کے منتظر ہیں۔

حاکم ہڑند نے اٹھ کر کسی مخصوص اشارے سے گھڑ دوڑ کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ہی میدان میں کھڑے شاہسواروں نے اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑا دیے۔ کئی گھوڑوں کے دوڑنے سے زمین لرزنے لگی اور ان کے شور سے میدان میں کھڑے تماشائی بھی محظوظ ہونے لگے۔ اور ان کا شور وغل ایک بار پھر بلند ہوا۔ اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز تک سنائی نہیں دیتی تھی۔ جلمب اور دوستین کے گھوڑے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے اور دوستین جان بوجھ کر گھوڑے کو ذرا آہستہ کیے ہوئے تھا تا کہ وہ جلمب کو پیچھے نہ چھوڑ دے۔ اس کے بائیں جانب ایک سوار اس کے گھوڑے کی ٹاپوں سے ٹاپیں ملا کر سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا جبکہ دوستین کے پیچھے تھوڑے سے فاصلے پر ایک اور سوار بالکل انہی کی رفتار سے ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا جبکہ باقی سوار ان سے کافی پیچھے تھے۔ دوستین پورے ہوش وحواس اور ہوشیاری

کے ساتھ جلمب اور ان دو سواروں کی جانب توجہ کیے ہوئے تھا اور اپنے گھوڑے کی راس (لگام) بھی سنبھالی ہوئی تھی۔ میدان میں کافی آگے نکل جانے کے بعد دوستین کے بائیں جانب والا سوار اس کے ذرا قریب آنے لگا جبکہ پیچھے والے سوار کے منہ سے بھی مخصوص آوازیں نکلنے لگیں۔ دوستین ایک دم تیار ہو کر بیٹھا اور اس سے پہلے کہ اس کے بائیں جانب والا سوار اسے دھکہ دیتا، اس نے اس سے پہلے ہی اسے اس کے گھوڑے سے اچک لیا اور اسے داروغہ کے دیے ہوئے خنجر سے ایک کاری ضرب لگا کر پھینک دیا، یہ زخمی سوار پیچھے آنے والے گھوڑوں کے سموں تلے کچل گیا جبکہ اسی دوران دوستین نے جلمب کو اشارہ کیا اور وہ فوراً اپنا گھوڑا چھوڑ کر چلتے گھوڑے سے دوستین کی گھوڑی پر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ پچھلے سوار نے جو یہ صورتحال دیکھی تو اس نے گھوڑا آگے بڑھا کر ان پر حملہ کرنا چاہا مگر اس کے قریب آتے ہی دوستین نے اس پر بھی خنجر کا ایک خوفناک اور اچانک وار کیا اور خنجر اس کے پہلو میں گھونپ دیا۔ سوار اپنے گھوڑے سے گر پڑا اور پیچھے آنے والے سواروں کے سموں تلے کچل گیا۔ اس کے بعد دوستین نے جلمب سے کہا کہ تیار رہنا ہم فرار ہو رہے ہیں یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو سامنے کی پہاڑیوں کی جانب سرپٹ چھوڑ دیا۔

وزیر بھاگتا ہوا حاکم ہڑند کے پاس پہنچا اور بوکھلائے ہوئے انداز میں بول پڑا: حضور وہ چلا گیا، وہ بھاگ گیا، اس نے میرے شاہسواروں کو مار ڈالا اور اپنے ساتھی کو لے کر فرار ہو گیا۔ بدحواسی میں وزیر بولتا ہی چلا جا رہا تھا اور حاکم ہڑند حیرت اور غصے سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے غصیلی انداز میں غضبناک آنکھوں کے ساتھ وزیر کی جانب دیکھا اور تحکمانہ انداز میں کہا کہ: کیا بک رہے ہو؟ کون بھاگا؟ کون سے آدمی مارے گئے؟ کون اپنے کس ساتھی کو لے کر بھاگا؟ صحیح کہو کیوں اتنے بوکھلائے ہوئے ہو؟

وزیر نے روہانسی سے لہجے میں کہا حضور دوستین اور اس کا ساتھی فرار ہو گئے ہیں۔ اس نے میرے دونوں سواروں کو مار ڈالا اور اپنے ساتھی کو لے کر پہاڑی علاقوں کی جانب نکل گیا ہے۔ حاکم ہڑند ایک دم غیض و غضب کی حالت میں اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور وزیر کو بُرا بھلا کہنے لگا اور اسے حکم دیا کہ فوراً ان کو تلاش کر کے گرفتار کر لو اور ہمارے سامنے حاضر کر دو ورنہ تمہاری کھال کھینچ لوں گا۔

دوستین جلمب کو اپنے پیچھے بٹھائے حاکم ہڑند کی تیز رفتار گھوڑی کو ہوا کی رفتار سے دوڑاتا ہوا پہاڑوں کی جانب بڑھ رہا تھا۔ حاکم کے سپاہی بھی اس کی تلاش میں نکل پڑے۔ مگر اب صبا رفتار گھوڑے پر اپنے وقت کے سب سے بڑے شاہسوار کو پکڑنا ان کرائے کے سپاہیوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ دوستین ان سے نکل چکا تھا مگر حاکم کی سزا اور موت کے ڈر سے یہ سپاہی پہاڑی دروں میں داخل ہو گئے۔ میدانوں کے عادی کرائے کے سپاہیوں کی بڑی تعداد ان دروں میں پھنس کر اور بھوک پیاس سے مر گئی یا ان کے گھوڑے گر پڑے جس سے ان کی موت واقع ہوئی، بہر حال ان کی بڑی تعداد موت سے ہمکنار ہوئی اور بہت کم کو بچ کر واپس جانا نصیب ہوا۔

دوستین اور جلمب جب اپنے گاؤں پہنچے تو وہ سیدھے دوستین کے گھر آئے۔ شیموں اپنے گھر کے صحن میں کھڑا رو رہا تھا اور شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے۔ وہ دو گھڑسواروں کو اپنے گھر کے صحن میں داخل ہوتے دیکھ کر گھبرا گیا اور ایک دم پوچھا کہ کون ہو؟ دوستین اور جلمب کے حلیے گذشتہ کئی برسوں کی قید میں اتنے تبدیل ہو چکے تھے کہ شیموں بھی ان کو نہ پہچان سکا۔ دوستین نے گھوڑے سے اتر کر اس کی لگام ہاتھ میں پکڑے شیموں کی طرف آیا اور بھولے بھالے سیدھے سادھے چھوٹے بھائی سے پوچھا کہ چھوٹے تم کیوں رو رہے ہو؟ اس پر بھولے بھالے شیموں نے کہا کہ میرا بھائی دوستین ابھی تک نہیں آیا، وہ ہڑند کے بادشاہ کی قید میں ہے اور یہاں اس کے منگیتر کی شادی کسی اور سے ہو رہی ہے جو میرے لیے کسی عذاب سے کم نہیں۔ یہ کہہ کر شیموں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اسے روتے دیکھ کر دوستین اور جلمب کی بھی آنکھیں بھر آئیں اور اس نے اپنے بھائی سے کہا کہ شیموں دوستین آ گیا ہے اب نہ تم کبھی روؤ گے اور نہ کوئی تمہاری بھابھی کو تم سے لے جائے گا۔ شیموں نے تڑپ کر اس اجنبی کی جانب دیکھا اور کہا آپ کتنے اچھے انسان ہو، یہاں سب کہتے ہیں کہ حاکم ہڑند نے میرے بھائی کو مار ڈالا ہے مگر صرف مجھے اور میری بھابھی شیریں کو یقین ہے کہ میرا بھائی اور اس کا منگیتر دوستین زندہ ہے اور وہ کسی نہ کسی دن قید سے چھوٹ کر ضرور آئے گا۔ پھر شیموں رونے لگا کہ میرا بھائی کب آئے گا جبکہ آج شیریں کا نکاح ہے اور اب تک سب لوگ جمع ہو چکے ہوں گے اور نکاح کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔ میرا بھائی کب آئے گا جبکہ میری بھابھی

تھوڑی دیر میں کسی اور کی ہونے والی ہے۔ اس پر دوستین نے شیموں کو گلے لگاتے ہوئے کہا کہ میں دوستین ہوں شیموں اور یہ جلمب ہے، ہم قید خانے سے چھوٹ کر آ گئے ہیں۔ شیموں ہکا بکا ہو کر سکتے کی سی حالت میں اپنے بھائی کی جانب دیکھنے لگا اور اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ اور پھر ایک چیخ مار کر دوستین کہہ کر اپنے بھائی کے ساتھ لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ کافی دیر تک اپنے بھائی کے ساتھ لپٹا رہا اور دوستین بھی روتے ہوئے اسے پچکارتا رہا۔ اس کے بعد شیموں سنبھل گیا اور جلمب سے گلے ملا اور پھر اپنے بھائی سے بولا کہ ممکن ہے کہ نکاح کی رسم شروع ہو گئی ہو لہٰذا ہمیں جلد از جلد میر لال خان کے گھر جانا چاہیے۔ دوستن نے شیموں کو وہیں چھوڑا اور جلمب کو لے کر میر لال خان کے گھر گیا۔ نکاح کی رسم شروع ہونے ہی والی تھی اور میر لال خان مولوی صاحب (نکاح خواں) کو کہنے ہی والا تھا کہ مولوی صاحب نکاح پڑھانا شروع کرو کہ اسی وقت دوستین اور جلمب فقیروں اور ملنگوں کے حلیے میں اس جگہ پہنچے جہاں نکاح کی رسم ادا ہونے والی تھی اور دوستین نے میر لال خان سے درخواست کی کہ وہ ایک فقیر اور لوڑی (گویا) ہے اور نکاح سے پہلے کچھ گانا چاہتا ہے تاکہ آپ لوگوں کی خوشیوں میں وہ بھی شامل ہو سکے۔ لوگوں نے اسے ڈانٹنا شروع کیا اور دولہا نے بھی میر لال خان سے کہا کہ اب جبکہ نکاح ہونے والا ہے اس گویے سے گانا سننے کی کیا ضروت ہے؟ مگر لال خان نے کہا کہ نہیں یہ ایک ضرورت مند فقیر ہے اور میری بیٹی کی شادی ہے۔ یہ ہماری خوشیوں میں شامل ہونے کے لیے آیا ہوا ہے لہٰذا اسے گانے کا موقع دینا چاہیے۔ یہ کہہ کر اس نے دوستین سے کہا کہ وہ اپنا شوق پورا کرے۔

دوستین نے اپنا طنبورہ اٹھایا اور اس پر وہ گیت گانا شروع کیا جو قید خانے میں شیریں نے اسے بھیجا تھا۔ اس کی آواز لحہ بہ لحہ بلند ہو رہی تھی اور اندر خواتین کے مابین بیٹھی ہوئی شیریں کے کانوں میں دوستین کی آواز پڑی اور اس نے اپنے اشعار سنے تو ایک دم سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور زور سے چیخ پڑی کہ دوستین آ گیا ہے دوستین آ گیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ بے ہوش ہو گئی۔ کمرے میں بیٹھی ہوئی خواتین شیریں کی یہ کیفیت دیکھ کر گھبرا گئیں اور پریشانی کے عالم میں اس کے والد کو سارا ماجرا سنایا۔ شیریں کا والد شیریں کو دیکھنے کے بعد فوراً وہاں پہنچا جہاں دوستین گیت گا رہا تھا۔ اس نے غور سے دوستین کی جانب دیکھا اور بالآخر

اسے پہچان لیا۔ حاضرین محفل نے بھی دوستین کو پہچان لیا اور سب نے آگے بڑھ بڑھ کر اسے اور جلمب کو گلے لگایا اور رہائی کی مبارکباد دی۔ دولہا جس نام بھی دوستین تھا، نے انتہائی فراخ دلی کے ساتھ کہا کہ اب جبکہ ہمارا ہیرو جوانمرد دوستین خود آ چکا ہے تو اس کا نکاح اسی محفل میں شیریں کے ساتھ پڑھا جائے۔

اس طرح دوستین کی محبت کے اس داستان کا اختتام بالآخر دونوں کے انتہائی ڈرامائی انداز میں ملاپ پر ختم ہوا اور دونوں کی شادی ہوگئی اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔ یہ سچی کہانی بلوچ تاریخ، زبان اور ادب کے لیے بہت بڑا تحفہ ہے اور بہت کم اقوام ایسے ہوں گے کہ جن کی تاریخ اور ادب میں ایسے عجوبہ واقعات ہوں گے۔

شہداد و مہناز:

بلوچی عشقیہ اور رومانوی داستانوں کو پڑھنے کے بعد یہ بات شنید میں آتی ہے کہ ان لوک داستانوں اور رومانوی کہانیوں میں سے اکثر رند و لاشار یونین کے عہد میں پیش آئے ہیں اور بلوچی زبان و ادب کا حصہ بنے ہیں۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ خود رند اور لاشاری سردار اور معتبرین میں سے بعض ان عشقیہ داستانوں کے کردار رہے ہیں۔ میر چاکر اور حانی، میر گواہرام لاشاری اور گوہر جتنی، میر بیورغ و گراں ناز، دوستین و شیریں، حسن شلی، بیورغ وسدو، بیورغ و ملی وغیرہ کی لوسٹوری۔ یہ ایسی کہانیاں ہیں کہ جو زیادہ تر پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی کے اس کلاسیکی دور کی یادگاریں ہیں جن کی وجہ سے بلوچی زبان، ادب اور ثقافت کو مضبوط اور اہم بنیادیں فراہم ہوئیں۔ آج بلوچی زبان کی منظوم ادب کی امارت کی وجہ اسی رند و لاشار عہد کی شاعری سمجھی جاتی ہے کہ جن پر بلاشبہ بلوچ قوم اور ان کا ادب نازاں و فرحاں ہے۔

ایسی ہی محبت بھری کہانیوں میں ایک اہم ترین اور مشہور و معروف کہانی میر چاکر خان رند کے بیٹے شہداد اور مہناز کی ہے۔ اس کہانی کو بھی بلوچی زبان و ادب اور ثقافت میں اہم مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ اس کہانی کے دونوں کردار بھی بنیادی طور پر شاعر ہیں اور ان کی شاعری بلوچی کے اہم اثاثوں میں شمار ہوتی ہے۔ رند عہد کی اکثر شاعری کو سب سے پہلے ایک انگریز مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز نے جمع کیا اور 1907ء میں اس کو دی پاپولر پوئیٹری آف بلوچز

کے عنوان سے شائع کروایا۔ جسے بعدازاں 1977ء میں بلوچی اکیڈمی نے دوبارہ اسی نام سے شائع کیا۔اب اس کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہو چکا ہے۔علاوہ ازیں ممتاز بلوچ ادیب و مورخ محمد سردار خان بلوچ نے بھی دو جلدوں میں اے لٹریری ہسٹری آف بلوچز کے عنوان سے بلوچی قدیم شاعری کے ایک بڑے حصے کو بلوچی اور انگریزی زبانوں میں بلوچی اکیڈمی کی جانب سے شائع کیا۔اس سلسلے میں میر شیر محمد مری، میر مٹھا خان مری، جان محمد دشتی وغیرہ نے بھی کامیاب کاوشیں کی ہیں اور اس عہد کی شاعری کے بڑے حصے کو جمع کیا ہے اور اپنی ان کاوشوں کو کتابی شکل دی ہے۔ان تمام کتابوں میں دیگر شعرا کے ساتھ ساتھ شہداد اور مہناز کی شاعری بھی شامل ہے کہ جن سے ان کی محبت بھری داستان پر خوب روشنی پڑتی ہے۔

اس شاعری کے مطابق میر چاکر کا ایک خوبصورت اور لاڈلہ بیٹا تھا جس کا نام شہداد تھا۔تاریخ ملتان میں شہداد کے علاوہ میر چاکر خان رند کے ایک اور بیٹے اللہ داد کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ (قادری (سال اشاعت ندارد): 162,163) میر چاکر خان کو اپنے بیٹے شہداد سے بے حد محبت تھی اور وہ ہمیشہ اسے اپنے ساتھ ساتھ رکھتا تھا کیونکہ وہ اسے آداب دنیاداری اور سلیقہ سرداری و حاکمیت سکھانا چاہتا تھا۔شہداد بھی سارے قبیلے کو بڑا پیارا تھا اور سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔بعض مستند بیانات کے مطابق شہداد کی منگنی بچپن ہی میں ایک اور بلوچ قبیلہ نوحانی کے ایک خاندان کی کسی خوبصورت و حسین و جمیل اور دلربا و رعنا سی لڑکی مہناز کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہ دونوں ہی بلوچی زبان کے مشہور و معروف شعرا میں شمار ہوتے ہیں مگر مہناز کی شاعری بہت بلند درجے کی ہے اور بلوچی زبان کی بہترین شاعری میں شمار ہوتی ہے۔مہناز کی شاعری نے بلوچی زبان و ادب کو بڑی تقویت دی ہے اور سولہویں صدی عیسوی میں ایک بلوچ خاتون کی شاعری سے اس قوم کی وسیع النظری، ادبی ذوق، خواتین کا معاشرے میں کردار اور کئی دیگر اہم باتوں پر روشنی ڈالتی ہے، ایسی باتیں کہ جو دورِ حاضرہ کی بعض ترقی پسند اقوام میں بھی نظر نہیں آتی ہیں اور خواتین کے حقوق کے بعض دعویدار اقوام بلوچوں کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ وہ مہذب نہیں ہیں تو صرف مہناز کی شاعری ہی انہیں سنا دی جائے تو ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے اس طویل شاعری کے محض چند اشعار ہی کافی ہوں گے۔

ایک محقق کہتا ہے کہ:

''مہناز بلوچی زبان کی نامور اور منفرد شاعرہ ہے جس کی شہرت آج بھی بلوچی زبان و ادب میں مسلم ہے۔ اس کی زندگی نے بڑا عروج و زوال دیکھا، بڑے اتار چڑاؤ سے گزری لیکن اس نے ہر مشکل کو برداشت کیا، نہ صرف برداشت کیا بلکہ ثابت قدم رہی۔ اس پر الزامات لگائے گئے، تہمتیں تراشی گئیں مگر وہ پاک دامن رہی۔ اس نے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی شاعری کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔'' (عقیل (1997):270)

اس شاعر اور محبت بھرے جوڑے کو ایک دوسرے سے بے حد پیار تھا اور اس انتظار میں تھے کہ جلد ان کی شادی ہو جائے اور وہ ایک ہو کر اپنی زندگی کو خوشیوں اور حسین رنگوں سے بھر دیں۔ دونوں اپنے خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں گم تھے اور اپنی شاعری کے پھول برسا رہے تھے اور ہر سو ان کی شاعری اور محبت کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ بظاہر سب کچھ پُرسکون تھا اور ہر ایک اپنی جگہ خوش و خرم تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب میر چاکر خان رند نے اپنے لشکر کے ساتھ مغل حکمران ہمایوں کی مدد کی تھی اور اسے سوری خاندان کے ہندوستان پر قبضہ ختم کرانے میں کثیر لشکر فراہم کیا تھا۔ اس طرح یہ زمانہ سولہویں صدی عیسوی کا تھا اور رندوں کے پاس مغلوں کی حمایت کے نتیجے میں کثیر دولت ہاتھ آئی اور ہر گھرانہ خوشحال ہو گیا تھا۔ اس خوشی کے عہد میں شہداد اور مہناز کی محبت نے مزید اضافہ کیا لیکن شاید قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور اوپر والے نے ان دونوں کا ابھی مزید امتحان لینا تھا۔

نوحانیوں اور رندوں کے مابین تعلقات انتہائی خوشگوار تھے اور ان کے کئی خاندان آپس کی رشتہ داریوں میں منسلک تھے۔ اس طرح ان میں آپس میں خونی رشتہ قائم ہو چکا تھا لہٰذا میر شہداد خان رند کی منگنی بھی اسی قبیلہ کے ایک معتبر گھرانے میں ہوئی تھی۔ ابھی شادی میں کافی عرصہ باقی تھا اور ان دونوں کی عمریں ابھی اتنی نہیں تھیں کہ دونوں کی شادی کی جاتی۔ لہٰذا دونوں ہی منگنی کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہو کر مطمئن تھے کہ زود یا بدیر دونوں ایک ہو ہی جائیں گے۔ یہ انتظار کے دن جاری تھے کہ کسی بات پر نوحانیوں اور رندوں کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے اور نوبت دشمنی تک آ پہنچی مگر کوئی خون خرابہ نہ ہوا۔ یہ

اختلافات بڑھتے ہی چلے گئے اور کئی خاندان جو آپس میں رشتہ داریوں میں منسلک تھے، وہ بھی آپس میں ناراض ہو گئے۔ میر چاکر خان کے خاندان کی بھی نو حانیوں سے ناراضگی ہو گئی جس کی وجہ سے انہوں نے شہداد کی شادی روک دی اور اسے کہیں اور بیاہ دینے کا فیصلہ کیا۔ خاندان کے اس فیصلہ پر شہداد نے بھرپور احتجاج کیا اور اس فیصلہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے گھر والوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ شادی کرے گا تو صرف مہناز سے وگرنہ اور کسی سے نہیں۔

اس طرح کچھ وقت مزید گزر گیا اور ان دونوں قبیلوں کے اختلافات مزید بڑھ گئے اور راضی نامے کی بظاہر ساری امیدیں ختم ہو گئی تھیں۔ اب شہداد کی عمر بھی شادی کے لائق تھی اور وہ اپنے والد کا جانشین بھی تھا اور قبیلہ کا اگلا سردار بھی۔ لہٰذا والدین اور قبیلہ کے دیگر بااثر افراد کی خواہش تھی کہ میر شہداد کی جلد از جلد شادی کر دی جائے۔ لہٰذا والدین نے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ شروع شروع میں وہ انکار کرتا رہا اور بار بار کہتا رہا کہ مہناز میری منگیتر ہے اور میں اسے نہیں چھوڑ سکتا اور نہ ہی اسے بھول سکتا ہوں، لیکن خاندان اور قبیلہ کے بااثر افراد کا دباؤ اس پر بڑھتا گیا لہٰذا اس نے بادلِ نخواستہ شادی کے لیے ہاں کر دی اور اس کی شادی اپنے ہی قبیلہ میں مرگو نامی ایک لڑکی کے ساتھ کر دی گئی۔ اس کی شادی تو مرگو سے ہو گئی لیکن اس کے دل میں اب بھی مہناز بس رہی تھی۔ مرگو سے تو اس نے خاندان والوں کے دباؤ میں آ کر شادی کے لیے ہاں کر دی تھی اور ایک مذہبی و دنیاوی رسم ادا کی تھی وگرنہ اس کا دل تو اب بھی مہناز کی امانت تھی اور اس کی سوچوں اور خیالوں میں مہناز کے علاوہ اور کوئی نہیں آ سکتا تھا۔

مہناز بھی ان قطع تعلقات سے بہت پریشان ہوئی اور جب مرگو کی شادی شہداد سے کر دی گئی تب بھی اسے یقین تھا کہ یہ سب خاندانی دباؤ کا نتیجہ ہے وگرنہ شہداد کا دل تو اب بھی اس کے ساتھ ہے شہداد تو اب بھی مہناز سے پیار کرتا ہے۔ شہداد کے دل میں مہناز کے علاوہ اور کوئی آ ہی نہیں سکتا۔ مہناز پر بھی اس خاندان والوں نے بہت دباؤ ڈالا کہ چونکہ اب شہداد نے بھی شادی کر لی ہے لہٰذا اب ہم پر لازم نہیں کہ آپ کی منگنی ہونے کی وجہ سے ہم ان کے پیغام کا انتظار کریں۔ انہوں نے جانتے ہوئے بھی کہ شہداد کی منگنی مہناز کے ساتھ ہوئی ہے پھر بھی شہداد کی شادی کہیں اور کر دی اور ہم کو پوچھا تک نہیں۔ لیکن مہناز نے کمال صبر و برداشت کا

مظاہرہ کرتے ہوئے کہا: کہ وہ جانے اُن کا کام، میں تو ازل سے ہی شہداد کی تھی اور اس کے بغیر اور کسی سے شادی نہیں کروں گی اور یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے۔

وقت بدلتے دیر نہیں لگتی، دشمنیاں ہمیشہ کے لیے قائم نہیں رہتی ہیں، جیسا کہ عام مقولہ ہے کہ "جنگ جنگ آخر خیر" یعنی لڑائی لڑائی بالآخر راضی نامہ کے مصداق کچھ عرصہ بعد نوحانی اور رند قبائل کے اختلافات بھی ختم ہو گئے اور یہ دونوں قبائل آپس میں ایک بار شیر و شکر ہو گئے۔ ان کے پرانے تعلقات ایک بار پھر قائم ہونے لگے اور کدورتیں ختم ہونے لگیں۔ دشمنی دوستی میں بدلتی گئی اور پرانے رشتہ دار ایک بار پھر دوریاں مٹا کر ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ رنجشوں اور بدگمانیوں کا خاتمہ کیا گیا اور آپس کی محبت اور دوستی کو بڑھانے کی کوششیں ہوئیں۔ اس طرح ماضی قریب میں جو اختلافات اور غلط فہمیاں ان دو قبائل میں پیدا ہو گئی تھیں ان کے خاتمے کے ساتھ ہی ایک بار پھر نوحانی اور رند یک جان دو قالب بن گئے۔ دونوں قبائل کے لوگ ایک بار پھر ایک دوسرے کے غمی اور خوشی میں شامل ہونے لگے۔ ان بدلتے ہوئے حالات کو شہداد نے اپنے لیے نیک شگون سمجھا اور اس کے دل میں مہناز کو حاصل کرنے کی نئی امید جاگ اٹھی۔ وہ جانتا تھا کہ رندوں اور نوحانیوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم بھی ہے کہ مہناز میری منگیتر ہے اور ہمارے درمیان قبائلی ناراضگی چلی آ رہی تھی، میں نے مہناز کو یا مہناز نے مجھے نہیں چھوڑا اور نہ ہی ہمارے خاندان والوں نے ایک دوسرے سے منگنی ختم کرنے کے حوالے سے کوئی بات کی ہے۔ اس نے سوچا کہ میری پہلی شادی کے بارے میں مہناز کے گھر والے زیادہ نہیں پوچھیں گے کیونکہ مہناز اور اس کے خاندان والے جانتے ہیں کہ وہ شادی میری مجبوری بن گئی تھی، میں نے دل سے کبھی وہ شادی نہیں کی اور نہ ہی مرگو سے کبھی مجھے کوئی جذباتی لگاؤ رہا۔ دوسری بات یہ کہ بلوچ قبائل میں کثیر الازدواجیت معیوب نہیں بلکہ مستحسن اقدام سمجھا جاتا ہے اور کبھی بھی اس عمل پر زیادہ چوں و چرا نہیں ہوتا۔ یہ سوچ کر وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا اور اس نے اس سلسلے میں عملی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

اس نے سب سے پہلے اپنے والدین کو اس بات پر راضی کیا کہ مہناز میری منگیتر ہے اور اب چونکہ دونوں قبائل کے تعلقات بہتر ہو چکے ہیں اور کئی خاندانوں نے اپنے ٹوٹے

ہوئے رشتے پھر سے جوڑ دیے ہیں تو آپ بھی میری شادی مہناز سے کروادیں۔ اس کے والدین نے بیٹے کے ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور وہ مہناز کے گھر رشتہ مانگنے اور شادی کی تاریخ طے کرنے پر راضی ہوگئے۔ اس کے بعد اس نے مہناز کے والدین کو اپنی جانب سے پیغام بھیجا کہ چونکہ مہناز میری بچپن کی منگیتر ہے اور میری پہلی شادی مجبوری میں ہوئی تھی اب چونکہ دونوں قبائل اور سارے خاندان آپس میں دوبارہ قدیمی رشتوں کو بحال کر چکے ہیں تو کیا ہی اچھا ہو کہ میری شادی مہناز سے کردی جائے۔

مہناز کے گھر والے یہ پیغام سن کر سوچ میں پڑ گئے، انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ سارے خاندان کو پتہ ہے کہ شہداد اور مہناز کی منگنی ہو چکی ہے اور وہ آپس میں بہت محبت کرتے ہیں، انہوں نے آپس میں مشورہ کرتے ہوئے سوچا کہ مرگو تو ویسے ہی شہداد کے ساتھ بیاہی گئی وگرنہ شہداد نے کبھی دل سے اسے قبول نہیں کیا۔ انہوں نے سوچا کہ ان کی بیٹی نے تو ویسے بھی انہیں صاف صاف جواب دے دیا تھا کہ وہ شادی کرے گی تو صرف شہداد سے وگرنہ کسی سے نہیں۔ انہیں پتہ تھا کہ مہناز اب ہر وقت گم سم رہنے لگی ہے اور اس کی شاعری میں بھی سوز و گداز، حزن و ملال اور غم و اندوہ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی پوری شاعری المیہ بن کر رہ گئی تھی جس میں معاشرے پر شدید طنز بھی شامل ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس کے گھر والوں نے سوچا کہ اس رشتے کو پھر سے جوڑ دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ انہوں نے شہداد کو جواب بھیجتے ہوئے ذرا استفہامی انداز میں کہا کہ ہمیں آپ کی بات کی سچائی کا علم ہے اور آپ کی مہناز کے ساتھ شادی کے لیے ہم راضی ہیں مگر آپ کی پہلی بیوی کی موجودگی میں ہماری بیٹی کا کیا ہوگا۔ آپ کی دوسری شادی ہے مگر ہماری بیٹی کی تو پہلی شادی ہے۔ اس پر شہداد نے انہیں یقین دلایا کہ:

''مہناز میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ ماضی میں جو کچھ ہوا سو ہوا، اب میں نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں''

مہناز کو جب اس بات کا علم ہوا کہ شہداد نے اس کا رشتہ طلب کیا ہے اور اس کے والدین کے پاس شادی کا پیغام بھیجا ہے تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ وہ ہوا کے دوش پر اڑنے لگی اور بادلوں کے ساتھ خوشی میں ناچنے اور چہل قدمی کرنے لگی، وہ ہواؤں میں فضاؤں میں اُڑ رہی تھی اس کی خوشی اور مسرتوں کی کوئی حد نہیں تھی وہ خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی

تھی۔ اس کی سہیلیوں نے اسے کہا کہ شہداد کی پہلی بیوی مرگو پہلے سے گھر میں موجود ہے مگر اسے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ تھی، اسے تو اس کا محبوب مل رہا تھا، برسوں سے بچھڑے ساتھی سے اس کا ملاپ ہو رہا تھا اسے اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ مرگو شہداد کی بیوی ہے یا نہیں، ہاں وہ جانتی تھی کہ وہ شہداد کے دل میں رہتی ہیں اور اب اس کی ہونے جا رہی تھی۔

شہداد کو اس بات کا ڈر تھا کہ چونکہ مہناز کے گھر والے بھی معتبر لوگ ہیں لہٰذا وہ اس کی پہلی بیوی کی موجودگی پر اعتراض کریں گے مگر جب انہوں نے بڑی آسانی کے ساتھ اور بغیر کسی رکاوٹ کے ہاں کر دی تو اس کی خوشی اور مسرت قابل دید تھی، اس کے دل میں محبت کی سلگتی ہوئی چنگاری ایک بار پھر بھڑک اُٹھی اور وہ دل ہی دل اور سوچوں ہی سوچوں میں مہناز کے ساتھ آنے والی زندگی گزارنے کے منصوبے بنانے لگا تھا۔

اس طرح چند ہی دنوں میں تمام معاملات بخیر و خوبی سرانجام پا گئے اور دونوں کی شادی ہو گئی۔ شہداد اپنی دلہن کو بیاہ کر اپنے گھر لے آیا۔

شادی کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے میں ایسے کھو گئے جیسے اس کے سوا اور کوئی جہاں ہی نہیں ہے، اور جیسے ان کی زندگی کا اور کوئی مقصد و منشاء اور ضرورت ہی نہیں ہے، بس وہ دن رات ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے اور دنیا و مافیا سے بالکل بے خبر تھے۔ شہداد نے مرگو کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا بلکہ وہ بھول ہی گیا تھا کہ اس کی مرگو نام کی ایک بیوی پہلے سے بھی اس گھر میں رہتی ہے۔ مرگو نے شہداد کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور اسے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی بہت کوشش کی لیکن سب بے سود رہا۔ شہداد تو اب ہر وقت مہناز میں کھویا رہتا تھا اور اسی کے نغمے گاتا رہتا تھا۔ یہ درست ہے کہ مہناز اس کی منگیتر تھی اور بچپن سے اس کے ساتھ اس کی منگنی ہوئی تھی، وہ ذہین اور خوبصورت تھی اور شہداد کو بچپن سے ہی اس سے محبت تھی مگر مرگو بھی تو اس کی بیوی تھی جس کے ساتھ شہداد کا نکاح ہوا تھا۔ اس طرح نظر انداز ہونے پر مرگو کا دل انتقام اور حسد کے آگ سے بھڑک اٹھا اور اس نے شہداد اور مہناز دونوں سے بدترین انتقام لینے کا مصمم ارادہ کیا۔ اس نے دل میں سوچا اور فیصلہ کیا کہ:

"اس عورت نے میری ساری خوشیاں چھین لی ہیں۔ میں اس سے ایسا انتقام لوں گی کہ یاد کرے گی۔"

اب مرگو ہر وقت مہناز سے انتقام لینے اور اسے شوہر کی نظروں سے گرانے کے منصوبے سوچنے لگی۔ وہ منصوبے بناتی اور خود ہی ان میں کمزوریاں اور خامیاں نکال کر انہیں رد کر دیتی، اس طرح سوچتے سوچتے کئی دن گزر گئے۔

داستان کے اس حصے میں مصنفین کے بیانات میں معمولی اختلاف پایا جاتا ہے، کہیں پر تحریر ہے کہ ایک گڈریا تھا جو شہداد کے ریوڑ کی خیال داری کرتا تھا۔ وہ کئی نسلوں سے رندوں کے چرواہے رہے تھے اور انتہائی وفاداری اور ایمانداری سے اپنے فرض کی تکمیل کرتے رہے تھے، لہٰذا اسی گڈریا خاندان کا ایک نوجوان شہداد کی بھیڑ بکریوں اور ریوڑوں کو چرانے اور ان کی نگہداشت کرنے کا کام کرتا تھا اور رات کو وہیں جانوروں کے باڑے کے قریب سو جاتا تھا۔ مہناز اس کا بہت خیال رکھتی تھی اور اس کے لیے کھانا پینا پہنچاتی تھی اور بسا اوقات کپڑے اور جوتے وغیرہ بھی لے کر دیتی تھی اور اس کی ضرورتوں کا خیال رکھتی تھی۔ کہتے ہیں مرگو نے اس کے ساتھ مہناز کے معاشقے کی جھوٹی افواہ پھیلائی اور اس پر الزام لگایا۔ جبکہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ شہداد کے بچپن کا ایک دوست تھا جس کا نام عمر تھا، وہ جب شہداد سے ملنے آیا تو مرگو نے موقع پر کر چال چلی اور مہناز پر تہمت لگائی اور اسے شہداد کی نظروں سے گرانے میں کامیاب ہوئی۔ بہر حال اس چھوٹے سے اختلاف سے قطع نظر، کہا جاتا ہے کہ عمر نامی ایک شخص ایک دن شہداد کے گھر اس سے ملنے آیا تو شہداد نے انتہائی خوشی اور مسرت کا اظہار کیا اور اس کا بڑی گرمجوشی اور محبت سے استقبال کیا۔ دونوں بچپن کے دوست بیٹھ گئے اور خوب گپ شپ کی اپنے بچپن کی باتیں کیں خوب ہنسے اور اپنی موجودہ مصروفیات کے بارے میں ایک دوسرے کو آگاہ کیا۔ شہداد نے اپنے دوست کی آؤ بھگت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دونوں خوب لطف اندوز ہوتے رہے، ان کی باتیں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں، حتیٰ کہ رات کے کھانے کے بعد بھی دونوں کی باتیں دیر تک جاری رہیں۔ مہناز اپنے کمرے میں بستر پر شہداد کے انتظار میں ہی سو گئی لیکن، مرگو اپنے کمرے میں جاگ رہی تھی، اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، اس کو کبھی ٹھنڈے پسینے آجاتے مگر وہ خود کو فوراً سنبھال لیتی، آج اسے اپنے شیطانی منصوبے پر عمل درآمد کرنے کا سنہری موقع ہاتھ آیا تھا، وہ اس موقع کی تاک میں تھی کہ جب شہداد اور عمر بھی گہری نیند سو جائیں گے۔ وہ جانتی تھی کہ شہداد اپنے بچپن کے دوست عمر

کے پاس ہی سو جائیگا۔ لہٰذا وہ اسی وقت کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی، مہناز کب کی سو چکی تھی جبکہ شہداد اور عمر بھی باتیں کرتے کرتے رات کے کسی پہر سو گئے اور گہری نیند میں چلے گئے۔ مرگو نے جب ان کے خراٹوں کی آوازیں سنیں تو اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ دونوں سو چکے ہوں گے۔ وہ ننگے پاؤں اور دبے قدموں کے ساتھ ساتھ عمر کے بستر کے پاس آئی اور اس کے جوتے پہن کر آہستہ آہستہ مہناز کے بستر کے پاس پہنچی اور پھر واپس مڑ کر عمر کے بستر کے پاس آئی اور جوتے اتار کر دبے پاؤں واپس اپنے بستر کی جانب چلی گئی، مگر وہ شاطر عورت سوئی نہیں بلکہ جاگتی رہی تا کہ صبح جب مہمان چلا جائے تو وہ فوراً شہداد کو ایک بری خبر سنا سکے اور اپنے گھناؤنے کھیل کا اگلا منظر شروع کر سکے۔

صبح جب ناشتہ کرنے کے بعد مہمان رخصت ہونے لگا تو شہداد اس کو رخصت کرنے کے لیے کچھ دور تک اس کے ساتھ گیا اور جب اسے رخصت کر کے واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ مرگو حویلی کے سامنے کھڑی ہے، اس نے فوراً درشت لہجے میں پوچھا کہ یہاں کیوں کھڑی ہو اندر چلی جاؤ۔ اس پر مرگو نے ذرا طنزیہ لہجے میں کہا کہ میرے یہاں کھڑی ہونے پر آپ کو اعتراض ہے مگر اس گندے آدمی کو رات آپ نے مہمان بنایا وہ آپ کو برا نہیں لگا، آپ کا یہ دوست اچھا آدمی نہیں ہے، اسے آپ کی عزت اور مرتبے کا کوئی خیال نہیں ہے۔ اس پر شہداد کو غصہ تو بہت آیا مگر کمال سے کام لیتے ہوئے اس نے مرگو کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ کیا فضول باتیں کر رہی ہو؟ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ جواب میں مرگو نے کہا کہ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ وہاں رات بھر آپ کی چہیتی بیوی آپ کے مہمان کے ساتھ عیاشیاں کرتی ہے اور آپ سوئے پڑے ہوتے ہو۔ یہ سننا تھا کہ شہداد ایک دم آگ بگولہ ہوا اور ایک تھپڑ مرگو کو رسید کرتے ہوئے کہا کہ، بدبخت عورت جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو۔ اس نے بھی تھپڑ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ثبوت دیکھ کر بات کی ہے۔ کیا ثبوت ہے تیرے پاس اس الزام کا؟ ہاں بولو، جلدی بولو۔ شہداد کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی اور غصے سے اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مہناز اس سے کتنی محبت کرتی ہے اور اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ مگر مرگو نے اس سے کہا کہ میرے ساتھ چلو اور اسے ساتھ لے کر عمر کے بستر کے قریب لے آئی اور کہا کہ دیکھو یہ عمر کے جوتوں کے نشان

ہیں اور یہ سیدھے مہناز کے بستر کی طرف جا رہے ہیں اور پھر وہاں سے سیدھے اسی طرف آ رہے ہیں۔ شہداد نے دیکھا واقعی ایسا ہی تھا۔ اس پر سکتہ طاری ہوا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ عورت جو اس سے بے پناہ محبت کا اظہار کرتی ہے اور اس کا اس نے ہمیشہ بہانگ دُہل اور برملا اظہار کیا ہے اور اس کی مجھ سے محبت کے بارے میں تمام رند اور نو حانی جانتے ہیں، وہ اس قدر دوغلی اور فریبی بھی ہو سکتی ہے۔ مرگو کا چلایا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھ گیا تھا اور شہداد غصے سے کانپ رہا تھا۔ مرگو جانتی تھی کہ بلوچ سماج میں اس الزام کا انجام موت ہے لہٰذا اسے یقین تھا کہ بہادر بلوچ سردار ابھی اپنی تلوار بے نیام کرے گا اور جا کر مہناز کی گردن کاٹ دے گا۔ مگر شہداد کو مہناز سے بے پناہ محبت تھی اور اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مہناز ایسا کر سکتی ہے مگر جوتوں کے نشانات اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ گذشتہ رات عمر اس طرف آیا تھا۔ وہ سخت کرب میں مبتلا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کس طرح اس مسئلہ کا حل تلاش کرے۔ وہ یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ بلوچ سماج میں ہی نہیں اسلامی سماج میں بھی یہ ایک انتہائی گھٹیا الزام تھا اور اس کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت بھی موجود تھا۔ شدید غصے کی حالت میں شہداد مہناز کے کمرے کی جانب گیا اور کوئی بات کیے بغیر اس کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور مارنا شروع کیا۔ وہ بیچاری شہداد کو دیکھ کر اس کے استقبال کو مسکراتی ہوئی آگے بڑھی، اس کو معلوم ہی نہ تھا کہ اس کے خلاف مرگو نے کون سا کھیل کھیلا ہے اور کس طرح کی کھچڑی پکائی ہے۔ وہ شہداد کو غصے اور غضب کی حالت میں دیکھ کر ایک دم پریشان ہو گئی اور ابھی پوچھنا ہی چاہتی تھی کہ شہداد نے اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنا اور مارنا شروع کیا۔ مہناز پوچھتی رہی کہ، بات کیا ہے؟ تم مجھے کیوں مار رہے ہو؟ آخر مجھ سے ایسی کون سی غلطی ہوئی ہے کہ جو مجھے اس طرح مار رہے ہو؟ جواب میں شہداد نے اسے کہا کہ فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ، تم اس گھر کے قابل نہیں ہو، مجھ سے محبت کے دعوے کرتی ہو اور میرے مہمانوں کے ساتھ دلربائی کرتی ہو، میری عزت خاک میں ملا دی ہے تم نے۔ تم اتنا عرصہ مجھ سے فریب کرتی رہی ہو اور میری محبت کی آڑ میں میری عزت کے ساتھ کھیلتی رہی ہو۔

مہناز پوچھتی رہی کہ آخر میرا قصور کیا ہے؟ مجھے بھی تو کچھ پتہ چلے۔ مگر شہداد غصے میں پاگل ہو رہا تھا اور اس لمحے اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا تھا۔ اس نے اسے پیٹتے ہوئے کہا کہ

اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔

مہناز نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کچھ کہہ سکے، مگر شہداد نے اسے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور وہ بیچاری روتی اور آنسو بہاتی ہوئی اپنے والدین کے گھر چلی گئی۔ وہ بہت پریشان تھی، اپنے میکے تو آ گئی تھی مگر اس بات پر پریشان تھی کہ یہ سب کچھ اچانک کیا ہو گیا؟ وہ شخص جو اس کے لیے دیوانہ اور پاگل تھا اس کو اچانک ہو کیا گیا کہ اس نے اتنی مار پیٹ کی اور اُسے گھر سے ہی نکال دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آخر وجہ کیا تھی؟ مجھے بھی تو کچھ پتہ ہونا چاہیے تھا، اور اگر مجھ پر کوئی الزام تھا یا مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا یا کوئی غلطی ہوئی تھی تو مجھے بھی تو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ کون سی ایسی خطا تھی کی جس کہ وجہ سے شہداد نے اسے ایسے جانوروں کی طرح مارا پیٹا اور جان سے مارنے کی دھمکی دینے کے ساتھ ساتھ گھر سے ہی نکال دیا۔ اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ یہ سب کچھ مرگو کا کیا کرایا ہے اور اس نے جو کچھ کیا یا کہا ہے اس کا مہناز کو تو علم نہیں البتہ شہداد نے اس کی بات کا یقین کیا اور اس کے ساتھ مار پیٹ کر کے اسے گھر سے ہی نکال دیا۔ مگر مرگو نے کون سی ایسی بات کی ہے یا کیا الزام لگایا ہے؟ اس کا مہناز کو البتہ علم نہیں تھا۔ اس کو افسوس صرف اس بات کا تھا کہ شہداد نے اسے نہ تو مار پیٹ کی وجہ بتائی اور نہ اسے صفائی پیش کرنے کا موقع دیا، آتے ہی مار پیٹ شروع کی اور اسے گھر سے نکال دیا۔ اور یہی بات اسے اور اس کے گھر والوں کو پریشان کیے ہوئی تھی۔ مہناز نے اپنے جذبات کا اظہار اپنی شاعری میں بھی کیا ہے اور شہداد کے رویے پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ اس نے مار پیٹ تو کی مگر اسے صفائی کا کوئی موقع نہیں دیا۔

مہناز کو اب بھی یہ امید تھی کہ چند دنوں بعد جب شہداد کا غصہ اتر جائے گا تو وہ خود اسے لینے آ جائے گا اور اپنے رویے پر ندامت کا اظہار کرے گا۔ وہ بیچاری تو اُس کے ہتک آمیز سلوک کو بھی بھول گئی تھی اور شہداد کی منتظر تھی کہ وہ آئے اور اسے گھر لے جائے۔ مگر شہداد نہیں آیا جبکہ کئی دن انتظار میں گزر گئے اور نہ ہی کسی کو بھیج کر مہناز کی کوئی خیر خبر لی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ مہناز کو مکمل طور پر فراموش کر چکا تھا۔ شہداد کی جانب سے مہناز پر لگائے گئے الزامات کا بھی اس کے والدین کو خبر ہو چکی تھی۔ شہداد کا یہ رویہ دیکھ کر مہناز کے گھر والے بھی سخت پریشان ہوئے کہ ان کی بیٹی میکے میں آ کر بیٹھ گئی ہے اور اس پر الزام لگایا گیا ہے کہ وہ بدکردار ہے اور

یہی الزام لگا کر اسے گھر سے نکال دیا گیا ہے۔ مہناز کے گھر والوں کو شہداد کی جانب سے بعد میں اس الزام کا پتہ چلا تو وہ کرب واذیت میں مبتلا ہو گئے۔ ان کی بدنامی کے لیے یہی کافی تھا کہ ان کی بیٹی پر بدکرداری کا الزام لگایا گیا تھا جس کی بلوچ معاشرے میں کوئی گنجائش نہ تھی اور اس کی سزا موت تھی۔ جب مہناز کو اس بات کا علم ہوا تو اسے سخت افسوس ہوا کہ وہ شہداد کے سوا کسی اور کی جانب دیکھنا بھی گناہ سمجھتی ہے اور آج تک انتہائی نامساعد حالات میں بھی خود کو شہداد کے لیے محفوظ رکھا اور شادی کی بھی تو صرف اسی سے، حالانکہ وہ بھی محبت کا دعویدار تھا مگر اس نے مہناز کے علاوہ بھی ایک اور عورت کے ساتھ شادی کی تھی اس کے باوجود مہناز نے اس کی دوسری بیوی بننا قبول کر لیا تھا مگر افسوس شہداد نے اپنی پہلی بیوی کی غیر مصدقہ پروپیگنڈہ میں آ کر اُسے گھر سے نکال دیا تھا اور یہ الزام ایسا نہ تھا کہ مہناز برداشت کرتی جبکہ وہ مکمل بے قصور اور اپنے شوہر پر مر مٹنے والی عورت تھی۔

شہداد کے اس رویے کو مہناز نے اپنی شاعری میں خوب خوب بیان کیا ہے اور اس نے اپنے اشعار میں بھی اپنی دکھوں کا اظہار کیا ہے اور اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر بھرپور احتجاج کیا ہے۔ البتہ وہ یہ جان گئی تھی کہ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے مرگو کا کیا دھرا ہے اور وہ شہداد کے اعصاب پر سوار ہو چکی ہے اور اس کے عقل و دانش پر مرگو قابض ہو چکی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ شہداد پر مرگو کا جادو پوری طرح چل گیا ہے اور وہ پوری طرح اس پر حاوی ہو چکی ہے اسی لیے میرے ساتھ یہ واقعات پیش آئے۔ مہناز یہ بھی جانتی تھی کہ وہ بے گناہ ہے، پاک دامن ہے، اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے وہ صرف تہمت اور الزام ہے جب کہ ان میں سچائی کوئی نہیں ہے۔ بالآخر اس نے طے کیا کہ وہ خود شہداد کے پاس جائے گی اور اس کے اس ناروا روئیے اور ظالمانہ سلوک کے بارے میں دریافت کرے گی اور اپنی بے گناہی ثابت کرے گی۔ یہ طے کر کے اس نے اپنے والد اور بھائیوں کو ساتھ لیا اور شہداد کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے شہداد کے سامنے بیٹھ کر اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ وہ بے گناہ اور پاک دامن ہے۔ اس پر جو تہمت لگائی گئی ہے وہ سراسر غلط اور ناحق ہے۔ مگر شہداد پر مہناز، اس کے والد اور بھائیوں کے سمجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اپنے لگائے گئے الزام پر قائم رہا اور کہا کہ مہناز کے عمر کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں اور اس نے عمر کے جوتوں کے نشان مہناز کے بستر کی

طرف جاتے اور واپس آتے ہوئے دیکھے تھے۔ جب وہ کسی بھی طور اس الزام کو واپس لینے پر راضی نہ ہوا اور اپنی ضد پر اڑا رہا تو مہناز نے اٹھتے ہوئے کہا کہ:

''میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کی آزمائش سے گزرنے پر تیار ہوں'' (عقیل (1997):280)

بلوچ سماج میں بعض سنگین الزامات کو ثابت کرنے کے لیے کچھ رسمیں اور طریقۂ کار مخصوص تھے (ہیں) کہ جن کے ذریعے کسی کی بے گناہی یا گناہ گار ہونے کی تصدیق کی جاتی تھی۔ اب بھی بعض قبائل میں یہ طریقہ کار موجود ہیں اور انہی پر عملدرآمد کر کے کسی الزام کی تردید یا تصدیق کی جاتی ہے۔ لہٰذا ان قبائل میں تیل کے کھولتے ہوئے کڑاؤ میں ایک انگوٹھی ڈال کر ملزم یا ملزمہ سے کہا جاتا کہ وہ اپنے ہاتھ کو اس کھولتے ہوئے تیل کی کڑاہی میں ڈالے اور اس انگوٹھی کو صحیح اور سالم ہاتھ کے ساتھ نکال کر اپنی بے گناہی کا ثبوت دے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی جرم یا الزام کی تصدیق یا تردید کے لیے یہ ایک خوفناک طریقہ تھا مگر مہناز اس بات پر راضی تھی کہ وہ کھولتے ہوئے تیل کے کڑاؤ میں اپنا مرمریں اور نازک ہاتھ کلائی تک ڈال کر متعلقہ انگوٹھی نکال کر لوگوں کو دکھائے گی اور اپنی بے گناہی ثابت کر کے رہے گی۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس طرح کی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ دہکتے ہوئے انگاروں پر یا کھولتے ہوئے تیل کی کڑاہی میں ہاتھ ڈال کر کئی لوگوں نے اپنی بے گناہی ثابت کی ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ اگر کوئی شخص ملزم یا مجرم نہ ہوتا تو انگارے یا کھولتا ہوا تیل اس پر کوئی اثر نہیں کرتے اور وہ صحیح و سالم ان آزمائشوں سے نکل آتا اور کامیاب ہو جاتا البتہ گناہگار اور مجرم لوگ انگاروں اور کھولتے ہوئے تیل کو دیکھ کر ہی اپنے جرم کا ارتکاب کرتے۔ اس طرح بلوچ سماج میں یہ سیدھے سادھے طریقے تھے کسی بھی مجرم سے جرم اگلوانے کے لیے، مگر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ خوفناک اور بھیانک طریقے بھی تھے، جو اب بھی بعض علاقوں اور قبائل میں مستعمل ہیں۔ مہناز کے اوپر جو الزام تھا اس کو بھی جانچنے اور اس کے درست یا غلط ہونے کے لیے یہی طریقہ کار اختیار کیا گیا۔ قبائل کے معتبرین اور قبائلی جرگہ میں یہی فیصلہ ہوا کہ اگر مہناز بے گناہ ہے اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہتی ہے تو وہ آگ کے کھولتے ہوئے کڑاہی میں ہاتھ ڈال کر اپنی بے گناہی ثابت کرے۔ جرگہ نے یہی فیصلہ کیا کہ اس طرح اس کی بے گناہی یا گناہگار

ہونے کے کی تصدیق بخوبی ہوجائے گی۔ جب مہناز سے پوچھا گیا کہ کیا وہ اس آزمائش کے لیے تیار ہے تو اس نے کہا کہ:

''میں تیار ہوں، میں اپنی پاک دامنی ثابت کرنے کے لیے ہر آزمائش سے گزرنے کے لیے تیار ہوں۔'' (عقیل (1997):280)

شہداد سے اس سلسلے میں رائے لی گئی تو اس نے بھی حامی بھری اور کہا کہ اس سے بڑا امتحان اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ مہناز اس طرح اپنی بے گناہی ثابت کرسکتی ہے اور معاشرے میں اپنا کھویا ہوا وقار پہلے کی طرح بحال کرسکتی ہے۔ چنانچہ اسی وقت ایک بڑی سی کڑاہی لے کر اس میں تیل بھرا گیا اور اس کے نیچے آگ جلا کر گرم کیا گیا جب تیل کھولنے لگا تو اس میں انگوٹھی ڈال دی گئی اور قبیلہ کے چند معززین نے آگے بڑھ کر مہناز کو تحکمانہ انداز میں کہا کہ وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اٹھے اور اس کھولتے ہوئے تیل کی کڑاہی میں سے انگوٹھی تلاش کر کے نکال دے۔

مہناز پاک دامن تھی، اس کا دل صاف تھا، اس نے کوئی ایسا گناہ نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے اس پر الزام لگا اور اسے گھر سے نکال دیا گیا، وہ معاشرے میں جس مقام کی متحمل تھی وہ تو اسے نہیں دیا گیا البتہ جس مرتبہ پر وہ تھی وہ بھی اس سے چھین لیا گیا۔ وہ بھائیوں، والد، شوہر حتیٰ کہ معاشرے کے ہر فرد کی نظروں سے گر چکی تھی اور اسے بدکردار عورت کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا تھا لہٰذا وہ ہر حال میں اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے خود اس نے اپنے آپ کو پیش کیا تھا لہٰذا وہ ذرا برابر بھی خوفزدہ نہیں تھی بلکہ اب وہ زیادہ مطمئن تھی کہ اس کی بے گناہی ثابت ہوجائے گی اور وہ الزام جس کی آگ میں وہ جل رہی ہے اس سے نجات مل جائے گی۔ معاشرے میں اس کا کھویا ہوا وقار دوبارہ بحال ہوگا اور وہ لوگوں کی نظروں میں دوبارہ عزت و وقار پائے گی۔ لہٰذا جب منتظم کی آواز آئی کہ ملزمہ مہناز اس کڑاہی میں ہاتھ ڈال کر انگوٹھی نکال دے، تو مہناز فوراً آگے بڑھی، اپنے اردگرد کھڑے لوگوں پر ایک نظر دوڑائی، پھر شہداد اور مرگو کی جانب دیکھا اور انتہائی اطمینان کے ساتھ آگے بڑھی۔ اُس نے آہستہ سے کلائی پر سے آستین ہٹائی اور دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے بولی:

''اے اللہ! اے رب دو جہان کے مالک! اے ساری کائنات کو کن فیکون کہہ کر بنانے والے عظیم و لازوال ہستی! تُو تو جانتا ہے کہ یہ جو کچھ بھی میرے ساتھ ہو رہا ہے سب جھوٹ اور تہمت ہے۔ تو دلوں کے بھید جانتا ہے، میری بے گناہی سوائے تیرے اور کوئی نہیں جانتا، یا اللہ میری بے گناہی سب پر ثابت کر کے مجھے سُرخرو کر دے۔'' آمین

اس کے بعد اس نے کھولتے ہوئے تیل پر ایک نگاہ ڈالی جس میں ابال آ گیا تھا اور وہ خوب جوش مار رہا تھا۔ اُس نے زور سے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی اور اپنا ہاتھ کلائی تک کھولتے ہوئے تیل کی کڑاہی میں ڈبو دیا اور تلاش کر کے انگوٹھی نکال دی اور اسے منتظم کے حوالے کیا۔ اس کے ہاتھ پر آنچ تک نہ آئی اور نہ ہی کوئی آبلہ پڑا بلکہ تر و تازہ ہاتھ باہر نکلا اور اس پر کسی قسم کے جلنے یا تیل سے متاثر ہونے کا کوئی معمولی سا نشان بھی نہ تھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ اس نے کھولتے ہوئے تیل میں نہیں بلکہ ٹھنڈے پانی میں ہاتھ ڈالا ہو۔ حاضرین اور شرکاء پر یہ سب کچھ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے سکتہ طاری ہوا اور پھر سبحان اللہ سبحان اللہ، الحمد للہ الحمد للہ کی آوازیں بلند ہوئیں اور پھر منتظمین اور جرگہ کے سربراہوں نے اعلان کیا کہ مہناز مکمل طور پر بے گناہ، معصوم اور بے قصور ہے اور اس پر ناجائز الزام اور تہمت لگائی تھی لہٰذا اب وہ اس الزام سے مکمل طور پر بری الذمہ اور آزاد ہے۔ وہ پاک دامن اور پاک سیرت خاتون ہے۔

شہداد جو چند لمحے پہلے مہناز کو قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا، اب ندامت کی تصویر بنا کھڑا تھا، اس نے بھی دیکھ لیا تھا کہ مہناز بے گناہ ہے اور اس پر تہمت لگائی گئی تھی۔ دل ہی دل میں وہ افسوس کر رہا تھا کہ محض مرگوکی بات پر یقین کر کے اس نے مہناز کو اس قدر دُکھ دیے، لہٰذا وہ جلدی سے آگے بڑھا مگر اس لمحے مہناز پیچھے ہٹ گئی اور بولی: میری سوتن نے رقابت کی وجہ سے مجھ پر الزام لگا کر مجھے بدنام و رسوا کر دیا۔ اس نے میری پاک دامنی پر تہمت لگائی اور تم نے اس کی باتوں میں آ کر مجھے گھر سے نکال دیا اور صفائی کا موقع تک نہیں دیا۔ پھر اس نے وہاں کھڑے تمام لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولی کہ آپ سب نے میری بے گناہی دیکھ لی، اب انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ جس نے تہمت لگائی ہے اس کا ہاتھ بھی اس کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا جائے تاکہ یہ پتہ چل جائے کہ اس نے مجھ پر جو الزام لگایا

تھا اس میں کتنی حقیقت اور سچائی تھی۔ مجمع میں سے اچانک آواز بلند ہوئی کہ مرگو کو لاؤ، مرگو کو لاؤ، مگر مرگو کو تو معلوم تھا کہ مہناز بے گناہ ہے اور یہ سب کچھ اس کا کیا دھرا ہے، لیکن اس کا خیال تھا کہ کھولتے ہوئے تیل کو کیا پتہ کہ گناہ گار اور بیگناہ کون ہے؟ وہ تو مہناز کا ہاتھ پل میں جھلس دے گا اور وہ ماری جائے گی، مگر وہ شاید ایک قوت کو بھول گئی تھی کہ جو مارنے والے سے زیادہ طاقتور ہے اور مارنے یا جینے دینے کی تمام تر طاقت اسی ذات اعلیٰ و برتر کے اختیار میں ہے، مرگو اللہ اور اس کی طاقت کو بھول چکی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ مہناز صحیح سالم اپنا ہاتھ کھولتے ہوئے تیل میں سے انگوٹھی سمیت باہر نکال چکی ہے اور اسے معمولی سا زخم یا آبلہ تک نہیں آیا تو وہ وہاں سے کھسک گئی تھی۔

شہداد نے آگے بڑھ کر مہناز سے بات کرنا چاہا تو اس نے بات کرنے سے انکار کر دیا اگرچہ اس کے دل میں ابھی تک محبت کی چنگاری سلگ رہی تھی اور وہ شہداد کو بے پناہ چاہتی تھی، وہ شہداد سے محبت نہیں عشق کرتی تھی اور اس کو دل و جان سے چاہتی تھی، اس کا دل چاہا کہ وہ بھی آگے بڑھے اور شہداد کا ہاتھ تھام لے، یقیناً اس کے بعد شہداد زندگی بھر اس کے سامنے دبا رہے گا اور کبھی بھی اس طرح کی کوئی غلطی نہیں کرے گا، اس کی محبت بھی بڑھے گی اور وہ مرگو کو چھوڑ بھی دے گا، مگر اس لمحے وہ انا سامنے آ گئی جو فطری طور پر ہر انسان کے اندر ہوتی ہے۔ اس نے سوچا کہ اس کے بھائی اور اس کا والد کیا سوچیں گے؟ اس کی اپنی اتنی بے عزتی ہوئی اور وہ دونوں قبائل میں سر اٹھانے کے قابل نہ رہا تھا، جو دکھ دیے تھے اور جو مار پیٹ کی تھی کہ جس کی اس نے کبھی توقع تک نہیں کی تھی، اور پھر اتنے بڑے امتحان سے گزرنے پر مجبور کیا تاکہ وہ اپنی بے گناہی ثابت کر سکے، للہذا اب اتنی گنجائش کہاں تھی کہ وہ شہداد سے بات کرتی۔

شہداد نے منت کرتے ہوئے اس سے بات سننے کی درخواست کی تو اس نے جواباً کہا: کہ جب تم نے میری پاک دامنی پر الزام لگا کے مجھے گھر سے نکالا تھا، کیا اس وقت میری بات سنی تھی، کیا تم نے مجھے صفائی پیش کرنے کا موقع دیا تھا، اس وقت تمہاری محبت اور تمہاری چاہت کہاں چلی گئی تھی، تمہارا وہ عشق جس کا تم ہر وقت اظہار کرتے رہتے تھے کہاں مر گیا تھا؟ جواب دوبارہ میرے پاس آئے ہو۔ اب ہم کیسے ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ آپ کیسے مجھ سے آنکھ ملا سکتے ہیں؟ شہداد کی شرمندگی اور ندامت کا یہ عالم تھا کہ اُسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ وہ سر نیچے

کیسے مہناز کی درد میں بھری ہوئی مگر مستحکم و پُراعتماد آواز سن رہا تھا۔ وہ شرمندہ تھا کہ کاش اس نے نادانی نہ کی ہوتی اور ایک دم جذبات کی رو میں نہ بہہ گیا ہوتا اور مکمل تفتیش کے بعد کوئی قدم اٹھاتا تو نہ تو نوبت یہاں تک پہنچتی اور نہ ہی اس کا گھر اجڑتا۔ مہناز اس کی پہلی اور آخری محبت تھی، اس نے بلاشبہ مہناز سے عشق کیا تھا اور ہر وقت اس کی یادوں میں کھویا کھویا رہتا تھا۔ جب وہ ایک ہوئے اور کئی رکاوٹوں اور مشکلات کے بعد دونوں کی شادی ہوگئی تو جیسے شہداد کو اس کی ساری کائنات مل گئی ہو اور سارے خوبوں کی تعبیریں مل چکی ہوں۔ مہناز کے عشق و محبت میں اسے دن اور رات کا پتہ تک نہ تھا اور وہ ہر وقت اس میں ہی ڈوبا رہتا تھا۔ لہٰذا الزام لگانے اور امتحان کے میدان تک، اس دوران شہداد کی حالت بھی ایسی نہ تھی کہ وہ ہوش و حواس میں ہوتا، وہ بے شک مہناز پر غصے میں تھا مگر اس کے ساتھ اور اس کی یادوں میں گزارے ہوئے لمحے فلم بن کر اس کے سامنے گھومتے رہتے تھے اور اسے ان مناظر کی وجہ سے رات رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔ اب جب مہناز کی بے گناہی ثابت ہوگئی تھی تو وہ ایک مجرم کی طرح اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا اور اُس لمحے وہ بھول گیا تھا کہ وہ بلوچوں کا سب سے بڑا سردار ہے۔ اس نے مہناز کی جانب سے کھورا سا جواب پا کر اس کے والد اور بھائیوں کی منت سماجت شروع کی، کہ وہ مہناز کو سمجھائیں اور میرے ساتھ جانے پر راضی کریں مگر انہوں نے بھی اسے صاف صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ: 'یہ سب کچھ تمہارا اپنا کیا کرایا ہے، تم نے اس کے سوتن کے بہکاوے اور غلط بیانیوں میں آکر اس پر اتنا بڑا الزام لگایا کہ نہ صرف میری بیٹی اور میرے خاندان بھر کو رسوا کیا بلکہ میری نازوں میں پلنے والی لائق، ذہین، عقلمند اور لاڈلی بیٹی کو دکھوں کی دہکتی ہوئی آگ میں ڈال دیا۔ اب مہناز کے بارے میں کبھی سوچنا بھی نہیں۔ شہداد یہ جو کچھ تم نے کیا اب اس کو خود ہی بھگت لو۔

ہر طرف سے مایوس ہوجانے کے باوجود شہداد کا دل کہتا تھا کہ زود یا بدیر مہناز بالآخر مجھے معاف کردے گی اور اس کی محبت پھر سے جاگ جائے گی اور وہ عشق جس نے اسے میرے سوا کسی کے بھی بارے میں سوچنے سے منع کردیا تھا وہ یقیناً کسی نہ کسی دن اسے مجبور کرے گا کہ وہ دوبارہ میرے پاس آئے اور مجھے اور میرے رویے کو معاف کرکے دوبارہ سے پہلی والی زندگی شروع کرے گی۔ لیکن اس کی تمام تر امیدوں کے برخلاف اس کی مہناز نے

اب اس کے ساتھ نہ رہنے کا حتمی فیصلہ کرلیا تھا اور کافی سوچ بچار کے بعد اس نے اپنے والد اور بھائیوں کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کیا جس کو انہوں نے بھی مان لیا اور شہداد کو پیغام بھیجا کہ وہ مہناز کو طلاق دیدے کیونکہ اب ممکن نہیں ہے کہ مہناز شہداد کے ساتھ رہ سکے، اتنے بڑے الزام کے بعد جس میں مہناز کو اللہ نے سرخرو کیا، اب مہناز نہیں چاہتی کہ دوبارہ تمہارے ساتھ رہ کر بار بار وہ مناظر اور باتیں میری آنکھوں کے سامنے پھرتے رہیں اور میری کانوں میں گونجتی رہیں، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ مہناز کا خیال دل سے نکال دو اور اسے طلاق دے دو۔ شہداد کے لیے یہ خبر کسی بہت بڑے دھچکے سے کم نہیں تھی، وہ جانتا تھا کہ اس نے مہناز کو اتنی زیادہ تکلیفیں دی ہیں کہ جن کی وہ کسی بھی صورت حقدار نہیں تھی، اسے بڑے ہی گہرے زخم لگائے تھے اور بہت دکھ پہنچائے تھے، وہ جانتا تھا کہ اس نے مہناز کی ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں اور جس امتحان سے اسے گزرنا پڑا، ایسا امتحان صدیوں میں کبھی کبھار انتہائی حساس معاملات میں لیا جاتا ہے، لیکن اس کے باجود اسے یقین نہیں تھا کہ مہناز اس سے طلاق کا مطالبہ کرے گی کیونکہ دونوں کو ایک دوسرے سے بے پناہ محبت تھی۔ طلاق کا مطالبہ سن کر شہداد نے قبائلی معتبرین اور زعماء کو بیچ میں ڈالا کہ وہ ہمارے درمیان صلح کرالیں اور جو جرمانہ بھی مجھ پر رکھا جائے گا اسے میں پورا کروں گا لیکن مہناز کو سمجھائیں کہ وہ طلاق کا مطالبہ واپس لے اور اپنے گھر آجائے، مگر ان معتبرین نے بھی شہداد کو سمجھایا کہ دیکھو وہ ایک غیرت مند عورت ہے اور تم نے اگر اسے صرف مارا پیٹا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی وہ برداشت بھی کرلیتی اور مان بھی جاتی، یا آپ نے اسے گھر سے نکالنے کے بعد خود جا کر اسے لیا ہوتا اور دوبارہ اپنے ساتھ جانے کا کہتا تو بھی وہ مان جاتی اب اتنے بڑے امتحان سے گزرنے کے بعد وہ غیرت مند عورت کسی بھی طور آپ کے ساتھ نہیں رہے گی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اسے چھوڑ دیں اور طلاق دے دیں۔ کیونکہ اب وہ کسی بھی طرح آپ کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر بالآخر دل پر پتھر رکھ کر شہداد نے مہناز کو طلاق دیدی اور مہناز اپنے والدین کے پاس رہنے لگی۔ مہناز تو شہداد کی زندگی سے نکل چکی تھی مگر شہداد کے لیے اب زندگی بے کیف اور بے مقصد ہو چکی تھی، غم واندوہ سے اس کا بُرا حال تھا۔ وہ پاگل سا ہو چکا تھا سارا دن جنگلوں اور بیابانوں میں بلا مقصد گھومتا پھرتا تھا، بھوک پیاس کوئی احساس نہ تھا بس

ہر وقت اس کی زبان پر مہناز کا نام ہوتا تھا، اب وہ نہ تو لوگوں سے ملتا تھا، نہ قبائلی معاملات میں دلچسپی لیتا تھا، نہ یار دوستوں کی محفلوں میں جاتا تھا اور نہ ہی خود محفلیں سجاتا تھا، وہ مکمل تنہائی پسند بن چکا تھا۔ جبکہ دوسری جانب مہناز کی حالت بھی کچھ کم نہ تھی اس نے شہداد سے طلاق کا مطالبہ نسوانی غیرت کی وجہ سے کیا وگرنہ اس کے دل میں اب بھی شہداد کی محبت بھری ہوئی تھی اور اب بھی وہ شہداد کو دل و جان سے چاہتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ شہداد سے غلطی جذبات کی رو میں بہہ جانے کی وجہ سے ہوئی اور اگر وہ جذبات کی رو میں نہ بہہ جاتا اور خود تحقیق و تفتیش کر کے اگر حقائق سے آگاہی حاصل کرتا تو شہداد ایسا ہرگز نہیں کرتا۔ وہ جانتی تھی کہ شہداد بھی اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور اس کے بغیر ایک لمحہ نہیں رہ سکتا۔ مگر اب حالات ایسے نہیں رہے تھے کہ دونوں ایک ساتھ رہیں اور میاں بیوی کی حیثیت سے دوبارہ زندگی شروع کریں۔ لہٰذا دل میں شہداد کی محبت کا درد دبائے مہناز نے اُس سے طلاق کا مطالبہ کیا تھا اور دونوں میں طلاق ہوگئی تھی۔ اب دونوں کی حالت قابلِ دید تھی۔ دونوں کو جیسے خاموشی اور تنہائی کی بیماری لگ گئی ہو۔ طلاق کے بعد دونوں کی شاعری المیاتی صنف شاعری میں تبدیل ہوگئی جس کے پڑھنے سے ان کے دلی کرب واذیت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ دونوں کی شاعری کا یہ دور حزن وملال، رنج وغم، کرب وعذاب اور درد و تکلیف کی کہانیاں ہیں جن میں ان انسانی کیفیتوں اور اپنے اوپر گزرتے والے پُرعذاب لمحات کو جس طرح انہوں نے شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے وہ یقیناً المیاتی شاعری کی عمدہ مثالوں کی مانند ہیں۔

طلاق کا عذاب ابھی جاری تھا اور شہداد ابھی تک اس رنج وغم سے باہر نہیں آیا تھا اور نیم پاگل پن کی کیفیت اس پر طاری تھی، اچھے بُرے کی تمیز تک وہ چھوڑتا جا رہا تھا، نہ کھانا نہ پینا، نہ آرام نہ سکون، کہ اچانک مہناز کی جانب سے اسے ایک اور چونکا دینے والی خبر کا سامنا کرنا پڑا۔ مہناز کے گھر والوں نے دیکھا کہ مہناز ابھی جوان ہے، خوبصورت ہے اور حسین وجمیل ہے۔ اس کے سامنے لمبی زندگی پڑی ہے اور عورت ذات ہے، آج والد اور بھائی اس کے ساتھ ہیں کل والد کی آنکھیں بند ہوجانے اور بھائیوں کی شادی ہوجانے کے بعد شاید اس گھر میں مہناز کو اس کی بھابھی برداشت نہ کریں اور اسے تکلیف دیں۔ گوکہ بلوچ سماج میں لڑکی کو باپ کے گھر میں کبھی بھی بوجھ نہیں سمجھا گیا مگر اس کے باوجود اس کا والد اور بھائی چاہتے

تھے کہ مہناز کی شادی کردی جائے تاکہ وہ اپنے گھر کی ہوجائے اور ماضی کے زخم بھول جائے۔ لہٰذا اس کی شادی کرانے پر سارا خاندان متفق ہوا۔ جب لڑکے کی تلاش کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کے والد، بھائیوں اور خود مہناز نے یہ فیصلہ کیا کہ اسی شخص کے ساتھ مہناز کی شادی کردی جائے جس کے ساتھ اس کا نام لیا گیا اور اس پر تہمت لگائی گئی یعنی شہداد کا دوست یا اُن کا گڈریا۔۔۔۔عمر۔۔۔۔عمر نے پہلے تو انکار کیا مگر بعدازاں وہ بھی مان گیا۔اس طرح عمر اور مہناز کی شادی ہوگئی۔ جب شہداد کو اس بات کا علم ہوا کہ مہناز نے شادی کرلی ہے اور وہ بھی عمر کے ساتھ، تو اس خبر سے جیسے اس پر بجلی آگری ہو۔ کہتے ہیں کہ مہناز نے عمر سے اس شرط پر نکاح کرلی تھی کہ عمر اس کے ساتھ صرف نکاح کی حد تک رہے گا اس کے ساتھ کسی قسم کا تعلق قائم نہیں کرے گا، اس نے عمر سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس کے دل میں اب بھی شہداد کا پیار بسا ہے مگر دنیاوی انا پرستی اور نسوانی غیرت نے اسے دوبارہ شہداد کے پاس نہیں جانے دیا وگرنہ اس کا شہداد ہمیشہ اس کے دل میں بسا ہے۔عمر نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔مگر شہداد اب بیمار رہنے لگا تھا حتیٰ کہ وہ بستر پر آ لگا اور سارے خاندان اور قبیلہ والے اس کی زندگی سے مایوس ہوگئے۔ وہ مکمل طور پر اپنا ذہنی توازن کھو چکا تھا اور اس کی زبان پر ہر وقت مہناز مہناز کے نام کا ورد جاری رہتا تھا۔ بالآخر وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہا اور بستر سے آلگا۔اس کی اس حالت کی خبر جب مہناز کو ملی تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے پاس پہنچ گئی۔مہناز نے دیکھا کہ شہداد مکمل طور پر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا ہے اور بستر پر پڑا ایسی سانسیں لے رہا تھا جیسے یہ اس کی آخری سانسیں ہوں۔ مہناز جب اس کے کمرے میں پہنچی اور شہداد کو اس حالت میں دیکھا تو وہ بھاگ کر اس کی طرف بڑھی، شہداد نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے وہ ایسا نہ کرسکا اور دوباہ بستر پر گر پڑا۔ مہناز نے بھاگ کر اسے تھام لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور وہ زار زار رو رہی تھی۔ شہداد بڑی حسرت سے مہناز کی جانب دیکھ رہا تھا اور بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس میں اب اتنی بھی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ زبان سے کوئی بات کہہ سکے، وہ بس اپنی مردہ ہوتی ہوئی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے اپنی محبوبہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ مہناز تو پہلے ہی سے رو رہی تھی اب شہداد کی مردہ آنکھوں میں نجانے کہاں سے پانی بھر آیا اور وہ اس کی آنکھوں کے

کناروں سے بہہ کراس کے کانوں میں گرنے لگے، مہناز نے بڑے پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اوراس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو پونچھے۔اس نے اپنا ہاتھ شہداد کی مردہ اور بے جان ہوتے ہوئے ہونٹوں پر رکھا اوراس کے ساتھ ہی شہداد نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی اوراس کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔اس کا سر مہناز کے زانو پر پڑا تھا اور مہناز کے آنسوؤں سے شہداد کا چہرہ دُھل رہا تھا۔

ماہ گل شیر جان:

اس کہانی کے بارے میں اکثر و بیشتر براہوئی لسانیات کے ماہرین متفق ہیں کہ یہ محبت کی ایک سچی داستان ہے کہ جو علاقہ چاغی میں پیش آئی۔ڈاکٹر عبدالرحمن براہوئی صاحب اس کہانی کے بارے میں لکھتا ہے کہ،

> ''انیسویں صدی عیسوی میں اس سرزمین (چاغی) میں ایک حسین وجمیل لڑکی پیدا ہوئی۔اپنے حسن کے باعث والدین نے اس کا نام پری رکھا تھا۔ ہر جگہ اس کے حسن وجمال کا چرچا ہونے لگا۔ابھی وہ سنِ بلوغت کو پہنچی تھی کہ کئی رئیس اور معتبر رشتے مانگنے کے لیے آئے لیکن ناامید ہوکر واپس چلے گئے۔آخرکار وہاں کے ایک متمول شخص نبی بخش تراسی زئی نے اسے پیغام بھیجا۔دوسروں کی طرح اسے بھی ابتداً میں صاف جواب مل گیا، لیکن وہ خاموش نہیں بیٹھا، بلکہ قاصد روانہ کرتا رہا۔آخرکار اس کی دلی مراد پوری ہوئی اوراس کی شادی ماہ گل (پری) سے ہوگئی۔'' (براہوئی (2008 سیکنڈ ایڈیشن):16)

مزید لکھتا ہے کہ،

> ''نبی بخش سو سے زائد بھیڑوں کا مالک تھا۔واقعہ آج سے سوڈیڑھ سو برس پہلے کا ہے۔ظاہر ہے کہ اُس وقت ایک شخص جو اس قدر بھیڑوں کا مالک تھا تو یقیناً اس کا شمار بلوچستان کے صف اول کے رؤسا میں ہوتا ہوگا۔غرض شادی کے بعد میاں بیوی آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ گھر میں ہر قسم کی

آسائشیں موجود تھیں۔ خاوند جھگڑالو نہیں تھا۔ بیوی فرمانبردار تھی۔ اس لیے کبھی تلخ کلامی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ نبی بخش نے ماہ گل پری کی آسائش کے لیے گھر میں ایک نوکر رکھنے کا بندوبست کرنا چاہا۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر نوکر رکھنے سے منع کر دیا کہ وہ خود گھر میں کام کاج کرے گی۔ غرض وہ صبح صادق سے پہلے اُٹھ کر آٹا پیستی۔ ابھی سورج نہیں چڑھا تھا کہ مشکیزہ لے کر ندی سے پانی بھرنے چلی جاتی۔ صوم وصلوٰۃ کی بھی پابند تھی۔ اپنی پڑوسیوں کا خیال رکھتی تھی، انہیں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی وہ بغیر کسی حیل وحجت کے ان کو دے دیتی۔ غرض ایک نیک بااخلاق اور وفا شعار عورت میں جو جملہ اوصاف ہونے چاہئیں وہ ان سے متصف تھی۔"

(براہوئی (2008 سیکنڈ ایڈیشن):17)

الغرض نبی بخش تراسی زئی اور ماہ گل پری کی زندگی انتہائی سہل اور پُرسکون انداز میں گزر رہی تھی۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے اولاد جیسی نعمت سے بھی نوازا۔ ان کے دو بچے تھے جن کے ساتھ دونوں میاں بیوی خوش وخرم زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن جیسی ان کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی اور ان کی پُرسکون وآرام دہ زندگی میں ایک دم سے ایک طلاطم آیا اور سب کچھ بکھر گیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن پری ماہ گل کے شوہر نے ان سے کہا کہ انہیں نہانا ہے اور آج سردی بھی زیادہ ہے لہٰذا ان کے لیے پانی گرم کرو۔ ماہ گل نے انتہائی فرمانبرداری کے ساتھ نبی بخش کے لیے پانی گرم کیا اور جیسا کہ دستور تھا کہ چکنی مٹی اور تیل ملا کر نہایا جاتا تھا لہٰذا ماہ گل نے بھی مٹی اور تیل ملا کر غسل خانے میں رکھا تا کہ اس کا شوہر نہا سکے۔ اتفاق سے یا غلطی سے ماہ گل سے تیل کچھ زیادہ ڈھل گیا جس کی وجہ سے نبی بخش نے کچھ سخت الفاظ کہے اور ماہ گل کو ڈانٹا جس کی وجہ سے ماہ گل کا دل بھر آیا اور اس نے دل میں سوچا کہ وہ نبی بخش کی اتنی خدمت کرتی ہے اور اس کی تمام ضروریات پوری کرتا ہے مگر تھوڑا سا تیل زیادہ ہونے پر انہوں نے اتنا بُرا منایا اور اتنے سخت الفاظ استعمال کیے۔ وہ افسوس کرتی اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ برتن اٹھا کر ندی کی جانب پانی لینے کے بہانے روانہ ہوئی۔ راستے میں انہیں ان کی ایک ہمسائی ملی کہ جو ندی کی جانب پانی لینے جا رہی تھی۔ انہوں نے جب ماہ گل کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو

رونے کی وجہ پوچھی۔ ماہ گل نے اسے ساری روداد سنادی۔ ہمسائی نے اس پر افسوس کا اظہار کیا اور ماہ گل سے بظاہر ہمدردی جتاتے ہوئے بولی کہ نبی بخش کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ انہیں آپ جیسی خوبصورت عورت ملی وگرنہ اس بدصورت شخص سے تو کوئی بھی شادی کے لیے تیار نہ تھی۔ تم اس جیسے کنجوس۔ بدصورت اور ظالم شخص سے میری مانو اپنی جان چھڑاؤ اور شیر جان رخشانی سے شادی کرلو کہ جو ایک شکاری بھی ہے اور امیر ومتمول شخص بھی ہے۔ وہ سخی ہے اور دوسروں کی مدد کرتا رہتا ہے۔ وہ بہادر اور طاقتور شخص بھی ہے لہٰذا میری مانو تو تم نبی بخش سے طلاق لے کر شیر جان رخشانی سے شادی کر کے اپنی زندگی زیادہ خوشحال اور آسودہ بناؤ۔ ہمسائی ماہ گل کے کان خوب بھرتی رہی اور اسے نبی بخش سے برگشتہ کرتی رہی اور ساتھ ہی ماہ گل اور شیر جان رخشانی کی خفیہ ملاقاتوں کا بھی بندوبست کرتی رہی۔ اس طرح نبی بخش اور ماہ گل کے مابین خلیج بڑھتی گئی جسے نبی بخش نے بھی محسوس کیا۔ اسے ماہ گل پر کبھی بھی شک نہیں گزرا تھا کیونکہ ماہ گل ایک صوم وصلوٰۃ کی پابند عورت تھی اور انتہائی فرمانبرداری کے ساتھ اپنے شوہر کی خدمت کرتی تھی۔ لہٰذا نبی بخش کو کبھی بھی اس کی پاکیزگی پر شک نہیں ہوا تھا مگر اسے کیا پتا تھا کہ تیل والے واقعہ پر ماہ گل اس سے دور اور بہت دور چلی گئی ہے۔ حتیٰ کہ نبی بخش کے اعتماد کا یہ عالم تھا کہ جب اُس کے چرواہے (چوپان) نے شیر جان اور ماہ گل کے تعلقات کا اُس سے ذکر کیا تو بھی نبی بخش نے اُس کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور نہ ہی ان پر یقین کیا۔ مگر جب چوپان نے بار بار اسے ماہ گل کی حرکات اور شیر جان سے خفیہ ملاقاتوں کا ذکر کیا تو نبی بخش کو بھی شک ہونے لگا۔ ایک دن نبی بخش اپنا بندوق صاف کرتے ہوئے ماہ گل سے بولا کہ آج وہ شکار پر جارہا ہے اور رات کو نہیں آسکتا۔ اور کسی طرح اپنے شکار پر جانے کی اطلاع شرجان کے کانوں تک پہنچائی۔ ڈاکٹر عبدالرحمن براہوئی صاحب لکھتے ہیں کہ،

> ''جب اندھیرا ہوگیا تو نبی بخش چپکے سے اپنی جھونپڑی میں آکر سو گیا۔ اس نے نیند کو اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ رات کا ایک حصہ گزرنے کے بعد شیر جان بغیر کسی خوف وخطر کے وہاں پہنچ گیا۔ ماہ گل نے اسے غور سے دیکھا تو بچے کو دودھ پلانے کے بہانے اُٹھ کر اس کی طرف ایک پتھر پھینک دیا کہ خطرہ ہے نزدیک نہ آنا لیکن وہ مطلب نہیں سمجھا اور راہ فرار اختیار کرنے کی

بجائے اندر آنے لگا۔ ادھر نبی بخش نے اُٹھ کر بندوق داغ دی اور ایک وار میں رقیب کا کام تمام کر دیا اور علی الصباح ایک ٹیلے پر تلوار سے ماہ گل پری کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے''۔ (براہوئی (2008 سیکنڈ ایڈیشن):17)

اس داستان کو سب سے پہلے براہوئی زبان کے مشہور شاعر بلو نوشکوی نے منظوم کیا جو مشہور شعرا بشام وریکی کا ہمعصر تھا۔ یہ منظوم داستان بہت ہی مقبول ہوئی۔ محفلوں میں پڑھی جانے لگی۔ ساربان راتوں کو اونٹوں پر سوار اس کو خوش الحانی سے گاتے چلے جاتے۔ کسان کھیتوں کی طرف جاتے وقت اسے گنگناتے۔ بہت سے لوگوں نے اس منظوم داستان کو ازبر بھی کر لیا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس منظوم داستان کے شائق کم ہوتے گئے۔ اس داستان کو تحریری طور پر سب سے پہلے 1967ء میں کوئٹہ کے ایک ادبی ادارے نے شائع کیا جو مثنوی ماہ گل کے نام سے چھپا۔ اس مثنوی میں جا بجا فارسی زبان کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن سے شاعر کے کامل عالم ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ یہ مثنوی بھی کافی طویل ہے اور ممکن نہیں ہے کہ ان محدود صفحات میں اسے مکمل جگہ دی جا سکے البتہ چند منتخب بند (قطعے) ذیل میں دیے جا رہے ہیں۔

"ماہ گل کہ ہنداکان بش مرے
مُسہ قدم اونا مونائے برے
بخیرٹ آئی نے خدا اتے
تول کنا مادر ناپڑدہ مرے
ماہ گل مخا اوڑان خوڑت ارفے
کہ ہر وخت نے خدا ہم اتے
انسان اے انسان تن مطلب ارے
نہ کہ انسان اے حیوان تن مطلب ارے
انتس کہ نے اینو در کا مرے
کاٹم خدا کن فدا مرے"

(براہوئی (2008 سیکنڈ ایڈیشن):34)

اس مثنوی کے خالق بلو نوشکوی نے اس میں ماہ گل پری کی تمام تر زندگی، نشست و برخاست، اخلاق و شائستگی، ادب و اندازِ گفتگو، حسنِ اخلاق حتیٰ کہ اس کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مثنوی میں ماہ گل کی شوہر کے لیے کی جانے والی خدمات اور وفاداری کا بھی ذکر ہے۔ اس طرح پوری مثنوی کو پڑھ کر اس پورے واقعہ سے مکمل آگاہی حاصل ہوجاتی ہے۔

بلاشبہ ماہ گل کی خصوصیات بہت زیادہ تھیں اور وہ وفا شعار، خدمت گزار، ہمدرد و مہربان عورت تھی اور اس نے شوہر کی ہر طرح سے خاطر مدارت اور خدمت کی تھی۔ اس میں اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ لڑاکی اور باتونی نہیں تھی اور نہ ہی فالتو تکرار وغیرہ کرتی تھی۔ اس کی زندگی انتہائی آسودہ اور خوشحال تھی۔ اس کے گھر میں کسی بھی چیز اور ضروری اشیاء کی کمی نہ تھی۔ وہ اپنے زمانے کے متمول اور خوشحال عورتوں میں شمار ہوتی تھی۔ وہ سیکڑوں بھیڑ بکریوں کی مالکن تھی حتیٰ کہ اس کا شوہر گھر میں نوکر تک رکھنے کے قابل تھا مگر ماہ گل نے ایسا کرنے سے اسے منع کیا ورنہ ان کے لیے نوکر رکھنا مشکل نہیں تھا۔ اس کا شوہر بھی اس سے بیحد پیار کرتا تھا اور کبھی بھی اسے اپنی عبادت گزار اور وفا شعار بیوی کے کردار پر شک نہیں ہوا تھا اور یہی اس کی سب سے بڑی محبت تھی۔ لیکن ان تمام خصوصیات کے باوجود ماہ گل ایک ماں ہوتے ہوئے بھی اپنے مہربان اور محبت کرنے والے شوہر کی ایک معمولی سی بات برداشت نہ کرسکی در اپنے گھر کے راز باہر کی عورتوں کو بتا دیے کہ جو پہلے ہی سے اس تاڑ میں تھے کہ ماہ گل اور نبی بخش کی جوڑی اور خوشحال گھرانے کو کیسے تباہ و برباد کیا جائے۔

ماہ گل کو یقیناً اپنے شوہر کی اس معمولی ڈانٹ کو زیادہ محسوس نہیں کرنا چاہیے تھا اور نہ ہی اسے اس پر آنسو بہانے کی ضرورت تھی۔ وہ نہ صرف اس معمولی سی بات کا برا مان گئی بلکہ اُسے اپنی انا کا مسئلہ بنایا اور اپنی زندگی اجاڑ دی۔ اسے اس ڈانٹ کو ہنس کر درگزر کرنا چاہیے تھا۔ نبی بخش اس کا شوہر اور زندگی کا ہمسفر تھا۔ اس کٹھن اور مشکل سفر میں کئی اونچ نیچ آتے ہیں اگر ان نشیب و فراز سے مسافر سفر کے آغاز میں ہی سٹپٹا جائے اور بے وفائی اور بے مروتی کی انتہا کردے تو ایسا سفر کبھی بھی پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی اس سفر کے مسافر کبھی اپنی منزل پا سکتے ہیں۔ یہی کچھ ماہ گل اور نبی بخش کی زندگی کے سفر کا انجام ہوا۔ اگر ماہ گل کو کوئی

شکایت تھی یا اسے نبی بخش کی باتیں بُری لگی تھیں تو اسے نبی بخش سے ہی اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہیے تھا نہ کہ کسی انجان اور غیر عورت کو اپنی ذاتی زندگی میں مداخلت کا موقع دینا چاہیے تھا۔ اس واقعہ نے براہوئی سماج پر گہرے اثرات مرتب کیے برسوں لوگ اس واقعہ کو یاد کرتے اور اس خوشحال گھرانے کے بدترین انجام پر افسوس کرتے رہتے تھے۔ اب بھی بلوچستان بھر میں یہ واقعہ یاد کیا جاتا ہے اور شیر جان رخشانی اور اس عورت کو بددعائیں دی جاتی ہیں کہ جنہوں نے اس خوبصورت اور خوشحال گھرانے کو اجاڑا اور کئی بچوں کو ہی صرف یتیم نہیں کیا بلکہ عورت اور مرد کے خوبصورت کردار کو بھی داغدار کیا اور ان دونوں اصناف کے اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچائی۔

مثنوی ماہ گل سے چند منتخب قطعات:

ماہ گل کی تعریف:

گڑا ماہ گل دنیا ٹی طاق ہم ارے کہ بھلا سحورائے او نسخل کرے
کہ نسخل تانوشکی ناگرٹوئس ارے مخلوق اونا صفت ئِ کرے
کہ گودی کہ نسخل ئِ بیٹ کرے ژاغاتہ گرے نسخل ئِ جبی اس درے
کہ نسخل زیادہ چیڑائے برے کونی بشینک ٹی بائے سخت کرے
تورے نسخل ئِ آہ سڑدس درے است وجان آن لارس برے
(براہوئی (2008 سیکنڈ ایڈیشن):44)

ماہ گل کی مذہب سے محبت اور احکامات و فرائض کی ادائیگی:

دیتے وضو نا ہڈ گرم کرے فرضے خدا نا ادائی کرے
کہ خوبی خدا نا جوان بہترے ہروخت بندغ خدائے یات کرے
(براہوئی (2008 سیکنڈ ایڈیشن):45)

الغرض ایک طویل مثنوی ہے کہ جن میں اس داستان اور اس کے کرداروں کے بارے میں اشعار بیان ہوئے ہیں۔ اس داستان کے بارے میں مزید معلومات ڈاکٹر عبدالرحمن براہوئی کی مرتب کردہ کتاب مثنوی ماہ گل براہوئی داستان کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے کہ جسے براہوئی اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔

للّلہ و گراناز:

بلوچستان کا ساحل خوبصورت چھوٹی چھوٹی بندرگاہوں سے معمور ہے۔ یہ طویل ساحل اس وقت دو مختلف ممالک ایران اور پاکستان میں منقسم ہے جبکہ پاکستان میں اس کے ساحل کا کچھ علاقہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں سندھ کے قبضے میں چلا گیا جبکہ باقی ساحلی علاقہ اس وقت دو اضلاع لسبیلہ اور گوادر میں منقسم ہے۔ بلوچستان کے ساحل کے اس علاقہ کا رقبہ جو پاکستان میں شامل ہے 771 کلومیٹر ہے۔ اس طویل ساحلی پٹی پر جگہ جگہ سمندری ٹاپو اور قدرتی بندرگاہیں ہیں جہاں زمانہ قدیم سے بلوچ قبائل آباد ہیں۔ ان سمندری ٹاپوؤں اور بندرگاہوں میں ایک مقام کلمت بھی کہلاتا ہے جو ماضی میں انتہائی مشہور و معروف اور بلوچی زبان و ادب اور تاریخ و ثقافت کے حوالے سے کافی شہرت رکھتا تھا۔ کلمت بندگاہ کو یونانی حملوں کے دوران یونانی امیر البحر نیروخس نے اپنے سفر نامہ میں کلما تحریر کیا ہے جبکہ پرتگیزیوں کے حملوں کے دوران یعنی سولہویں صدی عیسوی میں یہ ساحلی مقام بلوچ سرفروش حمل جیئند کی آماجگاہ تھی اور پرتگیزی قزاقوں کے خلاف بلوچ قبائل کا بہترین مورچہ تھا جہاں سے بلوچ مزاحمت کار اپنے رہنما حمل جیئند کی رہنمائی میں سمندروں کا سینہ چیر کر پرتگیزی حملہ آوروں کے حملوں کا منہ توڑ جواب دیتے رہے اور اپنے ساحلوں کی حفاظت کرتے رہے۔ کلمت بندرگاہ کو تاریخ بلوچستان اور بلوچستان کے اہم ساحلی مقامات میں خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ ساحلی مقام کبھی بلوچی زبان اور ادب کا اہم مرکز ہوا کرتا تھا اور اب بھی اسے بلوچی زبان کی ترقی و ترویج میں نمایاں حیثیت حاصل ہے کیونکہ یہاں سے بلوچی کے نامور ادیب اور شعرائے کرام تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے اپنی مادری زبان کی ترقی کے لیے گرانقدر خدمات سرانجام دیے ہیں۔ اسی طرح یہ خطہ بلوچ ثقافت اور رومانوی تاریخ میں بھی اپنا منفرد مقام رکھتا ہے اور اس خطے سے بلوچی کی مشہور رومانوی کہانی للّلہ گراں ناز بھی منسوب ہے کہ جن کی کہانی بلوچی زبان و ادب میں منفرد مقام کی حامل ہے۔ اسی طرح للّلہ اور گراں ناز کی شاعری کو بلوچی زبان و ادب میں بھی اہم درجہ و مقام حاصل ہے اور ان کی شاعری کو مختلف زاویوں سے بلوچی زبان میں اہم اضافہ خیال کیا جاتا ہے کیونکہ اس شاعری میں بلوچ سماج کے معاشرتی نفسیات

کی بہترین عکاسی نظر آتی ہے اور بلوچی ضابطہ اخلاق کی پاسداری کے لیے ان کے اشعار اور ان کی محبت بھری کہانی ایک اہم ستون کا درجہ رکھتی ہے۔

چند صدیاں پیشتر علاقہ کلمت بندرگاہ کے قریب ایک قصبہ میں میر باران خان نامی ایک کلمتی بلوچ اقامت پذیر تھا۔ وہ اپنے قبیلہ کا سربراہ تھا اور علاقے کے بڑے معتبرین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس کی اولاد دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹی کا نام گراں ناز تھا جو حسن و خوبصورتی، سیرت و کردار، بہادری و شجاعت، مہمان نوازی اور ذوقِ ادب میں علاقہ کلمت میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ اس کے والد میر باران اور اس کے دونوں بھائی دل و جان سے اس سے محبت کرتے تھے اور اس کی کوئی خواہش ایسی نہ ہوتی جو وہ پوری نہ کرتے۔ وہ اپنے خاندان میں سب سے لاڈلی اور نازوں میں پلی تھی۔ اس کے والد میر باران ایک امیر کبیر شخص تھا۔ اُس کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ کسی نعمت کی کمی نہ تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کو بڑے ناز و نعم میں پالا اور اپنی اولاد میں سب سے زیادہ پیار اسے دیا جس کی وجہ سے گراں ناز میں زبردست خود اعتمادی پیدا ہوئی اور وہ معاشرتی سطح پر سرگرم ہوگئی اور ساتھ ہی اس کا ذوق ادب بھی خوب کِھل اٹھا۔ لہٰذا وہ ایک اچھی شاعرہ بن گئی اور صدیوں پیشتر بلوچی ادب کو ادب کا بڑا خزانہ اپنی شاعری کی صورت میں پیش کیا اور ساتھ ہی اس کی محبت بھری کہانی نے بلوچ ثقافتی نقوش اور اس ثقافتی گروہ کی روشن خیالی و روشن فکری کی اہم مثال قائم کی۔

گراں ناز جب جوان ہوئی تو وہ اپنی خوبصورتی اور بے مثال حسن میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی، اس کے جوان ہونے پر اس کے والد اور بھائیوں نے اس کی شادی اپنے ہی قبیلہ کے ایک بہادر اور بانکا نوجوان للّٰہ سے کردی۔ چونکہ اکلوتی بیٹی تھی لہٰذا میر باران نے دل کھول کر اپنی پیاری اور خوبصورت بیٹی گراں ناز کی شادی پر خرچہ کیا اور خوب جشن منایا اور بڑی دھوم دھام کی۔ دو جوانمرد اور دلیر بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی لہٰذا بھائیوں نے اس شادی میں خوشی کے کسی بھی سامان کی کمی نہ ہونے دی اور ہزاروں لوگوں کو کھانا کھلایا اور دن رات جشن منایا۔ کہتے ہیں گراں ناز کی شادی پر کلمت میں کئی دن تک جشن منایا جاتا رہا اور میر باران کا گھر جشن اور دھوم دھام کا مرکز رہا جہاں دن رات مہمانوں کی آمد جاری رہتی۔

للّٰہ ایک خوبصورت اور باذوق نوجوان تھا۔ بذلہ سنجی، بہادری، شاعری،

شاہسواری اور شمشیر زنی میں یکتا تھا۔ لہٰذا اس شادی سے گراں ناز بھی بہت خوش ہوئی اور وہ للّلہ کے ساتھ مسرتوں اور خوشیوں میں ڈوب گئی۔ للّلہ نے ہر طرح سے اس کی ناز برداریاں اٹھائیں اور اسے ہر طرح سے خوش رکھا جبکہ گراں ناز نے بھی اپنی محبت میں کوئی کمی نہیں آنے دی اور للّلہ کو دل و جان سے پیار دیا اور اسے کبھی بھی اپنی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ دونوں ایک دوسرے کے بہترین اور انتہائی وفادار رفیقِ حیات تھے اور علاقہ بھر میں ان کی گہری محبت کی مثال دی جاتی تھی۔

دن گزرتے گئے اور گراں ناز اور للّلہ کی محبت گہری ہوتی گئی۔ دونوں اپنی دنیا میں گم تھے اور خوشیوں اور مسرتوں میں ایسے ڈوبے ہوئے تھے کہ جیسے ان کے سوا دنیا میں اور کچھ بھی نہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش سے بے پرواہ اور بے خبر ہو کر ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے کہ اس دوران شاید ان کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی کہ دونوں میں طویل عرصہ تک دوریاں پیدا ہوگئیں اور کئی تکلیف دہ واقعات سے دونوں کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی۔ اس طرح ان کی محبت کہانی میں ایک ایسا موڑ آیا کہ جس سے یہ کہانی امر ہوگئی و گرنہ شاید یہ کبھی بھی منظرِ عام پر نہ آتا اور نہ ہی اسے ادبی یا ثقافتی و تاریخی صفحات پر جگہ ملتی۔

ہوا یہ کہ میر باران چونکہ ایک بااثر شخص تھا لہٰذا جس قدر اس کے دوست اور بہی خواہ تھے اسی قدر اس کے دشمن اور مخالفین بھی تھے جو اس سے مخاصمت اور دشمنی رکھتے تھے۔ بلوچ سماج میں قبائلی جنگوں کی کافی مثالیں موجود ہیں اور اس طرح کی جنگیں کبھی کافی طویل ہو جاتی ہیں تو بعض اوقات معتبرین اور قبائلی سربراہوں کی فوری مداخلت سے ان پر جلد ہی قابو پالیا جاتا ہے بہر حال یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ لہٰذا میر باران کی بھی قبائلی دشمنی تھی اور کسی اور قبیلہ کے ساتھ اس کی عداوت چلی آ رہی تھی۔ بلوچ کوڈ آف آنر یا بلوچی ضابطہ اخلاق کے مطابق جب بھی بلوچ کسی سے لڑتا ہے یا اس پر حملہ آور ہوتا ہے تو اسے پیشگی اطلاع دیتا ہے اور حملہ کرنے کی وجہ بھی بتاتا ہے۔ لہٰذا ایک دن میر باران کے پاس اس کے دشمنوں کا ایک قاصد یہ پیغام لے کر آیا کہ وہ فلاں دن تم پر حملہ آور ہوں گے۔ قاصد کا یہ پیغام سن کر میر باران نے بھی جنگ کی تیاری شروع کی لیکن اس نے اپنے قبائل کے لشکر اور جنگجوؤں کو ساتھ لے جانے کی بجائے اپنے بیٹوں، داماد (للّلہ) اور چند ملازمین اور محافظوں کے ساتھ اپنے مخالفین کی جانب

روانہ ہوا۔ اس کا مقصد لڑنے کی بجائے گفت وشنید کے ذریعے مسئلہ کو حل کرنا تھا مگر جب وہ جنگ کے میدان میں پہنچے تو اس دشمنوں نے یکبارگی اس پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں میر باران اور اس کے بیٹے اور چند دیگر لوگ مارے گئے جبکہ لللہ کو شدید زخمی حالت میں ایک ملازم میدان جنگ سے نکال لے جانے میں کامیاب ہوا۔

گراں ناز کو جب اس اندوہناک واقعہ اور اپنے والد اور بھائیوں کے قتل ہو جانے کی خبر ملی تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ (بعض بیانات کے مطابق اس کا ایک بھائی اس جنگ میں مارا گیا جبکہ دوسرا شاید گھر پر تھا) وہ اپنے والد کے گھر چلی گئی اور وہاں ماتم کناں ہوئی۔ مگر جب اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کا شوہر لللہ میدان جنگ سے بھاگ گیا ہے تو اسے بڑا دکھ اور افسوس ہوا۔ اس نے لللہ کو اپنے ماتم زدہ گھر سے ایک طعنوں سے بھرا پیغام بھیجا اور کہا کہ تو نے میدان جنگ سے فرار ہو کر بلوچی اصولوں کو توڑ ڈالا ہے اور روایات کو پامال کیا ہے، تو نے بزدلی اور نزوری میں بُری مثال قائم کی ہے، تیری بہادری اور شجاعت کے قصے سب جھوٹے نکلے، نہ تو تُو شاہسوار ہے اور نہ ہی جنگجو شمشیر زن کہ میں تجھ پر فخر کر سکوں۔ آہ لللہ! تو نے اپنے ہمراہیوں کا ساتھ چھوڑ کر راہ فرار اختیار کی اور مجھ جیسی محبوب ہستی کا دل توڑ دیا۔ میں لوگوں کو کیسے کہوں کہ میرا محبوب اور جان سے عزیز بہادر شوہر میدان جنگ سے منہ موڑ کر بھاگ گیا اور بلوچوں کی بلند و اعلیٰ روایات کو توڑ ڈالا۔ جب تک تو بدلہ نہیں لیتا اور اپنی مردانگی ثابت نہیں کرتا تو قیامت تک میرا بھائی ہے۔

ایک دانشور اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ:

”کشیدہ کاری سے گلریز رنگ برنگے ملبوس میں قوسِ قزح بن کر گاؤں کی ہمجولیاں گراں ناز کے والد محترم میر باران اور برادر گوشہ جگر کی لاشوں کے گرد ہالہ بنائے نوحہ خوان کی صورت میں ان جیالوں کی شجاعت اور جاں نثاری کی داستانیں بیان کر رہی تھیں جو آج ہی دشمن سے بدلہ لیتے لیتے خود بھی دشمن کی خون آشام شمشیروں اور تیر و آتش افشاں بنادیق کے نذر ہو چکے تھے۔ ہمہ تن گوش ہمجولیوں کی ساری محفل گراں ناز کے گلفشاں دہن کے لطفِ بیان پر جھوم رہی ہے۔ ایک شوخ اور چنچل دوشیزہ عقرب

ستارے کی مانند فاصلے پر بیٹھی دل ہی دل میں گراں ناز خاندان کی شجاعت، شہرت اور دولت سے کڑھتی جارہی تھی۔ اس کا جامِ ضبط و پیمانۂ صبر لبریز ہوا۔ اس کے اندرونی آتش حسد کا لاوا پھوٹ پڑا اور وہ طعن و تشنیع کے شعلوں سے غیور وجسور گراں ناز پر حملہ کر کے اس کی آتشِ غیرت کو بھڑکایا اوراس کی جذبات کو یوں مشتعل کیا، بولی؛ اے گراں ناز! 'تیرا شوہر لللہ بھی تو اسی جنگ میں شامل تھا اس کی لاش کہاں ہے اور وہ خود بھی موجود نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ جان بچا کر وہ کہیں چھپ گیا ہے۔'' (اثیر (1994):76)

سہیلی کی انہی باتوں سے گراں ناز کو غصہ آیا۔ ایک تو اس کا پورا خاندان مارا جاچکا تھا اور اس کا گھر ماتم کدہ بن چکا تھا، اس کے والد اور بھائیوں کی لاشیں صحن میں پڑی تھیں، ان سے بہنے والا خون ابھی تک گرم تھا اور وہ غم واندوہ کا شکار تھی، رورہی تھی، ماتم کناں تھی کہ اتنے میں اس سہیلی کی طعن و تشنیع سے بھری آواز آئی اور اس کے شوہر کو میدان سے بھاگنے والا قرار دیا۔ اس پر گراں ناز کی غیرت نے جوش مارا اور اس نے چاہا کہ اُس سہیلی کا منہ نوچ لے اور اس کی زبان کو گدی سے کھینچ کر نکال دے، مگر اس نے کمال صبر کا مظاہرہ کیا اور اپنے طعن و تشنیع سے بھرے ہوئے الفاظ کے تیروں کا رخ بہادر وشجاع اور زخمی لللہ کی طرف موڑ دیا۔ اس نے جو اشعار بھیجے وہ کچھ یوں تھے:

"پہر مس بستنت پیسر روچاں
گوں وتی جانی دز گہاراں
کیت تئی شیری کشتنءِ احوال
گوں سرور نایاں شلانگیناں
نیل کناں کل ءِ ہر چار سریگاں
در کناں پرہ کنڈیں کڈریگاں
گوش بنانی پارستگیں دراں
درستاں من زیانیں حقھے شیپاں
سر مصیبتیں میڑھے نندان

ہر بہ کہ جنگانی ہلا ہوشاں

دژمنیں مرداں دست گلائیشاں

کیگدیں مہلنجانی فراموشاں

گیرترا کاتکنت نیادا ملانی

سارت دہونکیں کل بزر گانی

گنگل و دزباتری جنگانی

گیشتر منی ماہیں دیم و درانی

للّٰہ منی لاپ ءِلیٹ جتگ ماری

پر منی زانسراں رست

للّٰہ منی سہرانی پت و براتے

دن صلوۃ ءِ محشری ءِ روچ ءَ"

ترجمہ:

چند ہی دن پہلے

میں اپنی سہیلیوں سے تمہاری جوانمردی

کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کرتی تھی

اور ہمیشہ سوچتی تھی کہ

میرا جیالا شوہر ایک بہادر کی موت مرے گا

قبیلہ میں تیری جوانمردی کا چرچا ہوگا

اور تیرے سوگ میں اپنی ساری چوڑیاں

توڑ کے رکھ دیتی اور تمام زیورات اتار پھینکتی

اور ماتم کر کے دشمن کے گاؤں کو تکتی رہتی

کاش ایسا ہی ہوتا

جنگ کے دوران تو

غیور شوہر اپنی محبوباؤں کی یاد کو

خیرباد کہہ کر موت کو گلے لگا لیتے ہیں
مگر اے للّلہ!
تجھے میدان جنگ میں حسیناؤں، الھڑ
دوشیزاؤں اور میری یاد آتی رہی
اے للّلہ! تو نے مجھے ڈھنگ مار دیا
تم روز محشر تک
میرے باپ اور بھائی ہو

(اثیر(1994):79-77)

جب گراں ناز کا قاصد طعنوں کے تیر ونشتر سے بھرا پیغام للّلہ کو سنا چکا تو للّلہ جو زخموں سے چور، بستر مرگ پر دراز تھا اور اٹھنے کے قابل بھی نہ تھا اور اپنے گھر میں زیرِ علاج تھا، اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ غصے میں کانپنے لگا، اس کے جسم کے لاتعداد زخموں میں درد کی ٹھیسیں اٹھیں اور ان سے خون رسنے لگا۔ چہیتی اور عزیز از جان بیوی کا یہ طعنوں بھرا پیغام سُن کر اس کو ایسا لگا جیسے زمین ہل گئی ہو اور زلزلہ آ گیا ہو، اس کا جسم تنور کی طرح گرم ہو کر سلگنے لگا اور اس کی سانس تیز ہوگئی، گراں ناز کے الفاظ سانپ بن کر اسے ڈسنے لگے۔ اس نے اٹھنے کی دوبارہ کوشش کی لیکن ناکام ہوا اور بستر پر گر پڑا۔ اس لمحے اس کے جسم کے کئی زخم کھُل گئے اور ان سے خون دوبارہ رسنے لگا تھا۔ لہٰذا جب حکیم نے آگے بڑھ کر ان پر مرہم لگانا چاہا تو زخمی اور مجروح للّلہ نے درد کی شدت سے تڑپتے ہوئے اس کے ہاتھ روک دیے اور قاصد کی جانب دیکھتے ہوئے اپنی خوبرو اور جمال آفرین بیوی کے طعن و تشنیع سے بھرے الفاظ کا کچھ یوں جواب دیا:

گوش کن او دریں نوک زبادانی
من نہ کرتگ مستی امّل تابانی
مرد و نامرد پیدا ورو درست انت
مردانی جنگانی نشان ہست انت
نامرد گوں شرمیگیں دپ ءَ ہست انت

ہپت سلاح ءَ گہ سار منا ہیتگ
گوہریں تیگ ءَ ہنڈ منی دستیں
اسپروں چنڈ چنڈ انت حراسانی
من سر ءَ ژند انت ہول سیستانی
چارده حیرو کیں تیر منی جاتیں
بیدے سگارانی تاجگیں ٹپاں
ناکن ءَ گیگ نیستیں منی جان ءَ
انگتوں پیر تااتگ ہمے زحم ءَ
اچ توئے گراں ناز گنٹ گھہ انت گزی
ہارش چہ دوریں جانباں کار انت
شرش پہ وشیں مہیلاں زور انت
برز منا ٹبینانی سرش دارنت
نے گواتش بارت نے ہارش تیلنباں
براتش پہ حاجی کوپگاں زیراں
گور من ورد رواں سچنت پاساں
چو چراگ ءَ روک انت ابر آساں
تو اگن منی کیں ءَ پلو ءَ زیرئے
تاجگیں ٹپاں پداں گندئے
وت گشئے دیوانگ ترا چوں انت
اگن نہ مرتاں چے کل ءَ چٹاں
من پہ حونیگاں آپ نہ باں سارتیں
دوربیں چاتاں سنگ اگں ریز انت
کینگ چہ مردانی دل ءَ کنزنت
نہ سنگ ریزنت من دوربنیں چاتاں

نہ کینگ چہ مردانی دلءَ کنزئت

بیر بلوچانی تادو صد سالاں

لستہ ئیں سرواناں دو دنتانیں

گراں ناز منی بھنگانی گہار کے

دن صلوٰۃءَ و محشرءِ روچءَ

ترجمہ:

اے حسینہ!

میں نے آج تک بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے

میری مردانگی کے قصے اب بھی زبانِ زدِ عام ہیں

میری گردن اب بھی تنی ہوئی ہے

جبکہ بزدل لوگوں کی گردن جھکی رہتی ہے

میں نے اپنے ساتوں اسلحہ استعمال کیے

تیغ آبدار کا دستہ ہی رہ گیا ہے

خراسانی اسپر (ڈھال) کے میرے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں

ہول (زرہ بکتر) سیستانی تو بالکل ناکارہ ہو گیا ہے

چودہ تیر میرے جسم میں موجود ہیں

جو تلواروں کے زخموں کے علاوہ ہیں

میرے جسم میں کوئی تندرست حصہ نہیں

تمہیں میرے ان بے شمار زخموں کا علم نہیں

اے گراں ناز!

تم سے تو وہ سوکھی لکڑیاں اچھی ہیں

جنہیں سیلاب کے دنوں ندیاں دور سے بہا کر لاتی ہیں

اور میرے بھائی ان کو اکھٹی کر کے اپنے کندھوں پر اٹھا کر لاتے ہیں

اور آگ جلاتے ہیں

اور جن سے میرے زخموں کو تپش پہنچاتے ہیں

گراں ناز!

تم اگر خود آ کر میرے زخموں کو دیکھ لیتیں

تو ایسی رائے قائم نہ کرتیں

تمہیں یقیناً مجھ سے ہمدردی ہوتی

جونہی میرے زخم بھرے

میرے جسم میں توانائی عود کر آ جائے گی

تب دیکھنا کہ

میں دشمنوں پر کیسے ٹوٹ پڑتا ہوں

یاد رکھو!

اگر پتھر گہرے کنویں میں گر کر ریزہ ریزہ ہو جائے (یعنی پانی میں پگھل جائے)

تب ایک غیور بلوچ کا انتقام فرو ہوتا ہے

لیکن نہ تو پتھر پانی میں ریزہ ریزہ ہوتا ہے

اور نہ ہی بلوچ کا جذبہ انتقام فرو ہوتا ہے

بلوچ کا جذبۂ انتقام دو سو سال تک

ایک دو سالہ ہرنی کی طرح جوان ہے

اے گراں ناز!

تو محشر تک میری بہن ہے

(اثیر (1994):84-80)

اس کے بعد للہ اپنے زخموں کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتا رہا اور کئی دنوں تک بخار میں تپتا رہا۔ اس کو میدان جنگ میں کئی کاری زخم لگے تھے اور وہ بری طرح گھائل ہو چکا تھا۔ لہٰذا اسے ٹھیک ہونے میں بھی کئی دن لگے۔ اسے اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ گراں ناز نے اس کے زندہ بچ جانے کا غلط مطلب لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاش ایک دن گراں ناز خود اپنے گھر آ کر اپنے زخمی اور مجروح شوہر کی حالت دیکھ لیتی تو انہیں یقین آتا کہ اس نے میدان نہیں چھوڑا

اور نہ ہی جنگ سے بھاگا ہے، وہ خود جان لیتی کہ اس قدر زخمی حالت میں کوئی بھی شخص بھاگنے کے قابل نہیں رہتا۔ مگر افسوس گراں ناز نے ایک دن بھی تکلیف نہیں کی اور اپنے والد کے گھر میں بیٹھی اپنے بہادر اور شجاع شوہر کو طعنے دیتی رہی۔ لللہ اپنے زخموں کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتا رہا اور اس دوران اس نے گراں ناز سے کوئی رابطہ نہیں کیا اور نہ ہی اس کو مزید کوئی پیغام بھیجا۔ اس طرح دن گزرتے گئے اور لللہ کو افاقہ ملتا رہا اور اس کے زخم مندمل ہوتے رہے۔
جب وہ مکمل طور پر ٹھیک ہوا، اس کے سارے زخم بھر گئے، اس کے جسم میں سابقہ پھرتی اور توانائی دوبارہ آ گئی اور وہ مکمل طور پر صحت یاب ہوا تو اس نے اپنے بھائیوں اور گھر کے دیگر افراد سے کہا کہ وہ اس کی صحتمندی کو سب سے خفیہ رکھیں اور کسی کو بھی اس کے بارے میں مصدقہ خبر نہ دیں۔ اس کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کی نعل بندی کی اور اس کے ساز کسے، زین ڈالی لگام چڑھایا، زرہ بکتر پہنا، پھر اپنے ہتھیار اٹھائے، اپنا شمشیر آبدار اٹھایا، اپنا تیر و کمان اٹھایا، سنان نوکدار اٹھایا، خنجر زہر دار اُٹھایا اور اسپر (ڈھال) کو گھوڑے کے زین کے ساتھ لٹکا دیا اور پھر اچھل کر اپنے عربی النسل گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے بھائیوں اور گھر کے دیگر افراد کو اللہ حافظ کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر جھلاوان کے پہاڑوں کی جانب اسے سرپٹ چھوڑ دیا۔ کئی دنوں بعد وہ مولہ (درہ مولہ علاقہ جھلاوان خضدار) پہنچا کیونکہ اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کے سسر یعنی میر باران کے قاتل تجارتی کاروان لے کر یہاں سے گزر رہے ہیں۔ لہٰذا یہاں پہنچ کر وہ گھات میں بیٹھ گیا اور جوں ہی اُس طویل کاروان پر اس کی نظر پڑی تو اس نے نہ تو اس کاروان میں شامل لوگوں اور مسلح افراد کے تعداد کی فکر کی اور نہ ہی اسے اپنی جان جانے کی کوئی فکر تھی، وہ تو اپنی چہیتی بیوی کے طعنوں کا جواب دینا چاہتا تھا کہ جس نے اس پر بزدل اور میدان جنگ سے فرار ہونے کا الزام لگایا تھا۔ وہ اسے بتانا اور دکھانا چاہتی تھی کہ وہ نہ صرف یہ کہ بزدل نہیں بلکہ وہ میدان جنگ سے بھاگ جانے والا بھگوڑا بھی نہیں ہے۔ وہ اسے یہ بتانا چاہتا تھا کہ اب بھی خطہ بھر میں اس جیسا دلیر، بہادر اور شجاع جوان کوئی نہیں۔ وہ اسے یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ اب بھی وہ تلوار چلانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا اور اب تک کوئی ایسا جوان پیدا نہیں ہوا کہ جو شمشیر زنی میں لللہ کے سامنے ایک پل بھی ٹھہر سکے۔ کاروان پر نظر پڑتے ہی لللہ کی آنکھیں آگ اگلنے لگیں اور اس کا چہرہ غصے اور غضب سے تپ کر سرخ ہو گیا۔ اس نے

اپنے ہتھیار اٹھائے اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اسے کارواں کی جانب سرپٹ دوڑا دیا اور محافظوں پر انتہائی وحشیانہ انداز میں حملہ کر دیا۔ کاروان کے لوگ اس اچانک ہڑبونگ اور حملے سے گھبرا گئے۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ قضا کا تیر اس علاقے میں، کہ جو مکران سے کافی دور تھا، ان کے سینوں میں پیوست ہوگا۔ لللہ کے اچانک حملے اور وحشیانہ آوازوں سے کاروان والوں میں گھبراہٹ اور سراسیمگی پھیل گئی اور ان میں بھگدڑ مچ گیا۔ پھر تو جس کا جدھر منہ اٹھا وہ فرار ہوا۔ لللہ نے جی بھر کر دشمن کا شکار کھیلا اور درجنوں لوگوں کو مار ڈالا جبکہ باقی ماندہ کاروان چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ اس نے اپنے سسر اور سالوں کے خون کا بدلہ لے لیا تھا اور ان کے دشمنوں کی کثیر تعداد کو قتل کر دیا تھا۔ کاروان کے بعض بھاگے ہوئے محافظ اور دیگر لوگ لللہ سے پہلے ہی مکران پہنچ چکے تھے۔ ان کی زبانی کاروان پر لللہ کے حملے اور کاروان کے بیسیوؤں لوگوں کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح علاقے میں پھیل گئی اور لللہ اور گراں ناز کے گاؤں تک بھی یہ خبر آ پہنچی۔ جب گراں ناز کو اس واقعہ اور لللہ کے انتقام لینے کی خبر سنائی گئی تو وہ حیران ہو گئی اور جب ساری حقیقت حال کا اسے پتہ چلا تو اس نے اُن لوگوں کو بلایا جو اس کے والد کے ساتھ جنگ میں شامل تھے اور کسی نہ کسی طرح بچ گئے تھے اور ان سے پہلی جنگ میں لللہ کے کردار کے بارے میں دریافت کیا تو سب نے کہا کہ "لللہ نے تو پہلی لڑائی میں بھی بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ جس نے دشمنوں کے ہوش اڑا دیے تھے لہٰذا کئی دشمن ایک ساتھ اس پر حملہ آور ہوئے، کئی مسلح لوگوں کی تلواریں اس پر پڑیں اور وہ بُری طرح زخمی ہوا جبکہ اس سے پہلے اس کا جسم اور زرہ بکتر تیروں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ وہ گھوڑے سے گرنے والا تھا کہ ایک ملازم نے اسے سنبھالا اور زخمی لللہ کو بے ہوشی اور شدید زخمی حالت میں میدان جنگ سے نکال لایا تھا ورنہ لللہ جنگ سے بھاگا نہیں تھا اور نہ ہی وہ میدان چھوڑنے والوں میں سے ہے۔ پھر اُن لوگوں نے گراں ناز سے کہا کہ لللہ نے خود بھی آپ کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ شدید زخمی تھا اور کسی اور نے اسے میدان جنگ سے نکال لیا تھا مگر آپ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اب بہادر اور شجاع لللہ صرف آپ کو یقین دلانے کی خاطر اپنے ملک سے نکل کر دور دراز علاقے میں بیسیوؤں دشمنوں پر تنِ تنہا پِل پڑا اور انہیں ایسے مارا جیسے ایک شیر ہرنوں کا شکار کھیلتا ہے اور مولہ کے درے میں انھیں گھیر کر اپنے تیغ آبدار سے ان کے جسموں کو لہولہو کر کے صرف آپ کو

یہ بتانا چاہتا تھا کہ دیکھو لللہ کبھی بھی میدان چھوڑ دینے والوں میں سے نہیں تھا۔ اب آپ کو اس سے معافی مانگنی چاہیے اور اپنے رویے پر معذرت کرنی چاہیے۔

گراں ناز تو پہلے ہی لللہ کی دیوانی تھی اور اس کی بیوی ہونے کی حیثیت سے جو دن اس نے اس کے ساتھ گزارے تھے وہ اس کی زندگی کے بہترین اور خوش گن ترین دن تھے۔ اسے لللہ سے محبت تھی مگر اب لللہ کی اس ادا نے اس کو پاگل بنا دیا اور وہ عشق و جنون کی حد تک اُس سے پیار کرنے لگی تھی۔

لللہ جب اپنے گھر پہنچا تو قصبہ میں داخل ہوتے ہی اس کے قبیلہ کے پیر و جوان۔ زن و مرد، کودک و کلان سب اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس کے گھوڑے کو چاروں طرف سے گھیر کر اس کے حق میں نعرے لگانے لگے۔ وہ اسی طرح جلوس کی شکل میں اپنے گھر پہنچا جہاں اس کے بھائی اور اہلِ خانہ نے اس کا استقبال کیا۔ اس کے بھائیوں نے اسے گلے لگایا اور اسے ساتھ لے کر گھر کے اندر چلے گئے۔ اس طرح لللہ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ گراں ناز کی توقعات کے بالکل برعکس مزاج رکھتا ہے اور گراں ناز کے طعنے بلا جواز اور حقیقت کے منافی تھے۔

گراں ناز اب اپنے سابقہ رویے پر نادم تھی اور اس نے لللہ کو پیغام بھیجا کہ وہ معافی چاہتی ہے، دراصل جذبات کی رو میں بہہ کر اور بعض لوگوں کی غلط بیانیوں کی وجہ سے اس نے اپنے انتہائی بہادر اور پیار کرنے والے شوہر کو ناراض کیا اور اسے بزدلی کے طعنے دیے۔ اب اسے پتہ چل گیا ہے کہ اس کے شوہر لللہ جیسا بہادر کوئی نہیں ہے اور اس جیسا شجاع پورے خطے میں کوئی نہیں ہے۔ مجھے آپ پر فخر ہے کہ اللہ نے مجھے آپ جیسے دلیر اور بہادر انسان کی بیوی بنایا۔ مجھے میرے رویے کی وجہ سے موردالزام نہ ٹھہراؤ اور مجھے معاف کر دو کہ میں عورت ذات ہوں۔ جذبات کی رو میں بہہ کر میں نے نجانے آپ کو کیا کیا کہہ دیا تھا لہٰذا مجھے معاف کر دو اور دوبارہ اپنی زوجیت میں لے لو۔ اپنی قسم کا کفارہ ادا کرو اور مجھ کو پہلے والا مقام دے دو۔

لللہ کو بھی گراں ناز سے بے حد محبت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ گراں ناز اپنے والد اور بھائیوں کی لاش کو دیکھ کر جذباتی ہو گئی تھی اور جنگ میں بچ جانے والوں کو اس نے بزدلی کا طعنہ

دیا تھا۔اب چونکہ وہ اپنے رویے پر ندامت کا اظہار کر رہی تھی لہٰذا للّلہ بھی شش و پنج میں پڑ گیا کیونکہ اس نے اپنے پیغام میں کہا تھا کہ تو قیامت تک میری بہن ہے۔ان حالات میں قاضی کی عدالت میں معاملہ رکھا گیا۔قاضی نے تمام بیانات سننے کے بعد اپنا فیصلہ دیتے ہوئے کہا کہ چونکہ للّلہ نے گراں ناز کے لیے طلاق کا لفظ استعمال نہیں کیا اور صرف غصے کی حالت میں اسے کہا کہ تو میری بہن ہے، اور چونکہ یہ الفاظ بھی للّلہ نے اس لیے ادا کیے تھے کیونکہ اسے بزدلی کا طعنہ ملا تھا، اور اسی طرح گراں ناز نے بھی اسے بھائی اور باپ غصے کی حالت میں اور ایک مخصوص ہدف حاصل کرنے کی حد تک کہا تھا۔اب چونکہ وہ حد حاصل ہو چکی ہے لہٰذا اس قسم کا صرف کفارہ ادا کرنا ہوگا اور اسی طرح اب چونکہ للّلہ نے بھی ان طعنوں کو باطل ثابت کیا اور میدان جنگ میں اپنے دشمنوں سے اپنے سسر اور سالوں کا انتقام لے لیا ہے۔لہٰذا اب اس کی قسم بھی باطل ہو جاتی ہے البتہ اس کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔اس طرح للّلہ اور گراں ناز اپنی قسموں کا کفارہ ادا کر کے دوبارہ یک جان دو قالب بن گئے اور ہنسی خوشی رہنے لگے۔

سموں مست توکلی:

مست توکلی بلوچی رومانوی تاریخ اور بلوچی ادب کی دنیا کا ایک درخشندہ ستارہ ہے کہ جس کے ذکر کے بغیر نہ تو بلوچی رومانوی داستانوں کا باب مکمل ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کے کلام کے بغیر بلوچی ادب کی تکمیل ہو سکتی ہے۔اس داستان کے بارے میں بلوچی، اردو اور انگریزی زبانوں میں کافی تحریری مواد دستیاب ہے جن کے مطالعہ سے بلوچستان کے اس صوفی بزرگ، عاشق اور شاعر کے حالات زندگی کے بارے میں مکمل آگاہی ملتی ہے۔ستر کی دہائی میں محترمہ ذکیہ سردار نے اس سلسلے میں ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں مست توکلی کے مکمل حالات زندگی، ان کا رومان اور شاعری کو بیان کیا ہے۔ بعدازاں بلوچی زبان کے نامور ادیب میر مٹھا خان مری نے سمو بیلی مست کے عنوان سے بلوچی اکیڈمی سے ایک کتاب شائع کروائی جس میں مست توکلی کے حالات اور ان کے کلام کا جائزہ بیان کیا گیا ہے۔جمیل زبیری نے اپنی کتاب فوک ٹیلز آف بلوچستان کے صفحات 1 سے 7 تک مست توکلی کی رومانوی داستان اور سموں کے ساتھ ان کی عشق کی کہانی کو مختصراً بیان کیا ہے۔علاوہ ازیں بھی اس

موضوع پر کئی دیگر بلوچ اور غیر بلوچ ادیبوں اور دانشوروں نے قلم اٹھایا ہے اور ان کے بارے میں کافی معلومات فراہم کی ہیں۔ شفیع عقیل نے بھی پاکستان کی لوک داستانیں نامی کتاب میں مست توکلی کی رومان پر چند صفحات تحریر کر کے اس صوفی بزرگ اور سچے عاشق کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

بعض مصنفین کے مطابق:

> ''سموں مست توکلی کی کہانی بلوچستان کی عوامی داستانوں کی آخری کڑی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کا زمانہ انیسویں صدی عیسوی ہے اور اس کا تعلق ایک ایسے پاک باز بزرگ سے ہے جس کے عقیدت مندوں کی تعداد آج بھی بے شمار ہے جو اسے ولایت کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ بزرگ ہی اس داستان کا مرکزی کردار ہے جس کو نام طوق علی تھا۔''
>
> (عقیل (1997):305)

مست کا تعلق مری قبیلہ کی مشہور و معروف طائفہ شیرانی سے تھا اور وہ شیرانی طائفہ کے درخانی خاندان کے ایک معزز گھرانے میں 1828ء میں بمقام کوہلو پیدا ہوا۔ اس کے خاندان کا ذریعہ معاش گلہ بانی تھا اور وہ بھیڑ بکریاں پال کر اپنا گزر بسر کرتے تھے۔ اس لیے جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اس کے والد نے اسے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ چرانے پر لگا دیا۔ مگر اس کام میں اس کا جی نہیں لگتا تھا کیونکہ مست کی طبیعت بچپن ہی سے صوفیانہ اوصاف سے متصف تھی اور وہ ہر وقت گُم سُم رہتا تھا، اپنے گردو پیش سے بالکل بے نیاز ہو جاتا تھا اور گہری سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ لہٰذا بھیڑ بکریاں چرانے میں بھی وہ اکثر غفلت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ گو کہ بعض دانشوروں کا کہنا ہے کہ انہیں بچپن ہی سے مست کہا جاتا تھا کیونکہ وہ مست الست واقع ہوا تھا (عقیل (1997):306) مگر درست حقیقت تو یہ ہے کہ اس پر مکمل بے خودی اور مجذوبیت کی کیفیت اپنی محبوبہ سمو (سموں) کو پہلی بار دیکھنے کے بعد طاری ہوئی اور پھر مرتے دم تک وہ اپنے حواس پر قابو نہ پا سکا۔ بہر حال جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اپنا ریوڑ چرانے کے لیے مری اور کوہ سلیمان کے سرسبز و شاداب پہاڑوں میں لے جاتا تو سارے ریوڑ مل کر چرتے اور مری قبیلہ کے یہ نوجوان اور کمسن

چرواہے مختلف جنگلی پھلوں سے اپنا پیٹ بھرتے جو ان پہاڑوں میں کثرت سے اگتے تھے۔ مست ان ساری سرگرمیوں سے بے نیاز ایک طرف پڑے نجانے کن سوچوں میں گُم ہو جاتا تھا اور اپنے دوستوں اور ریوڑ سے بالکل بے خبر ہو جاتا تھا۔ واپسی پر بھی اسے ریوڑ کی کوئی خبر نہ ہوتی اس کے دوست ہی سارے ریوڑوں کو اکھٹا کرتے اور پھر اپنے گھروں کی راہ لیتے۔ بعض اوقات کوئی بھیڑ یا بکری ریوڑ میں سے گُم ہو جاتی یا چراگاہ میں ہی بھٹک کر کہیں نکل جاتی اور واپسی پر نہ ملتی تو والد جب مست سے اس کا استفسار کرتا تو وہ چُپ چاپ کھڑا رہتا اور کوئی جواب نہ دیتا۔ کیونکہ اسے تو ان باتوں کا کوئی ہوش ہی نہ تھا اور نہ ہی اسے پتہ تھا کہ وہ ریوڑ کے ساتھ تھا یا نہیں وہ تو اپنی دنیا میں گُم سُم رہتا تھا۔ اس کی والدہ کا انتقال اس کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ وہ کُل چھ بھائی تھے مگر اُس کے چار بھائی یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے اور وہ صرف دو بھائی زندہ رہے۔ اس کے بڑے بھائی کا نام پیرک تھا۔ جب مست کی عمر چودہ برس ہوئی تو اس کے والد کا بھی انتقال ہو گیا اور جب اس کی عمر اٹھارہ برس ہو گئی تو اس نے اپنے بڑے بھائی کی شادی کروادی اور خود ازدواجی بندھن سے آزاد رہا۔ اسے گھومنے پھرنے اور پہاڑوں اور قدرتی نظاروں سے بچپن سے ہی لگاؤ تھا۔ جب بھائی کی شادی کروادی اور وہ اپنے گھر میں مصروف ہوا تو مست مکمل طور پر آزاد ہوا اور اپنے شوق کی تکمیل کرتا رہا۔ اس دوران مست اپنے ریوڑ کو لے کر نکل جاتا اور پھر کئی کئی دنوں تک وہ مختلف علاقوں میں گھومتا رہتا اور اپنے ریوڑ کو بھی چراتا جاتا۔ اس طرح وہ بلوچستان کے تمام پہاڑی چراگاہوں میں گھومتا اور قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ بعض بیانات کے مطابق اس دوران اس پر وجدانہ اور جذب وکیف کی سی حالت طاری ہو جاتی اور وہ کافی دیر تک ہوش وحواس کھو بیٹھتا اور اپنے گردوپیش سے بالکل بے خبر ہو جاتا۔ وہ عین عالم شباب میں تھا اور اس کی شاعری قبیلے میں بہت پسند کی جاتی تھی۔ وہ مجذوبانہ زندگی گزارتا تھا اور کسی سے کوئی غرض وغایت نہیں رکھتا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب وہ سمو کی عشق میں مبتلا ہوا اور پھر ساری زندگی اس کی یادوں کی نذر کی۔ اس نے نہ تو کبھی اسے حاصل کرنے کی کوشش کی اور نہ کبھی اسے حاصل ہوئی مگر نہ صرف دونوں کا عشق لازوال ہوا بلکہ بلوچی زبان کو شاعری کا ایسا بڑا خزانہ ہاتھ آیا کہ جس کی کوئی قیمت مختص نہیں کی جاسکتی۔

سمواور مست کے عشق کی ابتداً کیسے ہوئی اس بارے میں مستند ترین روایت یہ ہے کہ بلوچوں میں چونکہ قبائلی جھگڑے معمول کی بات ہیں لہٰذا کہا جاتا ہے کہ رامکانی مریوں اور شیرانی مرّیوں کے مابین کسی بات پر دشمنی چلی آرہی تھی۔ رامکانیوں نے شیرانیوں کے کچھ لوگ مار دیے تھے یا کوئی نقصان کیا تھا جس کا بدلہ شیرانی مری طائفہ لینا چاہتا تھا۔ قبائلی روایات کے مطابق حملے کے لیے چند نوجوانوں کا قرعہ نکالنا تھا۔ جس کا نام قرعہ میں نکل آتا وہ بدلہ لینے کے لیے چلا جاتا۔ جب قرعہ نکالا گیا تو ان نوجوانوں میں مست بھی شامل تھا جن کا نام نکل آیا تھا۔ مست ایک امن پسند شخص تھا اور اسے دشمنی اور جنگوں سے نفرت تھی، وہ اپنی شاعری میں بھی امن کا پیغام دیتا تھا اور لوگوں کو آپس میں لڑنے سے منع کرتا تھا مگر چونکہ قبائلی روایات کی پاسداری بھی ضروری تھی لہٰذا بادلِ نخواستہ اس نے بھی ہتھیار اٹھائے اور ان نوجوانوں کے ساتھ ہولیا جو بدلہ لینے کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ روایات کے مطابق وہ توڑی نامی پہاڑ کی جانب چل دیے جہاں ان کے مخالفین رہتے تھے۔ ان کو راستے میں شدید بارش نے آلیا۔ جب بارش بہت تیز ہوگئی تو وہ ادھر ادھر کوئی جائے پناہ تلاش کرنے لگے۔ ایک طرف انہیں چند خیمے نظر آئے لہٰذا وہ سب اس طرف چل دیے اور ایک خیمے کے پاس رُک کر آواز دی اور پناہ طلب کی۔ اس وقت اس خیمے میں صرف ایک نوجوان عورت موجود تھی جبکہ اس کا شوہر اپنے ریوڑ کے ساتھ باہر تھا۔ بلوچ قبائلی روایات کے مطابق اس خاتون نے انہیں خوش آمدید کہا اور خیمے میں بلا کر انہیں عزت کے ساتھ بٹھایا اور ان کے ہتھیار ایک طرف رکھ دیے۔ وہ خاتون مہمانوں کی تواضع میں لگ گئی ابھی وہ ان کاموں میں مصروف تھی کہ اچانک بارش تیز ہوگئی اور ساتھ ہی ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ وہ خاتون جلدی سے خیمہ سے باہر نکل گئی اور خیمے کی طنابیں مضبوط کرنے لگی مبادا ہوا سے اُڑ نہ جائیں کہ اچانک تیز ہوا نے اس کے دوپٹہ کو اس کے سر سے اتار دیا اور وہ ہوا میں اڑتی ہوئی دور جا گری۔ اس کے ساتھ ہی تیز ہوا میں اس خاتون کے لمبے سیاہ بال کھل گئے اور ہوا میں لہرانے لگے، وہ بارش میں بالکل بھیگ چکی تھی اور اس کے سارے کپڑے اس کے جسم پر چپک گئے تھے جس سے اس خاتون کے خوبصورت جسم کے اعضاء کے نشیب و فراز دکھائی دینے لگے۔ مست خیمے میں ایسی جگہ بیٹھا ہوا تھا جہاں سے اس کی نظر

اس خاتون پر پڑ رہی تھی۔ اس نے جو یہ منظر دیکھا اور اس کی نظر اس خاتون کے جسم کے نشیب و فراز پر پڑی تو وہ دم بخود رہ گیا۔ اس خاتون کا نام سمو تھا۔ کہتے ہیں کہ مست کو سمو کی ناگنوں کی طرح سیاہ زلفوں، خوبصورت پری جمال چہرے اور حسین و دلآویز جسم نے پاگل بنا دیا اور پھر وہ ساری زندگی اس لمحے کی کیفیت سے نہ نکل سکا۔ پاکستان کی لوک داستانوں کا مصنف لکھتا ہے کہ:

''اس کی نظریں سمو کی ناگنوں کی طرح سیاہ زلفوں، خوبصورت چہرے اور حسین جسم پر جمی ہوئی تھیں اور وہ بیچاری شرما رہی تھی اور یہ تھا کہ مسلسل اسے دیکھے چلا جا رہا تھا۔ اس وقت مست یہ بھی بھول گیا تھا کہ بلوچی قبائلی رسم و رواج کے مطابق کسی شادی شدہ عورت سے عشق کرنا اپنی موت کو دعوت دینا ہے، وہ تو سمو کے چہرے اور جسم میں ایسا گُم ہوا تھا کہ اسے اپنا ہوش تک نہ رہا تھا۔'' (عقیل (1997):307)

یہ تھی اس داستان کی ابتداً کہ جس نے مست کو عالم دیوانگی سے دوچار کیا اور پھر وہ ساری زندگی اسی کیفیت میں رہا۔ وہ بے شک سمو کے جسم و جان، چہرہ اور زلفوں کو دیکھ کر بے خودی میں چلا گیا تھا مگر اس کی یہ بے خودی کسی طلب کے لیے نہیں تھی بلکہ نجانے اس نے اُس لمحے کیا دیکھا اور محسوس کیا کہ جس نے ساری زندگی اس کی زبان پر لفظ سمو کا ورد طاری کر دیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ سمو شادی شدہ اور کئی بچوں کی ماں ہے جبکہ قبائلی روایات میں کسی خاتون یا لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی ناقابل معافی جرم ہوتا ہے مگر اُس لمحے وہ سب کچھ بھول چکا تھا اور عالم بے خودی میں چلا گیا تھا۔ اسے کسی چیز کا ہوش نہ رہا تھا، نہ تو اپنے ساتھیوں کی موجودگی کا اور نہ ہی قبائلی و قومی روایات کا اور نہ ہی سمو کی ایک اکیلی خاتون ہونے کا کہ جو میزبانی کا فریضہ بھی سرانجام دے رہی تھی۔

جبکہ اسی سلسلے میں ایک دوسری روایت بھی ہے جو یوں بیان کی جاتی ہے کہ ایک دن مست اپنے ریوڑ کو دھربی نامی پہاڑی کے قریب چرا رہا تھا کہ اچانک تیز بارش شروع ہو گئی لہٰذا مست ادھر ادھر پناہ گاہ تلاش کرنے لگا تو اسے قریب ہی چند خیمے (بلوچی گدان) نظر آئے۔ وہ اپنا ریوڑ لے کر اُن خیموں کی طرف چلا گیا اور ایک خیمے کے پاس رُک کر آواز دی۔ آواز سُن کر

خیمے کا مالک باہر نکل آیا اور اس کے ریوڑ کو باڑے میں محفوظ کر کے اسے خیمے کے اندر لے گیا اور اس کی خوب خاطر تواضع کی۔ دونوں بیٹھ کر گپ شپ کرنے لگے اور بارش کے رُکنے کا انتظار کرنے لگے مگر بارش تھی کہ رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میزبان نے اس دوران مست کو آرام سے بٹھائے رکھا اور اس کی خوب خاطر مدارت اور تواضع کی۔ حتیٰ کہ رات ہوگئی اور بارش کا سلسلہ ایسے ہی جاری وساری تھا اور ندی نالوں میں طغیانی آگئی تھی اور پورے علاقے میں سیلابی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ ان حالات میں مست کے لیے گھر لوٹنا اور اپنے ریوڑ کو لے جانا ناممکن تھا اس لیے میزبان نے اسے وہیں رات گزارنے کی دعوت دی جسے قبول کرنا مست کی مجبوری تھی۔ وہ بڑی دیر تک بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، یہاں تک آدھی رات ہوگئی اور تیز بارش کا پانی خیمے میں داخل ہونے لگا۔ یہ صورتحال دیکھ کر میزبان نے اپنی بیوی کو آواز دے کر جگایا اور کہا کہ:

''سمو! اٹھو اور خیمے کی رسیاں اور طنابیں مضبوطی کے ساتھ اور اچھی طرح کس دو۔''

حسنِ اتفاق سے مست اُس وقت جاگ رہا تھا اور حقہ پینے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے حقہ بھرا اور دیا سلائی جلائی تا کہ حقہ کے تمبا کو کو حرارت پہنچا کر سلگا سکے، دیا سلائی کی روشنی میں اس نے ایک ایسا منظر دیکھا کہ جس نے مست کی دنیا ہی بدل دی اور ہمیشہ کے لیے اس کو دنیا و مافیا سے بے خبر کر دیا اور وہ تاریخ میں ایک مست و ملنگ مجذوب اور صوفی کے نام سے مشہور ہوا۔ دراصل جب اس نے دیا سلائی جلائی تو اسی وقت اس کی نظر سمو پر پڑی جو اس وقت تازہ تازہ نیند سے بیدار ہوئی تھی اور بغیر دوپٹے کے اپنے پورے سراپا کے ساتھ کھڑی تھی، اس کے سر پر دوپٹہ نہیں تھا اور اس کی سیاہ اور دراز زلفیں گھٹنوں تک پہنچ رہی تھیں اور یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس نے سیاہ چادر اوڑھ رکھی ہو یا ایسے جیسے آسمان سے کوئی اپسرا اُتر آئی ہو کہ جس کے زلفوں نے ہر طرف سیاہی پھیلا دی ہو، اس کا چہرہ اندھیرے میں طلوع ہوتے ہوئے چاند کی طرح نظر آ رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہی وہ لمحہ تھا کہ جب مست اسے دیکھتے ہی اس طرح خود فراموش ہوگیا تھا کہ اسے یاد بھی نہ رہا اس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی دیا سلائی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی انگلیاں جل گئیں اور ان میں آبلے پڑ گئے۔ اس منظر نے طوق علی کو

زندگی بھر کے لیے مست توکلی بنادیا اور صبح تک اس پر غشی کی سی کیفیت طاری رہی اور اس بات کا احساس بھی اسے نہ رہا کہ سمو اس آدمی کی بیوی ہے جو اس کا میزبان ہے اور جس نے اسے ایک طوفانی رات میں موت سے بچا کر اپنے خیمے میں پناہ دی تھی۔ علاوہ ازیں مست نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ ایک شادی شدہ خاتون کو دیکھ رہا ہے جس کو حاصل کرنا ناممکن تھا اور بلوچ قبائلی سماج میں یہ حرکت ناقابلِ معافی تھی مگر اس لمحے مست ایسا بے اختیار ہوا کہ پھر وہ ساری زندگی اپنی سابقہ کیفیت بحال نہ کرسکا اور اسی بے خودی اور بے اختیاری کی حالت میں ہی اس کا انتقال ہوا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ سمو شادی شدہ عورت ہے اور اس کے ساتھ دل لگی کرنا یقیناً غلط ہے اور یہ فعل اچھی نظر سے کبھی بھی نہیں دیکھا جائے گا؛ جیسا کہ وہ خود اپنے کلام میں ایک جگہ کہتا ہے کہ:

"تم جس عورت کو دل دے بیٹھے ہو
وہ شادی شدہ ہے اور زندگی بھر جدوجہد کرنے کے باوجود
تمہارے ہاتھ نہ آسکے گی
اس لیے سمو کا خیال دل سے نکال دو۔"

(عقیل(1997):309)

صبح تک مست کی یہی کیفیت رہی اور وہ ٹکٹکی باندھے سمو کو دیکھ رہا تھا۔ رات بھر کی طوفانی بارش اب رُک چکی تھی مگر ندی نالوں میں طغیانی جاری تھی، مست کا ریوڑ تتر بتر ہو چکا تھا مگر وہ ان باتوں سے مکمل طور پر لاعلم تھا اور نہ ہی اسے ریوڑ کی کوئی فکر اور پرواہ تھی۔ اور جب صبح ہوئی تو سمو کے شوہر سخت غصے میں تھا۔ اس کا تعلق مریوں کے پھروئی طائفہ سے تھا، لہٰذا اس نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو جمع کیا اور کہا کہ اس شخص کو رات تیز اور طوفانی بارش میں میں نے پناہ دی اور یقینی موت سے بچایا، اس کے ریوڑ کو محفوظ کیا، اس کی ہر طرح خاطر تواضع کی اور اس کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھا مگر یہ شخص رات سے مسلسل میری بیوی سمو کو دیکھے جا رہا ہے اور جب سے اسے دیکھا ہے دیوانگی کی سی کیفیت اس پر طاری ہے۔ اس موقع پر بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ چونکہ اس نے ایک شادی شدہ عورت کی طرف بُری نظر سے دیکھا ہے اور ہماری روایات کے مطابق ناقابلِ معافی جرم کا مرتکب ہوا ہے لہٰذا اسے قتل کر دینا چاہیے۔ لیکن جب

انہوں نے مست کا اچھی طرح سے جائزہ لیا تو واقعی وہ دیوانوں کی طرح خودفراموشی کے عالم میں تھا اور اسے تو اپنا بھی ہوش نہ تھا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر لوگوں نے کہا کہ یہ کوئی پاگل اور مجذوب شخص ہے لہٰذا اسے قتل کرنا مناسب نہیں ہے بہتر یہی ہے کہ اس کو اس کے طائفہ اور خاندان والوں کے حوالے کر دیا جائے۔ لہٰذا اسی طرح کیا گیا اور مست کو اس کے قبیلہ والوں کے حوالے کیا گیا۔

مست توکلی کی عشقیہ کیفیت میں مبتلا ہو جانے کی روایات میں تھوڑا سا فرق ضرور ہے مگر ایک بات دونوں روایتوں میں مشترک ہے یعنی یہ کہ وہ ایک طوفانی رات تھی اور شدید بارش میں مست نے سمو کے خیمے میں پناہ لی تھی اور بارش کے دوران ہی اس نے سمو کو دیکھا اور اپنی حالت پر قابو نہ پا سکا اور زندگی بھر کے لیے وہ خودفراموشی کی کیفیت میں مبتلا ہوا۔ وہ اس رات کا تذکرہ اپنی نظموں میں بھی کرتا ہے لہٰذا وہ کہتا ہے کہ:

''بادلوں نے گرجنا شروع کر دیا اور بارش ہونے لگی
ہم بھی نہیں چھپے، بارش میں چلتے گئے کہ
اس بیابان میں کسی قبیلے والے کا گھر نظر آئے
ادھر چلیں جہاں میری موتی جیسی محبوبہ کا خیمہ ہے
میں بھی اپنے ہتھیاروں سے مسلح تھا
سفید بادل گرجے اور رقص شروع کر دیا جیسے شادی بیاہ میں ہوتا ہے
بارش کے تیز چھینٹوں نے خیمے کی طنابیں ڈھیلی کر دیں
اسی وقت طنابیں کس دی گئیں
تیز ہوا نے بارش کے ساتھ مل کر اس کا دوپٹہ سر سے اتار دیا
میری دوربیں اور حیرت زدہ نگاہوں نے دیکھا
میرے جسم کے تمام اعضا نے میری آنکھوں کی تائید کرتے ہوئے ساتھ دیا
اس کی دو آنکھیں لالٹین کی طرح روشن ہیں
چونک جانے والے ہرن کی مانند وحشی ہیں
زلفیں بل کھا کے کالے ناگوں کی طرح شانوں پر پڑی ہیں

مجھے دیوانگی کی لہروں نے اپنے گھیرے میں لے لیا
مجھے نشانے لگنے والی گولی نے مار ڈالا
جب وہ اپنی پُرکیف آنکھیں جھمکاتی ہے
تو عاشق کی بے قراری اور بڑھ جاتی ہے"

(عقیل (1997):10-309)

سمو کے خاندان اور قبیلہ والوں نے مست کو اس کے طائفہ شیرانی کے حوالے کر دیا اور اس کی تمام تر حرکات سے انہیں آگاہ کیا اور یہ بھی کہا کہ وہ اسے قابو میں رکھیں تاکہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ مگر معاملہ یہیں پر انجام پذیر نہ ہوا بلکہ یہ تو آغازِ عشق تھا ابھی تو صرف شروعات تھیں وگرنہ اس بے خودی نے اپنی انتہا کو جانا تھا اور ہمیشہ کے لیے اس کہانی کو امر ہونا تھا۔ مست دوبارہ سمو کے خیمے کی طرف آیا اور دور ایک پہاڑی پر بیٹھ کر ٹکٹکی باندھے سمو کے خیمے کا جانب دیکھنے لگا۔ اب اس نے اپنا معمول بنایا، وہ روز آتا اور اسی طرح دور بیٹھ کر سمو کے خیمے کی طرف دیکھتا رہتا اور اس آس میں لگا رہتا کہ سمو کسی کام سے خیمے سے باہر نکلے گی تو وہ اس کا دیدار کر سکے گا۔ اس کی شاعری اب صرف سمو کے نام ہونے لگی تھی، وہ اپنی شاعری میں سمو کے حسن کی تعریف کرتا، اس کی چاہت اور اس سے ملنے کی خواہش کرتا، اپنی بیقراری اور سمو کے لیے تڑپ کا اظہار کرتا۔ اس کی شاعری کا موضوع اب صرف سمو تھا اور اس کے اشعار صرف اپنی محبوبہ کے لیے ہوتے تھے۔ وہ سمو کے خیمے سے ذرا فاصلے پر بیٹھ کر ٹکٹکی باندھے خیمے کی جانب نگاہ رکھتا تھا اور اس کی آنکھیں تک نہیں جھپکتی تھیں۔ اسی حالت میں وہ سمو کے لیے شاعری کرتا اور اگر کوئی اس کے قریب سے گزرتا تو وہ فوراً اس سے پوچھ لیتا کہ اے بھائی! کیا آپ نے میری سمو کو کہیں دیکھا ہے؟ میری سمو کہاں ہے؟ وہ کیسی ہے اور کس حال میں ہے؟ لوگ اس کو پاگل اور مجذوب سمجھتے تھے اور اس کی دیوانگی اور مخبوط الحواس سوالوں پر ہنس پڑتے، بعض کو اس پر رحم آتا، اور بعض کو اس کی یہ باتیں سن کر غصہ آتا، مگر مست ان تمام باتوں سے بے نیاز ہر وقت سمو سمو کی رٹ لگائے رکھتا تھا۔ وہ پہاڑوں اور پہاڑی چٹانوں سے باتیں کرتا، نباتات اور جنگلی درختوں سے پوچھتا اور ہوا میں اڑتے ہوئے طیور کو اپنا نمائندہ بنا بنا کر اور اپنے پیار بھرے پیغامات کے ساتھ سمو کے خیمے کی جانب بھیجتا اور اسی عالمِ بے خودی اور بے

اختیاری میں وہ بغیر کسی توقف اور کسی جھجک کے کہتا:

''اے سبز پرندے (کبوتر)
جدائی کا شکوہ کرنا چھوڑ دے
چٹان سے نیچے اُتر آ
تاکہ میں تجھے اپنا پیغامبر بناؤں
میرے محبوب کے پاس میرا پیغام لے جا
ہوا میں تیرتا ہوا وسیع میدانوں کو پار کر کے
اس کے پاس جا
میرے محبوب کی نشانیاں یہ ہیں
اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ہیں
اس کی ستواں ناک سرمے کی سلائی جیسی ہے
اس کے دونوں ابرو ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں
میرے دوست کے سینے پر تین لڑوں والا چاندی کا تعویز آویزاں ہے
اس کی گردن کونج جیسی ہے
جس میں سفید چاندی کا زیور زیب دیتا ہے
سمو کی چاہت
میرے بدن پر چابک کی طرح لگ رہی ہے''

(عقیل (1997) :311)

مست کی ان حرکتوں نے پورے علاقے میں ہلچل مچادی اور لوگ اس کی ان حرکتوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور سخت نالاں تھے۔ سمو کا شوہر اور اس کے خاندان والے اس صورتحال سے سخت پریشان تھے کیونکہ مست کی یہ حرکتیں کی ان کی بدنامی اور ندامت کا باعث بن رہی تھیں کیونکہ مست نے بھی انتہا کر دی تھی اور ان کی عورت کے ساتھ کھلے عام عشق بازی کا اظہار کرتا پھرتا تھا۔ لہٰذا سمو کے شوہر کے قبیلہ کے بعض معتبرین مری قبیلہ کے بڑے سردار گزین خان کے پاس گئے اور انہیں بتایا کہ مست کس طرح ان کی بے عزتی

کرتا پھر رہا ہے اور ان کی شادی شدہ عورت کے ساتھ عشق کا اظہار کر رہا ہے جو ان کی ندامت اور شرمندگی کا باعث بن رہی ہے لہٰذا مست کو اس کی ان حرکتوں پر سرزنش کیا جائے اور ان کو اس غلط فعل پر سزا دی جائے۔ انہوں نے سردار گزین خان سے یہ بھی کہا کہ وہ سارا دن سمو کے خیمے کے سامنے بیٹھا رہتا ہے اور خیمے کی جانب نگاہ کیے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے۔

سردار نے پھروئی طائفہ کی تمام باتیں تحمل کے ساتھ سنیں اور ان پر کافی غور وخوض کرنے کے بعد اس نے مست کو طلب کیا مگر اس کا دیوانہ پن اور مجذوبانہ کیفیت دیکھ کر سمجھ گیا کہ یہ سچا عاشق ہے اور اس کی عشق میں کوئی جنسی طلب یا نفسانی خواہش کا عمل دخل نہیں ہے اور یہ جذبہ اس شخص کے روح تک میں حلول کر گیا ہے لہٰذا اس کیفیت سے اس کو نکالنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اس نے سمو کے شوہر اور پھروئی طائفہ کے معتبرین کو سمجھایا اور اس بات کا یقین دلایا کہ طوق علی ایک مجذوب شخص ہے اس سے آپ کو یا آپ کے خاندان کی عزت کو کوئی خطرہ نہیں ہے مگر اُن کی تسلی نہیں ہوئی۔ سمو کے شوہر نے کہا بھی کہ میں کیسے مانوں کہ یہ شخص مجذوب اور دیوانہ ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یہ صبح سے شام تک میرے خیمے کے سامنے نہ بیٹھا رہتا اور ٹکٹکی باندھے میرے خیمے کی جانب نہ دیکھتا۔ وہ دن رات میرے خیمے کے سامنے آخر کس نیت سے بیٹھا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی شاعری میں بھی سمو سمو کی تکرار ملتی ہے۔ اس کے ہر شعر میں میری بیوی کا نام شامل ہے۔ اس نے تو یہاں تک حد کر دی ہے کہ راہ چلتے لوگوں سے بھی سمو ہی کے بارے میں پوچھتا رہتا ہے اور سب سے یہی کہتا ہے کہ میری سمو! میری سمو!۔ سردار نے لاکھ سمجھانے اور مست کی ذہنی کیفیت اور دلی جذبات کے بارے میں انہیں تسلی دینے کی کوشش کی مگر سمو کے شوہر کو کوئی تسلی اور اطمینان نہیں ہوا اور وہ مست سے نجات حاصل کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس سے نجات حاصل کر کے مزید بے عزتی سے محفوظ رہوں۔

مست کی کیفیت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ اب وہ زیادہ بے خود اور دیوانگی کی حالت میں رہنے لگا تھا۔ اس کے اشعار بھی زیادہ بامعنی اور عشق کی بلند تر کیفیت کا مظہر بنتی جا رہی تھیں۔ اسی بے خودی و بے اختیاری کی حالت میں وہ ایک دن اپنے سردار گزین خان کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا: اے مہربان سردار! مجھ پر ایک احسان کر اور میری ایک تمنا پوری

کردے؟ سردار نے بڑی دلچسپی کے ساتھ پوچھا کہ بولو مست کیا چاہتے ہو؟ کیا تمنا ہے تمہاری؟ اگر میں تمہاری تمنا پوری کرسکا تو ضرور کروں گا؟ اس پر مست نے کہا کہ میں نے آج تک سمو سے ملاقات نہیں کی اور نہ ہی کبھی اس سے بات کی ہے، آپ میری اس سے ملاقات کرادے۔ سردار نے سوچا کہ موقع اچھا ہے، کوئی ترکیب ایسی کی جائے کہ جس سے سمو سے ملاقات ہو جائے، تا کہ اس حقیقت کا ادراک ہو سکے کہ اس عشق کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس میں کتنی سچائی ہے؟

سردار گزین نے کچھ دنوں بعد شکار کا پروگرام بنایا اور چند آدمی ساتھ لے لیے جن میں مست بھی شامل تھا۔ وہ شکار کے لیے پھروئی قبیلہ کے علاقے میں پہنچ گیا اور سمو کے خیمے کے قریب ہی اپنا کیمپ لگایا اور اپنی شکار پارٹی کا ڈیرا جما دیا۔ سمو کے شوہر نے جب دیکھا کہ سردار گزین خان ان کے علاقے میں آیا ہے اور اس کے خیمے کے پاس ہی ڈیرا ڈالا ہے تو اس نے اسے اپنے لیے اعزاز سمجھا اور اس کی خاطر تواضع میں لگ گیا۔ اس کے کھانے پینے کا بندوبست کیا اور روایتی کھانے پکوائے اور سردار اور اس کے آدمیوں کو پیش کیے۔ صبح سردار کو اپنی پارٹی کے ساتھ شکار کے لیے نکلنا تھا اور شام تک واپس اپنے ڈیرے پر پہنچنا تھا، لہٰذا صبح ہوتے ہی سمو کا شوہر لکڑیوں کا بندوبست کرنے چلا گیا جبکہ سمو ریوڑ کو لے کر سامنے کی پہاڑیوں کی جانب چلی گئی۔ سردار اپنی پارٹی کے ساتھ شکار کے لیے نکلا جبکہ مست کو اس نے پہاڑیوں کی جانب بھیج دیا کہ تمہاری سمو سے وہاں ملاقات ممکن ہے۔ ایک محقق لکھتا ہے کہ سردار نے یہ سب کچھ پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت طے کیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح سے سمو اور مست کی ملاقات ہو جائے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

> ”سردار نے سمو کے شوہر کو حکم دیا کہ وہ قریبی پہاڑیوں سے لکڑیاں کاٹ کر لائے۔ جب وہ چلا گیا تو اس نے سمو سے کہا کہ وہ اپنا ریوڑ لے کر سامنے والے پہاڑ کے دامن میں جائے اور وہاں چرا کر لائے۔ وہاں پہلے ہی سے مست کو بٹھا دیا گیا تھا اسی لیے سردار نے سمو کو یہ بھی تاکید کی۔ 'اگر تمہیں وہاں مست مل جائے تو اس سے دو چار باتیں ضرور کر لینا۔' یہ سردار کا حکم تھا، بھلا سمو اس سے انکار کیسے کرسکتی تھی۔ وہ سردار کے حکم کے مطابق ریوڑ لے

کر پہاڑ کے دامن میں چلی گئی۔" (عقیل (1997):313)

شفیع عقیل اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے مزید لکھتا ہے کہ:

"وہ ادھر ادھر اپنی بھیڑ بکریاں چرا رہی تھی کہ ایک جگہ مست کو بیٹھے دیکھا۔ اسے کیا معلوم تھا، وہ اس کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھی اور جونہی اس پر مست کی نظریں بڑیں وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ سمو نے قریب جا کر اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ہوش نہ آیا۔ یہ دیکھ کر وہ گھبرا گئی، بھاگی بھاگی سردار کے پاس آئی اور ہانپتے کانپتے کہنے لگی۔

'سردار! آپ کا آدمی وہاں بے ہوش پڑا ہے۔۔۔'

'بے ہوش پڑا ہے۔۔۔؟ وہ کیسے۔۔۔؟'

سردار کے اتنا پوچھنے پر سمو نے بتایا۔

'میں جیسے ہی اس کے قریب پہنچی اور اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اس سے بات کرنے کی بہتیری کوشش کی لیکن اسے ہوش نہیں آیا۔'

یہ سنتے ہی سردار اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور دیکھا مست بے ہوش پڑا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر سب کو یقین ہو گیا کہ مست واقعی سچا عاشق ہے اور اس سے کسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ سردار نے اسی وقت سمو کے شوہر کو بلایا اور کہا۔

مست کے بارے میں بُرا مت سوچو، وہ تو مست قلندر ہے۔۔۔ اگر تم نے اسے کچھ بُرا بھلا کہا تو ہو سکتا ہے کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔۔۔ اس کا عشق پاک ہے۔" (عقیل (1997):313-14)

اس کے بعد علاقے کے تمام باشندوں کو یقین ہو گیا کہ مست کا عشق سچا ہے اور ہوس کی طلب سے مبرا اور آزاد ہے، لہٰذا سب اس کا احترام کرنے لگے اور اس کو جہاں بھی دیکھتے عزت دیتے، مگر ایک گروہ ایسا بھی تھا جو مست سے اب بھی نفرت کرتا تھا اور اس تاڑ میں تھا کہ موقع ملے اور وہ مست کی زندگی کا خاتمہ کر سکے۔ لہٰذا پھروئی طائفہ کے ان مخالفین نے آپس میں مشورہ کیا کہ کسی نہ کسی حیلے سے مست کو مار ڈالا جائے۔ اس کام کے لیے گدا نامی ایک شخص

کی ذمہ داری لگائی گئی کہ وہ موقع کی تاک میں رہے اور جب بھی ایسا کوئی موقع ملا وہ مست کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن مست کسی اونچے پہاڑ پر ٹہل رہا تھا۔ گدا نے دور سے ہی یہ منظر دیکھ لیا تھا لہٰذا موقع غنیمت جانتے ہوئے وہ پہاڑی پر چڑھا اور عین مست کے پیچھے پہنچ کر اسے اونچائی سے دھکا دے دیا۔ مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مست اونچائی سے گرنے کے بعد ایک پرندے کے مانند نیچے پہنچا اور اسے خراش تک نہ آئی اور وہ بالکل صحیح و سالم حالت میں نیچے اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر گدا فوراً پہاڑی سے نیچے اترا اور مست کے پیروں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔ اسی موقع پر مست نے کہا تھا کہ:

''وہ گدا ہو یا طوق علی، دونوں اپنے اپنے مقصد کے لیے دیوانے ہیں
میں سمو کے عشق میں ہوش کھو بیٹھا ہوں اور
گدا اپنی قوم کی عزت کی خاطر میری جان لینے پر دیوانہ ہو رہا ہے''

(عقیل (1997): 315)

لوگوں کو جب اس عجیب و غریب واقعہ کا علم ہوا تو وہ پہلے تو خوف زدہ ہو گئے بعد ازاں وہ جوق در جوق مست کے عقیدت مند بنتے گئے اور اسے اپنا پیر و مرشد ماننے لگے۔ اور اس بات کے قائل ہو گئے کہ مست ایک سچا عاشق اور اللہ کا ولی ہے، اسے اگر کوئی بھی گزند پہنچائے گا تو اسے نقصان ہوگا، لہٰذا مری قبیلہ کے علاوہ بگٹی، کھیتران، لغاری اور دیگر بلوچ قبائل بھی اس کے معتقدین میں شامل ہو گئے۔ سمو کو بھی مست سے آہستہ آہستہ عقیدت ہونے لگی اور اس کے دل میں مست کے لیے محبت کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ مگر اس نے کبھی اپنے رویے سے کسی پر بھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس کے دل میں مست بسنے لگا ہے اور اس نے یہاں اپنا گھروندہ تعمیر کر لیا ہے اب اس کا ٹھکانہ ہمیشہ یہیں پر ہوگا مگر اس کی یہ محبت کسی بھی ہوس اور طلب کے بغیر تھی، وہ صرف دید کی پیاسی ہو گئی تھی اسے مست سے کسی بھی جسمانی تعلق کی خواہش نہ تھی اور نہ ہی کبھی مست نے اپنے رویے یا کسی بات سے کبھی ایسی کسی خواہش کا اظہار کیا۔ ان کی محبت روحانی تھی اور ان ہی جذبات پر مشتمل تھی۔ سمو جب مست کو نہ دیکھ پاتی تو اس کے لیے شدید بے چینی اس کے دل میں پیدا ہوتی۔ وہ بار بار خیمے سے باہر جاتی اور اُن راہوں کو تکتی جہاں سے مست کے آنے کی توقع ہوتی تھی مگر مجال ہے کہ

اپنی بے چینی اور اضطراری کیفیت کبھی کسی پر ظاہر کی ہو۔ وہ معمول کے مطابق رہتی اور اپنے کام کاج میں لگی رہتی تھی۔

مست اب وہ مست نہیں تھا کہ جس کے خون کے پیاسے قبیلہ پھروئی کے نوجوان ہر وقت تاک میں لگے رہتے تھے اور اسے مارنے کے لیے ہمیشہ موقع کی تلاش میں ہوتے تھے، اب وہ سب کا پیرو مرشد تھا اور سب جانتے تھے کہ وہ ایک اللہ والا اور بے ضرر مجذوب اور سچا عاشق ہے، کسی کو بھی اس سے کسی بھی نقصان کا اندیشہ نہیں ہے بلکہ وہ روحانی طاقتوں کا مالک ہے اور وہ بہت پہنچی ہوئی ہستی ہے۔ اب مست براہِ راست سمو کے خیمے میں آتا اور سمو اور اس کا شوہر دل و جان سے اس کی خدمت کرتے۔ سمو سے ملاقات اور اسے دیکھنے کے بعد مست کی بے خودی اور جذب و مستی مزید بڑھ گئی اور اب وہ کئی کئی دنوں تک جنگلوں، پہاڑوں اور بیابانوں میں گھومتا رہتا تھا اور کئی روز تک غائب رہتا۔ اور جب کئی دنوں کی غیر حاضری کے بعد وہ اچانک نمودار ہو جاتا اور سمو کے خیمے میں پہنچتا تو سمو خوشی اور مسرت سے نہال ہو جاتی اور دل و جان سے مست کی خدمت میں لگ جاتی۔ اس سے حال احوال پوچھتی، اس کے گذشتہ دنوں کی مصروفیات اور غیر حاضر رہنے کی وجہ پوچھتی اور انتہائی پیار اور محبت سے اس سے تکلم کرتی۔ جواب میں مست اسے منظوم انداز میں اپنی مصروفیات سے آگاہ کرتا اور اس کے سوالوں کا جواب محبت بھرے انداز میں اس کے ناز اٹھا اٹھا کر دیتا۔ چونکہ سمو کے خاندان کا پیشہ گلہ بانی تھا لہٰذا وہ ان پہاڑوں میں ادھر ادھر نقل مکانی کرتے رہتے تھے مگر سمو جہاں بھی ہوتی مست وہاں پہنچ جاتا اور اپنی سمو کو تلاش کر لیتا، وہ اپنی سمو سے کبھی بھی جدا نہیں رہتا تھا، اگر سمو اس کے پاس نہ ہوتی تو اس کے اشعار میں ہوتی، اس کے دل میں ہوتی، اس کی روح میں ہوتی اور اس کے تن بدن میں ہوتی۔ وہ جہاں بھی ہوتا وہ سمو کے لیے اشعار کہتا اور سیلانی بنا یہاں سے وہاں گھومتا رہتا۔ اب تو وہ سمو کے خیمے سے دور بیٹھ کر اس کا دیدار بھی نہیں کرتا تھا، اب تو وہ دونوں میاں بیوی یعنی سمو اور اس کا شوہر دونوں اس کے عقیدت مندوں میں شامل ہو چکے تھے۔ اس لیے جب وہ آتا تو سیدھا انہی کے خیمے میں چلا جاتا اور اقامت اختیار کرتا جہاں اس کی خوب خاطر مدارت ہوتی۔ اپنی ان مصروفیات کو جو وہ سمو کے سامنے بیان کرتا تو کچھ یوں گویا ہوتا:

''خوشا تیری متوالی چال جو تیری دلفریب ہنسی کی ترجمانی کرتی ہے
میں کوہلو، کاہان اور بارکھان کے علاقے تیری سبک رفتاری پر قربان کردوں
اے سمو! تیری سبک رفتاری پر مست کی آنکھیں قربان ہیں
مجھے روح نے بے چین کردیا ہے، اے سمو آؤ اس پہاڑ سے نکل چلیں
آمیری محبوبہ! میں تجھے اچھے راستوں پر لے چلوں
سمو کی شکل وصورت کی مثال کہاں سے لائیں
جہاں بھی تلاش کریں سمو کا جواب نہیں ملتا
سمو ایسی حسین ہے جیسے آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے
سمو کے بدن کی خوشبو ایسی ہے جیسے بارش کے بعد زمین سے قدرتی مہک آتی ہے
میں سفر سے واپس لوٹ آیا کہ سمو کا حال معلوم کروں''

(عقیل (1997):316)

مست کی محبت اور عشق کے قصے ہر سو پھیل چکے تھے اور ہر ایک جانتا تھا کہ سمو اس کے روئیں روئیں میں رچ بس گئی ہے اور وہ جہاں بھی جاتا ہے سمو اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ مست کی بارے میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ سردار میر محمد گشکوری کا مہمان بنا تو گشکوری سردار نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور اسے ایک صاف ستھرا اور وسیع کمرہ سونے کے لیے دیا اور اس میں بڑے سے پلنگ پر صاف ستھرا اور آرام دہ بستر بچھایا۔ سردیوں کا موسم تھا اور کمرے کے آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔ سردار گشکوری نے مست سے کہا کہ حضور آپ پلنگ پر تشریف رکھیں تو مست نے کہا کہ نہیں وہ جگہ سمو کی ہے، پھر اس نے ایک خالی کٹورا مانگا جو فوراً پیش کیا گیا، مست وہ کٹورا لے کر تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا گیا اور جب واپس آیا تو وہ کٹورا تازہ دودھ سے لبالب بھرا ہوا تھا، اہل مجلس حیران رہ گئے۔ جب سردار گشکوری نے اس سے اس دودھ کے بارے میں پوچھا تو مست نے کہا کہ سمو کے ہرنیوں کا دودھ ہے، پھر ایک گھونٹ اس دودھ میں سے پی کر باقی سردار گشکوری کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ دودھ سمو کی سہیلیوں میں تقسیم کردو۔ (عقیل (1997):316)

اس طرح کے کئی دیگر واقعات بھی ان کی ذات گرامی سے منسوب کیے جاتے ہیں

جن میں مست کے کرامات کے ساتھ ساتھ عشق میں ان کی دیوانگی اور جنون کی انتہا نظر آتی ہے۔ ایک مرتبہ مست بگٹی قبیلہ کے سردار غلام مرتضیٰ کے پاس پہنچا اور اس سے ایک خواہش پوری کرنے کی استدعا کی۔ سردار غلام مرتضیٰ بگٹی نے کہا کہ کہو مست کیا فرمائش ہے جو مجھ سے کرنا چاہتے ہو، اگر میں پوری کر سکا تو ضرور کروں گا۔ مست نے کہا کہ مجھے سمو سے شادی کرنی ہے مجھے کچھ ڈومب (گویے اور ڈھولچی) اور شادی کا نیا جوڑا دے دو۔ سردار غلام مرتضیٰ نے اسی وقت ان چیزوں کا بندوبست کیا بلکہ مست کے لیے جوڑا بھی تیار کروایا اور سمو کے لیے جوڑا اور کچھ زیورات بھی تیار کروا کے مست کے حوالے کیے۔ کچھ سوار بھی ساتھ کر دیے اور ضیافت کے لیے کچھ بھیڑ بکریاں بھی دے دیں۔ مست ڈھولچیوں، سواروں اور جانوروں کو لے کر سمو کے علاقے کی جانب چل پڑا اور ایک مقام پر جو مری بگٹی علاقے کا سرحد اور مقام اتصال تھا، وہ رُک گیا اور ڈھولچیوں سے کہا کہ وہ ڈھول بجائیں اور ناچیں گائیں کیونکہ اس کی شادی ہونے والی۔ قارئین کرام یہ ذہن میں ہو کہ سمو کا علاقہ یہاں سے سوڈیڑھ سو میل دوری پر واقع تھا اور اسے اس بات کا علم بھی نہیں تھا کہ مست نے یہاں اس سے شادی کا بندوبست کیا ہے۔ بہر حال کافی دیر تک ڈھولچی ڈھول بجاتے رہے اور مست کے ہمراہی ناچتے کُودتے رہے، ضیافت ہوئی اور پھر مست نے انہیں رخصت کرتے ہوئے کہا کہ جا کر سردار غلام مرتضیٰ بگٹی سے کہنا کہ مست کی شادی بڑی دھوم دھام سے سمو کے ساتھ ہوگئی ہے۔ یقیناً یہ مست کی دیوانگی کی انتہا تھی اور وہ سمو پر اپنا سب کچھ نچھاور کر چکا تھا۔ وہ خیالوں اور سوچوں میں سمو کو اپنا بنا چکا تھا اور جہاں بھی ہوتا وہ اسے میری سمو کہتا حتیٰ کہ سمو کے شوہر کے سامنے بھی وہ ان الفاظ کے استعمال سے نہیں کتراتا جبکہ سمو کا شوہر اسے مجذوب اور اللہ کا ولی سمجھ کر کچھ نہیں کہتا اور ان باتوں سے درگذر کرتا۔ وہ مست کے کرامات کا دل و جان سے قائل ہو چکا تھا اور اس کی باتوں کو اپنے لیے تحفہ سمجھتا تھا۔ وہ اسے اپنی بیوی سمو کے ساتھ بیٹھنے اور گپ شپ کرنے سے کبھی نہیں روکتا اور نہ ہی اپنی بیوی کو مست کی خدمت اور تواضع کرنے سے منع کرتا۔

اسی طرح ایک بار مست کی دیوانگی اور عشق کا امتحان ایک اور بلوچ سردار، سردار جمال خان لغاری نے بھی لینے کی کوشش کی۔ کہتے ہیں کہ مست ایک بار ڈیرہ غازی خان پہنچا۔ وہ سیر سپاٹے کرتا اور گھومتا گھامتا ہوا ڈیرہ جات پہنچا اور سیدھے سردار جمال خان لغاری کے

ڈیرے پر چلا گیا۔ سردار جمال خان لغاری نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور رات کو اپنے ہاں ٹھہرایا۔ سردار جمال خان لغاری نے سوچا کہ کیوں نہ مست کے عشق کی سچائی کا امتحان لیا جائے اور انہیں پرکھا جائے کہ وہ واقعی سمو سے سچا عشق کرتے ہیں یا صرف جسمانی طلب تک ہی اس کی خواہش ہے لہٰذا اس نے رات کو ایک بڑے آرام دہ کمرے میں مست کو رکھا۔ اس کی خوب خاطر تواضع کی اور اس کے لیے موسیقی کی محفل سجائی، رات گئے جب مست اپنے کمرے میں جانے لگا تو منصوبہ کے تحت سردار جمال خان لغاری نے پنجاب کی ایک مشہور و معروف اور حسین وجمیل طوائف موراں کو طلب کیا اور کہا کہ مست توکلی (طوق علی) ہر وقت سمو سمو کی رٹ لگائے رکھتا ہے اور اسے اپنی محبوبہ قرار دیتا ہے، تم آج رات اسے اتنی محبت دو کہ وہ سمو کا خیال دل سے نکال دے اور اسے آئندہ کے لیے سمو کا نام بھی یاد نہ رہے اور اس بات کا سب کو یقین ہو جائے کہ سمو کا نام اور اس سے سچے عشق کا اظہار دراصل مست کا ایک ڈرامہ ہے جسے آج ختم ہو جانا چاہیے۔

دوسری طرف سردار جمال خان لغاری نے مست سے کہا کہ آپ آج رات یہیں رُک جائیں اور اس سجے سجائے کمرے میں رات بسر کریں کیونکہ رات سمو آپ سے ملنے اسی کمرے میں آجائے گی۔ مست تو دیوانہ اور مجذوب انسان تھا وہ اتنی بڑی مکاری اور چالبازی کہاں سمجھ سکتا تھا، وہ تو سمو کے نام کو سنتے ہی حواس کھو بیٹھتا تھا اور اس کے بعد کچھ بھی سننا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ لہٰذا جب سردار جمال خان نے اسے سمو سے رات کو ہونے والی ملاقات کی خوشخبری سنائی تو وہ خوشی سے نہال ہو گیا اور وہ اسی سجے سجائے کمرے میں رات بسر کرنے پر راضی ہوا۔ رات کو کھانا کھانے اور محفل کے بعد جب مست کمرے میں جانے لگا اور سمو کے آنے کا انتظار کرنے لگا تو منصوبے کے مطابق تھوڑی دیر بعد موراں بھی اسی کمرے میں چلی گئی۔ جب وہ مست کے سامنے آگئی اور اپنی اداؤں اور اپنی لچکیلی جسم کی جنبشوں سے مست کو اپنی جانب متوجہ کرنے لگی تو مست نے اس سے پوچھا کہ میری سمو کہاں ہے؟ اس نے ایک قاتل انگڑائی لیتے ہوئے انتہائی دلربائی سے کہا کہ طوق علی آج میں تمہاری سمو ہوں، کیا کرنا ہے اس پہاڑی عورت سمو کو، آج میری طرف دیکھو اور مجھ سے لطف اندوز ہو جاؤ، میں سارا جسم و جان تم پہ نچھاور کر دوں گی اور آپ کو اتنی محبت دوں گی کہ آپ سمو کا نام ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ

گے۔ موراں نے اپنے جسم کے ایک ایک عضو کو مست کے سامنے نمایاں کیا اور ایسی ایسی ادائیں کی کہ شیطان بھی جن سے پناہ مانگے، اس نے اپنے خوبصورت جسم اور قاتل اداؤں سے مست کی توجہ حاصل کرنے کی بہت کوشش کی مگر اسے اپنے مقصد میں کوئی کامیابی نہیں ملی۔ مست مسلسل آنکھیں جھکائے نیچے دیکھ رہا تھا اور موراں کی باتوں کے جواب میں اسے کہہ رہا تھا کہ میں سمو کی امانت ہوں اور اس کے سوا کسی کو دیکھنا گناہ سمجھتا ہوں۔ موراں نے دلربائی کا ایک ایک حربہ استعمال کیا، مست کو منانے اور جسمانی تعلق قائم کرنے کی ہر طرح کوشش کی اور فحاشی کا ہر تیر چلایا مگر مجال ہے کہ مست نے آنکھ اٹھا کر بھی اس کی جانب دیکھا ہو اور اسے چھوا تک ہو۔ بالآخر مست کسی نہ کسی طریقے سے وہاں سے بھاگ جانے میں کامیاب ہوا۔ اس واقعہ کے بارے میں بھی مست نے ایک نظم کہی ہے جو کچھ یوں ہے:

''طوائفوں میں موراں بہت مشہور ہے
وہ چودھویں کے چاند کی طرح آئی
ساون کے بادلوں کی طرح مٹکتی ہوئی آئی
اپنی زلفوں کی خوشبو بکھیرتی ہوئی آئی
اپنے خوبصورت دراز گیسوؤں کے ساتھ
وہ کہنے لگی میں تیری ہوں اور کسی کی نہیں
آدھی شب کے لمحوں میں تجھے بہلاؤں گی
تجھے اپنے وطن جانا بھول جائے گا
اس پر مست، سفید بادلوں کی طرح گرج اٹھا
اس نے کہا۔۔۔اے میرے طاقتور سردارو
مجھے زبردستی طوائف کے ساتھ کمرہ میں بند مت کرو
دل کو قید کرنے والی بھنگ مجھے زبردستی نہ پلاؤ
میں فاحشہ عورتوں کے لیے
سمو سے کیا ہوا عہدِ وفا نہیں توڑ سکتا''

(عقیل (1997):19-318)

مست کی بے چینی کی حالت یہ تھی کہ وہ ایک جگہ کبھی ٹک کر نہ بیٹھ سکا اور ساری زندگی سیر و سیاحت اور گھومنے گھامنے میں بسر کی۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ اس نے ہندوستان، سندھ اور پنجاب کے کئی شہروں کی سیاحت کی، بزرگانِ دین کے مزاروں کی زیارت کی اور طویل مسافت کے بعد بالاخر سمو کے پاس لوٹ آیا۔ اس نے سمو کے ہاں چند دن قیام کیا اور پھر جب وہاں سے رخصت ہونے لگا تو وہ بہت اداس تھا، اس نے وہاں سے رخصت ہونے سے قبل ہر شئے کو بڑی حسرت کے ساتھ دیکھا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا۔ وہ وہاں سے کاہان چلا گیا لیکن بے چین طبیعت کو قرار نہ آیا۔ اس کی بے چینی حد سے بڑھ گئی اور وہ بہت اداس اداس ر رہنے لگا تھا۔ کاہان سے اس نے مخماڑ کا رخ کیا اور چند آدمی بھی ساتھ لے لیے۔ وہ بہت تیز تیز جا رہا تھا اور اپنے ساتھیوں سے کافی آگے نکل چکا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں جا رہا ہوں تم سب سمو کے گاؤں کی طرف آجانا۔ اس کے بعد مست ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور جب باقی لوگ سمو کی قیام گاہ پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں آہ و زاری ہو رہی ہے اور پھروئی طائفہ کے لوگ جمع تھے کیونکہ سمو کا انتقال ہو چکا تھا۔ انہوں نے سمو کو دفن کر دیا تھا اور مست سمو کی قبر کے پاس کھڑا زور زور سے ان سے کہہ رہا تھا کہ تم لوگوں نے میری اجازت کے بغیر میری سمو کو کیسے دفن کر دیا۔ سمو کا شوہر نے اس کے پاس آکر کہا سائیں مست! تم جہاں کہیں کہو ہم سمو کو دوبارہ وہاں دفن کر دیتے ہیں۔ جواب میں مست اپنے عصا کے سہارے قبر کے پاس جھکا خاموش کھڑا رہا اور تھوڑی دیر بعد بولا کہ میں نے سمو کی مرضی دریافت کر لی ہے۔ سمو کی خواہش ہے کہ اسے یہیں دفن رہنے دیا جائے۔ اس کے بعد مست نے تمام لوگوں کو وہاں سے جانے کا کہا اور خود قبر کے پیروں کی طرف بیٹھ گیا اور کئی دنوں تک وہیں بیٹھا رہا۔ مخماڑ کی وادی میں جہاں سمو آسودہ خاک ہے وہ مقام اب بھی سمو پٹی یا سمو کا میدان کہلاتا ہے۔ مست کو سمو کی موت نے مکمل طور پر ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا اور وہ ہر وقت سمو سمو پکارتا جاتا تھا۔ اس نے سمو کی موت پر جو نظم کہی تھی اس کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

''مجھے عرش کے فرشتوں نے زمین پر خبر دی ہے کہ
سمو جنت میں طوبیٰ کے نیچے حوروں کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے
وہ نورانی پیالوں میں آبِ کوثر پیتی ہے

ایک نورانی پیالہ مست کے لیے بھی رکھا ہوا ہے
سموکی خوش خرامی کی نقل کرنے کے لیے کونجوں نے قطار بنا رکھی ہے
وہ اپنی زبان میں نازک حسیناؤں کو آواز دیتی ہے
مست سندھ کے دور دراز علاقوں میں گھوم رہا ہے
اے سمو! میں سندھ میں تیری ہم شکل تلاش کر رہا ہوں
حالانکہ میں جانتا ہوں، تمہارا بدل نہیں مل سکتا
کیونکہ تم جیسا کوئی نہیں"

(عقیل (1997):320)

مست سیلانی تو پہلے ہی سے تھا مگر جب تک سمو زندہ تھی وہ کچھ دن ادھر ادھر گھوم پھر کر دوبارہ سمو کے ہاں چلا آتا اور کچھ دن اس کے خیمے میں قیام کرتا اور پھر کسی نئی سمت میں نکل جاتا۔ سمو کی وفات کے بعد تو وہ بالکل ہی ایک سیاح بن گیا تھا۔ پہلے جس طرح کچھ دن اِدھر اُدھر گھوم پھر کر سمو کے پاس دوبارہ پہنچ جاتا مگر اب اس کے لیے اپنے علاقہ میں کوئی کشش باقی نہ رہی۔ لہٰذا اب وہ ہر وقت سیر و سیاحت کرتا اور نگر نگر گھومتا رہتا تھا۔ سمو تو باقی نہیں رہی تھی لہٰذا وہ اپنے علاقے میں آتا بھی تو کس کے لیے آتا۔؟ اب تو وہ سمو کی یاد میں شاعری کرتا، پہاڑ پہاڑ، صحرا صحرا گھومتا، وادی وادی، قریہ قریہ پھرتا اور اپنی سمو کو یاد کرتا رہتا تھا۔ اس کی زندگی کا سارا اثاثہ اب صرف سمو کی یادیں تھیں اور ان کے علاوہ مست کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ وہ سمو کے لیے اشعار کہتا اور لوگ اس کی شاعری کو سنتے، از بر کر لیتے اور دیگر لوگوں کو سناتے۔ اس طرح اس کی شاعری زبانِ زدِ عام ہوتی گئی، جو بعد ازاں سینہ در سینہ منتقل ہوتی گئی اور بالآخر اسے تحریری طور پر محفوظ کر لیا گیا اور بلوچی زبان و ادب کے بہترین اور انمول اثاثوں میں شامل کیا گیا۔

مست توکلی (طوق علی) سمو کے بعد زیادہ تر سیاحت ضرور کرنے لگا تھا مگر اس کی طبیعت اب خراب رہنے لگی تھی۔ وہ بیمار رہنے لگا تھا اور بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس حالت میں بھی اس کے لبوں پر ہر وقت سمو سمو کا نام ہوتا تھا۔ اسی حالت میں 1895ء میں اس کا انتقال ہوا اور اسے کوہلو سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ندی کنارے دفنایا گیا کیونکہ یہیں پر اس کا

انتقال ہوا تھا اور انتقال سے کچھ دیر پہلے ہی اس نے اس جگہ کو اپنے آخری آرام گاہ کے طور پر خود منتخب کیا تھا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر 67 برس تھی۔ اس کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے اور دور دراز سے لوگ یہاں آتے ہیں اور مست کے لیے دعائیں مانگنے کے ساتھ ساتھ اپنی مرادیں برآنے کے لیے بھی دعا کرتے ہیں۔ بالخصوص عاشق لوگ یہاں آتے ہیں اور اپنی دلی خواہشات کی تکمیل کے لیے مست کو ذریعہ دعا بناتے ہیں۔

عزت و مہرک:

بلوچستان کی ہر صدی کی تاریخ میں محبت بھری داستانیں اور رومانوی کہانیاں ملتی ہیں۔ سسی پنوں اور حانی شہہ مرید کی قدیم رومانوی داستانوں کے علاوہ انیسویں صدی عیسوی میں بھی اس قوم کی تاریخ میں تسلسل کے ساتھ محبت کی داستانیں ملتی ہیں۔ مست توکلی کی داستان جس طرح انیسویں صدی عیسوی کی بڑی رومانوی اور محبت کی سچی داستانوں میں شمار ہوتی ہے تو اسی طرح بلوچ قوم کی مذکورہ صدی کی تاریخ میں عزت و مہرک کی محبت کی سچی داستان بھی شہرت پانے والی محبت کی سچی داستانوں میں شامل ہے۔

عزت و مہرک کی داستان بلوچی ادب اور ثقافت میں بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اسے بلوچی کے بڑی لوک داستانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس داستان کا مرکزی کردار بلوچی زبان و ادب کا مشہور و معروف شاعر مُلا عزت ہے جو مرزا اسد اللہ خان غالب کا ہم عصر تھا۔ عزت کو جس لڑکی سے محبت ہوئی تھی اور جس کے عشق میں وہ مبتلا ہوا تھا اس کا نام مہر بانو تھا (بعض دانشور مہر خاتون، مہر النساء بھی لکھتے ہیں) جبکہ اسے اس کی ہمجولیاں اور گھر والے پیار سے مہرک کہتے تھے۔ وہ ایرانی مکران میں پیردان نامی قصبے میں رہتی تھی۔ مہرک کا والد علاقے کا ایک متمول اور صاحبِ حیثیت شخص تھا اور اس کے پاس مال و دولت کی کوئی کمی نہیں تھی جبکہ اس کی بیٹی لاکھوں میں ایک تھی اور ظاہری حسن و جمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ وہ بلاشبہ حسن و خوبصورتی کی ایک شاہکار تھی کہ جسے جو بھی دیکھتا تو اس کی حسن وخوبصورتی پر انگشت بدندان رہ جاتا۔ مہرک کے حسن وخوبصورتی کے چرچے پورے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے اور سب جانتے تھے کہ پیردان کی رہنے والی یہ لڑکی بلاشبہ حسن وخوبصورتی کا ایک انمول نمونہ ہے۔ مُلا

عزت جو اس کا عاشق تھا، اپنی ایک نظم میں ٭ مہرک کے سراپا اور حسن و خوبصورتی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

''پیردان میں مہرک نام کی ایک حسین و جمیل دوشیزہ رہتی ہے
اس کی نرگسی آنکھوں میں شراب کا سا نشہ تھا
اس کے رخساروں میں شفق کی سی سرخی ہے
اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ایک عالم کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہے
اور اس کی سیاہ زلفیں ناگنوں کی طرح ہیں
ہر راہ رو کو ڈسنے کے لیے تیار رہتی ہیں''

(عقیل (1997):88-287)

ملا عزت کی محبت اور اس کا عشق شروع سے آخر تک ناکامی سے ہی دوچار رہا اور اسے مہرک کو حاصل کرنے میں شدید ناکامی ہوئی لہٰذا اس نے ایران میں موجود اس بلوچ علاقے کو بددعا دی۔ اور اس قصبے کے بارے میں اس نے درج ذیل اشعار کہے:

''اے پیردان! تیری سرزمین نے
مہرک جیسی حسین و جمیل دوشیزہ کو نگل لیا
خدا کرے تیری ان رنگین فضاؤں پر
بھیانک موت کی اداسیاں چھا جائیں''

(عقیل (1997):288)

اس داستان کا آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں سرباز (ایرانی بلوچستان) کے نواح میں ایک سرسبز قصبہ آباد تھا جو پیردان کہلاتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا مگر یہاں کے لوگ خوشحال اور آسودہ زندگی گزارتے تھے اور سکھ وچین سے رہتے تھے۔ انہیں بظاہر کوئی دنیاوی کمی اور تکلیف نہ تھی۔ وہاں دولت کی ریل پیل تو نہ تھی لیکن لوگ ہنسی خوشی اور امن کے ساتھ رہتے تھے اور اپنی ضروریات زندگی احسن طریقے سے حاصل کرتے تھے۔ اس قصبہ میں سالک نامی ایک شخص بھی اقامت پذیر تھا۔ جو یہاں کا متمول ترین شخص تھا اور قصبہ کا ہر فرد اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس کا دل سے احترام کرتا تھا۔ سالک کے پاس

دنیاوی مال و دولت اور جاہ و حشمت کی کوئی کمی نہ تھی اور علاقہ بھر میں اس کا احترام کیا جاتا تھا مگر اسے اگر کوئی کمی تھی تو وہ اولاد کی تھی کیونکہ وہ شادی کے کئی سال بعد تک بھی اس نعمتِ خداوندی سے محروم تھا۔ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے اولاد کی خواہش اور دعا کیا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ خواہش بھی پوری کر دی اور اس کے گھر ایک خوبصورت اور چاند جیسی بیٹی پیدا ہوئی۔ سالک کے گھر بیٹی کی پیدائش پر نہ صرف ان کے گھرانے میں بلکہ قصبہ بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور سالک کے گھر مبارکباد کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ چونکہ یہ سالک کی پہلی اولاد تھی جو ہزاروں منتوں اور دعاؤں کے بعد پیدا ہوئی تھی اس لیے اس نے دل کھول کر اس کی پیدائش پر دولت لٹائی اور خوب خوشیاں منائیں۔ پورے قصبہ میں کئی دنوں تک سالک کی بیٹی کی پیدائش کی خوشی میں جشن کا سا سماں رہا اور غریب غربائیں کھانا تقسیم ہوتا رہا۔ سالک نے حکم دیا تھا کہ قصبہ والوں کی ایسی دعوت کی جائے کہ لوگ اسے ہمیشہ یاد رکھیں۔ گو اسے بیٹے کی خواہش تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے ایک بیٹا عطا کرے تاکہ وہ اس کی میراث کو بھی سنبھال سکے اور اس کا نام و نسل بھی زندہ رہ سکے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹی کی شکل میں اولاد عطا کی تو وہ اس پر بھی صابر و شاکر رہا اور دل کھول کر خوشیاں منائیں۔ بیٹی بھی خوبصورتی اور حسن میں بے مثال تھی۔ پیدائش کے وقت بھی جو اسے دیکھتا تو دیکھتا ہی رہ جاتا۔ دیکھنے والوں کے منہ سے بے ساختہ نکلتا کہ

> ''ماشاءاللہ! پورے قصبے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے یہ سب سے منفرد اور یکتا ہے اللہ اسے نظرِ بد سے بچائے۔'' (عقیل (1997):288-89)

سالک اس کی بیوی اور دیگر اہل خانہ بیٹی کی پیدائش پر خوشی سے شاداں تھے اور انہوں نے بیٹی کے لیے اچھے اور مناسب ناموں پر غور شروع کیا۔ مختلف نام پیش کیے گئے مگر اس کا والد ایک نام سن کر خوش ہوا اور اپنی بیٹی کا وہی نام رکھا یعنی مہر بانو۔ سالک کے گھر میں کسی بھی چیز کی کمی نہ تھی، مال و دولت، نوکر چاکر، خدام و کنیز۔ لہٰذا مہر بانو بڑے نازوں میں پلنے لگی اور اس کی پرورش اعلیٰ اور شاہانہ انداز میں ہونے لگی۔ مہر بانو جوں جوں بڑی ہوتی جا رہی تھی اس کے حسن و خوبصورتی بھی بڑھتی جا رہی تھی اور وہ دن بدن نکھرتی جا رہی تھی۔ اس کے بے تحاشا حسین و جمیل چہرے پر جب کسی بوڑھی عورت کی نظر پڑتی تو وہ حیران رہ جاتی اور

بے ساختہ کہتی کہ ''مہرک یقیناً بڑی ہوکر مہر بن کر چمکے گی'' اس کو جو کوئی بھی دیکھتا اس کی تعریف کیے بنا رہ نہیں پاتا۔ اس کی خوبصورتی اور حسنِ لازوال کو دیکھ کر علاقے کے لوگ اور عزیز واقربا اسے مہربانو کی بجائے مہرک کے نام سے پکارتے تھے۔

بعض دانشور لکھتے ہیں کہ اس کی خوبصورتی اور رعنائی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور جو بھی اسے دیکھتا اس کی تعریف کیے بنا نہ رہ پاتا۔ جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو رواج کے مطابق اس کی نسبت اس کے چچازاد بھائی کی ساتھ طے کی گئی جو مہرک سے بے حد محبت کرتا تھا اور مہرک بھی اسے دل وجان سے چاہتی تھی۔ ان کی محبت کے بارے میں خاندان والے بھی جانتے تھے لہٰذا ان کی نسبت اسی لیے طے کی گئی کہ دونوں کو ایک دوسرے سے پیار ہے اور دونوں ہی ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ خاندان والوں کا خیال تھا کہ ان دونوں کی جوڑی خوب جمے گی اور ان کا مستقبل بہت شاندار ہوگا۔ یہ کامیاب اور مثالی زندگی گزاریں گے۔ (عقیل (1997):89-288)

لیکن شاید یہ درج بالا بیان مصدقہ نہ ہو وگرنہ ایک ایسی لڑکی جس کی منگنی ہو چکی ہو اسے کسی اور کے ساتھ منسوب کرنے کا وعدہ ہرگز نہیں کیا جاتا جیسا کہ مہرک کے خاندان والوں اور والد نے ''عزت پنجگوری کے ساتھ کیا مہرک کی نسبت طے کرنے کے لیے چند شرائط کی بنیاد پر وعدہ کیا تھا۔ اس کا تذکرہ اگلے سطور میں آجائیگا۔ بلوچ سماج کے اندر بچپن کی منگنیاں عام ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ پہلی منگنی کے ہوتے ہوئے کسی لڑکی کی نسبت کہیں اور قائم کی جائے۔ جب تک منگنی ٹوٹ نہیں جاتی اور فریقین کی رضامندی سے دونوں خاندان اس رشتے کو ختم نہ کرتے تو یہ تب تک یہ رشتہ اور نسبت ازلی اور حتمی تصور ہوتی ہے۔

مہرک اب بچپن سے نکل کر نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی اور عمر کی منزلیں طے کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی خوبصورتی اور حسن ورعنائی میں جس طرح اضافہ ہوا تھا، بلوغت کو پہنچ کر اس میں اتنا اضافہ ہوا تھا کہ اسے دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ چاند زمین پر اُتر آیا ہے یا جنت سے کوئی حور پیردان میں سالک کے گھر میں آئی ہے۔ وہ اس دنیا کی کوئی ہستی لگتی نہیں تھی۔ اسے جو کوئی بھی دیکھتا تو بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ آہستہ آہستہ اس کی خوبصورتی اور حسن کے چرچے چاروں طرف پھیلنے لگے اور ہر جگہ اس کے تذکرے ہونے لگے۔ جہاں چند نوجوان

بیٹھے ہوتے تو ان کی گفتگو کا دلچسپ موضوع پیردان کی یہ پری جمال اور حور چہرہ حسین و جمیل لڑکی ہوتی تھی اور ہر ایک خوابوں اور خیالوں میں اسے اپنا تصور کرتا تھا، ہر نوجوان کی یہ خواہش تھی کہ سالک کی بیٹی ان کی زندگی کا حصہ بنے، بڑھتے بڑھتے یہ تذکرے اب شعرأ کی محفلوں تک جا پہنچے اور شعرأ نے بن دیکھے اس پری جمال کے لیے حسنِ بے مثال کے لیے دیوان کے دیوان لکھ ڈالے۔ اس وقت کے اکثر بلوچ شعرأ نے اسے اپنے کلام میں شامل کیا اور اس کی خوبصورتی و رعنائی پر نظمیں لکھیں۔ ان ہی شعرأ میں بلوچی زبان و ادب کے مشہور و معروف چند نام بھی شامل تھے کہ جن میں سے ہر ایک اس دلربا کے یاقوتی حسن پر مر مٹا اور اس پر ہزار دل و جان سے فدا ہوا۔ ان مشہور شعرأ کرام میں بلوچی کے نامور شاعر مُلا فاضل، مُلا بوہر اور مُلا عزت شامل تھے۔ گو کہ بعض دیگر شعرأ بھی اس ماہ رو و ماہ رنگ پر مر مٹتے تھے مگر ان تینوں کی کہانی دیگر سے کافی مختلف، رومانوی اور دلچسپ ہے۔

ایک ادیب لکھتا ہے کہ:

> ''بعض شاعر بھی اس کی تعریف میں نظمیں کہہ رہے تھے جن میں بلوچی کا شاعر ملا فاضل سب سے پیش پیش تھا۔ اس کی شاعری کا موضوع مہرک تھی اور شاعری کے ساتھ ساتھ مہرک کی شہرت بھی پھیل رہی تھی۔ اس کی نظمیں سینہ بہ سینہ لوگوں تک جاتیں اور جن لوگوں نے مہرک کے بارے میں نہیں سنا تھا، وہ بھی ملا فاضل کی شاعری سن سن کر اس کے مداح ہو رہے تھے۔ فاضل اپنے وقت کا مقبول بلوچی شاعر تھا اس لیے اس کی مقبول شاعری کے دوش بدوش مہرک کے چرچے بھی بڑھ رہے تھے۔ آج بھی اس کی شاعری میں مہرک کا حسن زندہ و تابندہ نظر آتا ہے اور لوگ اسے پڑھ کر ماضی کے حسن کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ مہرک کے حسن کی تعریف تو فاضل نے اپنی شاعری میں کی تھی مگر اس پر عاشق ایک دوسرا شاعر ہوا۔ فاضل کا ایک دوست تھا جن کا نام ملا بوہر تھا، یہ بھی شاعر تھا اور یہ دونوں ہر وقت اکھٹے رہتے تھے کیونکہ دونوں شاعر تھے، ہم عصر تھے اور ہم مذاق دوست تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے ملا فاضل اور ملا بوہر دونوں سرباز

گئے۔ ان کا گزر پیردان کے قصبے سے ہوا تو انھوں نے مہرک کے حسن کے بارے میں سنا۔ انھیں بھی اشتیاق ہوا کہ: ''کسی طرح مہرک کو دیکھا جائے۔ کیا واقعی وہ اتنی حسین ہے جتنی لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں؟''
انھوں نے اس کا اتا پتا دریافت کیا اور اس علاقے میں گئے جہاں اس کا گھر واقع تھا۔ یہ ان کی خوش قسمتی کہ جب وہ مہرک کے گھر کے قریب گئے تو اس وقت وہ اپنے گھر کے دریچے میں کھڑی تھی۔ پہلے مُلا بوہر کی نظر اس پر پڑی تو اس نے مُلا فاضل کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھو۔ اُدھر۔۔ شاید یہی مہرک ہے۔۔۔؟'' فاضل نے چونک کر اس طرف دیکھا تو وہ دریچے میں ایسے کھڑی تھی کہ اس کے لمبے لمبے سیاہ بال کسی جال کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ بکھرے ہوئے بالوں میں سے اس کا سرخ وسفید چہرہ ایسے چمک رہا تھا جیسے بادلوں میں سے چاند جھانک رہا ہو۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''واقعی لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔ مہرک اپنا جواب آپ ہے۔۔''
(عقیل (1997):290)

دونوں ہی شاعر تھے اور حساس دل تھے۔ دونوں باذوق حلقے سے تعلق رکھتے تھے اور کافی عرصہ سے مہرک کے حسن تاباں کے چرچے سن رہے تھے اور اسے ان دیکھے اس کے حسن و جمال پر نظمیں لکھتے تھے اب جو اسے بالکل سامنے ماہِ تاباں جیسے روئے جمیل، ناگ جیسی زلفوں اور گیسو دراز کے ساتھ دریچے میں ایستادہ دیکھا تو دونوں ہی دم بخود اور انگشت بدندان اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ ان کی نظریں دریچے میں کھڑی مہرک کے ماہ رو چہرے پر جمی ہوئی تھیں جبکہ ان کے پاؤں زمین کے ساتھ ایسے چپک گئے تھے جیسے انہیں زمین نے جکڑ لیا ہو یا جیسے ان سانس قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ہو اور وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے ہوں۔ مُلا بوہر بھی حیرت سے اس پری جمال کی جانب دیدہ واز آنکھوں کے ساتھ دیکھ رہا تھا مگر مُلا فاضل کی حالت قابلِ دید تھی، ایسے جیسے اس کی جان نکل گئی ہو اور اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہوں۔ وہ بالکل ساکت ہو چکا تھا جیسے کسی سانپ نے اسے ڈس لیا ہو۔ وہ نظریں جمائے ٹکٹکی باندھے نادیدوں کی طرح اور پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ مہرک کی طرف ایسے دیکھ رہا تھا جیسے

یہ لمحے اس کی زندگی کے آخری لمحے ہوں اور وہ ان سے جی بھر کے لطف اندوز ہونا چاہ رہا ہو۔ وہ پہلی ہی نظر میں اس ماہ رنگ دلربا اور ماہ رو حسینہ کو دل دے بیٹھا اور ہزار دل وجان سے اس پر عاشق وفدا ہوا۔

دونوں مہرک کے قصبہ پیردان سے واپس اپنے گاؤں آ گئے مگر مُلا فاضل اپنا دل وہیں پیردان میں چھوڑ آیا تھا۔ مہرک کا حسن و جمال اور رعنائی وتابانی اس کے دل ہی میں نہیں بلکہ آنکھوں میں بھی نقش ہو گئی تھی اور وہ اب اسے دیکھنے کے بعد اس پر ایسی شاعری کرنے لگا جو آج بلاشبہ بلوچی کا عظیم ادبی سرمایہ ہے۔ اس نے مہرک کی شان میں ایسی لاجواب اور بے مثال شاعری کی، کہ جو نوجوانوں، بوڑھوں، خواتین حتیٰ کہ ہر باذوق شخص کی زبان پر اس کی نظمیں ہوتی تھیں جن میں اس کی خیالی محبوبہ مہرک کے حسن و جمال کے تذکرے ہوتے تھے۔ اس طرح قرب و جوار اور دور و نزدیک میں مہرک کے حسن و جمال اور خوبصورتی وزیبائی کے چرچے عام ہو گئے اور ہر جگہ اس کے نام کا ورد لوگوں کی زبان پر مُلا فاضل کے اشعار کی صورت میں جاری رہتا تھا۔ مُلا فاضل چونکہ ایک بہت بڑا اور نامور شاعر تھا اور اپنے وقت میں اسے سب سے بڑے شاعر ہونے کا درجہ بھی حاصل تھا۔ آج بھی ان کے درجے اور مرتبے میں کوئی کمی نہیں آئی اور ان کا ادبی مقام بلوچی زبان وادب کے علاوہ بلوچی رومانوی اور ثقافتی تاریخ میں بھی متعین ہے۔ لہٰذا ان کا حلقہ احباب بھی کافی وسیع تھا۔ ان کے دوستوں میں سے ایک کا نام مُلا عزت تھا۔ وہ مُلا فاضل سے عمر میں چھوٹا تھا مگر اچھے شعراءؔ میں اس کا شمار ہوتا تھا اور مُلا فاضل اس کی شاعری کی داد دیتا تھا۔ وہ جتنا اچھا شاعر تھا اتنا ہی خوبصورت اور خوش شکل نوجوان بھی تھا۔ مُلا فاضل اور مُلا عزت جب بھی آپس میں ملتے تو مُلا فاضل مُلا عزت کو مہرک کے حسن و جمال کے قصے سناتا اور اس کی خوبصورتی کی بے حد تعریف کرتا تھا۔

مُلا فاضل کی زبانی ہر وقت مہرک کی اتنی تعریفیں اور اس کے حسن و جمال کے اتنے قصے سننے کے بعد فطری طور پر مُلا عزت کے دل میں اسے دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ لہٰذا اس نے یہ حتمی فیصلہ کیا کہ وہ پیردان جائے گا اور مہرک کا دیدار کرے گا، تاکہ اس بات کی حقیقت کھل جائے کہ واقعی مہرک اتنی حسین اور خوبصورت ہے جتنا مُلا فاضل اس کی تعریفیں کرتا پھرتا ہے اور اس پر اشعار کی لڑیاں پرو کر گیتوں کی مالائیں بُنتا ہے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ مُلا فاضل جیسے

بڑے شاعر کا جو موضوع سخن و کلام ہے وہ واقعی اس قابل ہے کہ مُلا فاضل جیسا بڑا شاعر اس پر اپنے اشعار باندھے اور اپنی پوری شاعری اس نازنین حسینہ کے نام کر دے۔ لہٰذا مُلا عزت نے پیردان جانے کا مصمم ارادہ کیا اور اس قصبہ میں جا کر مہرک کے دیدار سے اپنی ترستی پیاسی آنکھوں کو سیراب کرنے کا آخری فیصلہ کیا۔

مُلا عزت پیشہ کے لحاظ سے زرگر تھا اور زیورات بنا کر انہیں گاؤں گاؤں، قریہ قریہ گھوم پھر کر ایک بنجارے کی طرح فروخت کرتا تھا اور اپنی روزی روٹی کماتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس دفعہ زیورات بیچنے کے لیے وہ پیردان جائے گا اور زیورات بھی بیچے گا اور اس کا دیدار بھی کرے گا۔ یہ فیصلہ کر کے اس نے مختلف قسم کے زیورات بنانے شروع کیے تاکہ وہ اپنی روزی روٹی کا بھی بندوبست کرے اور کچھ رقم اپنے پاس پس انداز کر سکے کیونکہ ممکن ہے کہ اسے چند دن پیردان میں رُکنا پڑے۔ وہ زیورات تیار کرتا گیا اور کافی مال تیار کر کے ایک دن اس نے رخت سفر باندھا اور پیردان کی جانب روانہ ہوا۔ وہ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ گھومتا اور اپنا سامان فروخت کرتا ہوا ایک دن بالآخر پیردان پہنچا۔ قصبہ کے باشندے بڑے مہمان نواز اور ملنسار تھے۔ انہوں نے مُلا عزت کی بڑی تعظیم کی اور اسے خوب عزت دی۔ جب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ یہ نوجوان زیور فروش بنجارہ ایک اچھا اور بڑا شاعر بھی ہے تو انہوں نے اس کی اور زیادہ عزت کی اور خوب خاطر تواضع کی، اور جب انہیں یہ پتہ چلا کہ مُلا عزت کچھ دن پیردان میں رُکنے کا ارادہ رکھتا ہے تو قصبہ کے باشندوں نے اس کی رہائش اور شب بسری کا بندوبست کیا۔

اگلے دن سے مُلا عزت اپنی اشیاء فروخت کرنے کی خاطر قصبہ میں نکلا اور گلی کوچوں میں اپنی اشیاء فروخت کرنے کی خاطر آوازیں لگانے لگا جیسے ایک بنجارہ آواز لگا کر اور اپنی اشیاء کے بارے میں بتا بتا کر لوگوں کی توجہ حاصل کرتا ہے بالکل اسی طرح مُلا عزت بھی آوازیں لگاتا ہوا پیردان کی گلی کوچوں میں مٹرگشت کرتا رہا۔ وہ بظاہر اپنی اشیاء فروخت کر رہا تھا مگر اس کا اصل مقصد اور منشاء مہرک کو دیکھنا اور اس کے دیدار سے اپنی پیاسی، ترستی آنکھوں کی تشنگی بجھانا تھا۔ وہ کئی دنوں تک پیردان میں بھٹکتا رہا اور مہرک کے دید کے لیے جتن کرتا رہا، وہ کسی سے اس کے بارے میں پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ آداب کے خلاف تھا جبکہ دل کی بے

قراری میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ایک دن مُلاعزت گھومتے گھامتے ندی کی جانب نکلا تو اس نے دیکھا کہ وہاں کچھ لڑکیاں کھڑی تھیں جن میں سے ہر ایک حسن و جمال کا ایک پیکر تھا اور خوبصورتی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔مُلاعزت کچھ دور کھڑے ہو کر ان کی جانب دیکھنے لگا کہ شاید ان ہی میں وہ سحر آفرین پیکرِ حسن ورعنائی مل جائے۔پھر مُلاعزت کی نظر ان حسیناؤں کے مابین کھڑی ایک دراز قامت، حسین وجمیل، لمبے لمبے سیاہ بالوں اور چاند جیسے چہرے والی حسینہ پر پڑی کہ جس کا حسن اس حد تک مکمل تھا کہ اسے دیکھنے والا پھر اپنی آنکھیں کہیں اور جما نہیں سکتا تھا۔اس کا حسن اتنا تابناک اور تابندہ تھا کہ وہ اپنی تمام ہمجولیوں میں سب سے منفرد اور سب سے جدا لگتی تھی، وہ ان کے بیچ میں کھڑی ایسے لگ رہی تھی جیسے ستاروں کی جھرمٹ میں چودھویں کا چاند ہو، جس کی روشنی اور تابناکی کے سامنے ستاروں کی چمک ماند پڑ رہی تھی۔اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ ہو نہ ہو یہی مہرک ہے کہ جو قصبے کی ان دیگر لڑکیوں سے بالکل جدا اور یکتا ہے۔اس کا حسن ان کے درمیان ماہِ تاباں کی طرح ہے اور وہ ان سب سے منفرد اور حسین ترین لگ رہی ہے۔وہ ابھی انہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک آواز نے اس کو سوچوں کی دنیا سے نکال دیا۔اس نے دیکھا اور سنا کہ ایک لڑکی ۔نے اس سب سے خوبصورت حسینہ کو آواز دیتے ہوئے کہا کہ: مہرک اب چلنا چاہیے کافی دیر ہوگئی ہے۔اس لڑکی کے بات کی جواب میں خوبصورت ترین لڑکی جسے مہرک کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا، نے کہا کہ چلو چلتے ہیں۔اس طرح عزت کے سوچ کی تصدیق ہوگئی اور جب اس نے سنا کہ مہرک یہی ہے تو وہ کہنے لگا کہ مُلافاضل کے شائستہ وقیمتی الفاظ بھی اس حسینہ کے حسن کی تعریف کے لیے کم ہیں۔ وہ ہزار دل وجان سے مہرک پر فدا ہوا۔لڑکیاں تو اپنے گھروں کو چلی گئیں مگر چاند سے بھی زیادہ حسین وروشن مہرک ساتھ میں مُلاعزت کا دل اور چین وقرار بھی ساتھ لے گئی۔مُلاعزت بت بنا وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔وہ ساکت حالت میں کافی دیر تک وہاں کھڑا رہا جیسے اسے کسی سانپ نے سونگھ لیا ہو۔وہ دم بخود انگشت بدندان اپنی جگہ پر ساکت ہو چکا تھا۔کافی دیر بعد جب اس کے اوسان بحال ہوئے تو اس نے بے ساختہ یہ شعر پڑھا:

"میرے معبود نے مجھے ایک بے مثال تحفے سے نوازا ہے
اور مہرک رب کی درگاہ سے نمودار ہوئی ہے"

اور جب وہ اپنی اقامت گاہ کی جانب لوٹ رہا تھا تو اب وہ، وہ مُلا عزت نہیں تھا جو کچھ لمحے پیشتر تھا یا جب وہ پیر دان میں داخل ہوا تھا بلکہ جب وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو ایک شخص جو اتنے دنوں کے قیام کے دوران عزت کا دوست بن چکا تھا، نے جو عزت کی یہ حالت دیکھی تو وہ گھبرا گیا اور پریشان ہوا۔ مگر اس شخص کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور نہ ہی مُلا عزت نے اسے کچھ بتایا۔

اس واقعہ کے بعد عزت کی شاعری کا موضوع مہرک بن گئی تھی اور وہ مکمل طور پر اس کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اب وہ دنیا اور دنیا والوں سے بے غرض اور لاتعلق ہو چکا تھا، اس کی نظروں میں ہر وقت مہرک کی تصویر ہوتی تھی۔ وہ دن رات اس کے خیالوں میں کھویا کھویا رہتا تھا اور اس کے حسن و خوبصورتی کی تعریف میں اشعار کہتا رہتا تھا۔ مُلا عزت پہلے بھی ایک اچھا شاعر تھا اور اپنے اشعار پر خوب داد پاتا تھا مگر مہرک کو دیکھنے اور اسے موضوع بنانے کی بعد اس کی شاعری کو چار چاند لگ گئے اور اس میں اتنی دلکشی اور معنویت آ گئی تھی کہ جو سننے والے کے دل میں اُتر جاتی تھی۔ ان کی شاعری اتنی دلچسپ ہو گئی تھی اور اتنی پسند کی جانے لگی تھی کہ سننے والے سنتے اور فوراً ازبر کر لیتے۔ اس کے اشعار پیر دان میں مشہور ہوتے جا رہے تھے اور لوگوں میں بہت پسند کیے جانے لگے تھے۔ اس کے اشعار میں براہِ راست مہرک کا نام ہوتا تھا اور کبھی وہ اسے اپنی محبوبہ کہتا تو کبھی اس کی حسن اور خوبصورتی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا اور اس کی حسن و جوانی کی ایسی تصویر کشی کرتا کہ سننے والے عش عش کر اٹھتے اور ان اشعار کو بڑی دلچسپی کے ساتھ ازبر کر کے خوب لے کے ساتھ گنگناتے۔ اس کی شاعری پیر دان میں بڑی تیزی کے ساتھ مقبول ہوتی جا رہی تھی مگر ساتھ ہی یہ بات بھی مشہور ہو رہی تھی کہ پیر دان میں ایک پاگل شاعر آیا ہوا ہے جو سرِ عام مہرک کی خوبصورتی اور اس کے شباب پر گیت گاتا پھرتا ہے۔ مُلا عزت کی ان حرکتوں اور سرِ عام مہرک کے لیے کی جانے والی شاعری سے مہرک کے گھر والے سخت پریشان ہو گئے کیونکہ اس طرح ان کی بے عزتی ہو رہی تھی اور ان کی بیٹی اور پورے خاندان کے لیے عزت کی شاعری بدنامی کا باعث بن رہی تھی۔ مہرک کا والد سالک عزت کی شاعری سے سخت پریشان تھا اور وہ اس سوچ میں تھا کہ اس مسئلہ کو کیسے حل کیا جائے اور مُلا عزت سے کیسے نمٹا جائے؟

سالک جانتا تھا کہ وہ مُلاعزت کو شاعری کرنے سے نہیں روک سکتا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی زور زبردستی کر سکتا ہے کیونکہ ایسا کرنا مزید ان کی بدنامی کا باعث بن سکتا تھا۔ وہ بیچارہ کئی دنوں تک اس بارے میں سوچتا رہا اور اس مسئلہ کا کوئی پُرامن اور معقول حل تلاش کرنے پر غور کرتا رہا۔ بالآخر ایک دن سالک نے مُلاعزت کی دعوت کی اور اسے اپنے گھر کھانے پر بُلایا۔ جب مُلاعزت سالک کے گھر پہنچا تو سالک نے اس کا استقبال کیا اور اس کی خوب خاطر مدارت کی۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ سالک کہنے لگا کہ: تم ہمارے قصبے میں بطور مہمان آئے۔ ہمارے قصبے کے لوگوں نے تمہارے آرام و آسائش کا خیال رکھا جو کہ ہمارا فرض تھا۔ مجھے بتاؤ کہ تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں۔ جواب میں عزت نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ: میں آپ لوگوں کی اس عزت افزائی کے لیے بہت ممنون ہوں۔ سالک نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ: تمہاری شاعری بھی ہمارے قصبہ میں بہت مقبول ہے۔ اس پر مُلاعزت نے تشکر آمیز نظروں سے سالک کی جانب دیکھا اور بولا: آپ کے قصبہ کے لوگوں نے مجھے اور میری شاعری کو اتنی اہمیت دے کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ جب مُلاعزت نے یہ بات کی تو سالک نے ذرا تلخ اور درشت لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ: مگر ہماری عزت افزائی اور محبتوں کا تم ہمیں کیا صلہ دے رہے ہو؟ تم کس طرح ہماری مہربانیوں کا شکریہ ادا کر رہے ہو؟ آپ کا طریقہ کار انتہائی نامناسب اور اخلاقیات کے خلاف ہے۔ تمہیں یہ حق ہرگز حاصل نہیں کہ تم ایک باعصمت اور نیک سیرت دوشیزہ کو اپنی شاعری سے یوں بدنام کرتے پھرو اور لوگوں میں اس سے خیالی محبت اور عشق کے چرچے کرتے پھرو۔

مُلاعزت کو اس بات کی ہرگز توقع نہیں تھی کہ سالک موضوع کو اس جانب لے کر جائے گا اور اس سے اس نوعیت کا سوال کرے گا۔ وہ سالک کا تنقیدی لہجہ دیکھ کر اور اس کی باتیں سُن کر سٹپٹا گیا۔ اسے اس بات کا بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ سالک کا لب و لہجہ ایک دم بدل کر تلخی اختیار کرے گا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ سالک کی بات بالکل درست ہے اور وہ غلط نہیں کہہ رہا، کیونکہ پچھلے چند دنوں سے مُلاعزت جس طرح کا کردار ادا کر رہا تھا وہ سالک تو کیا کسی کے لیے بھی ناقابلِ قبول تھا۔ مہرک سالک کی بیٹی تھی اور اس کی عزت اور غیرت تھی، جبکہ مُلاعزت نہ صرف

پیردان بلکہ قرب و جوار میں بھی اس کی باعصمت، نیک سیرت اور پیاری سے بیٹی کی عزت کی دھجیاں اڑا رہا تھا اور اس سے اپنے خیالی عشق کا اظہار کرتا پھر رہا تھا۔ سالک کے اعتراضی گفتگو اور باتوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا اور وہ ان کی تردید یا وضاحت کرنے میں ناکام رہا۔ مُلا عزت کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ سالک کو کیا جواب دے؟ وہ اُس کے سامنے جھوٹ بولنا نہیں چاہتا تھا اور سچ بولنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ حیران تھا کہ کہے تو کیا کہے؟ وہ کافی دیر تک گم سم بیٹھا سالک کی جانب حیرت زدہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ آخر کافی دیر بعد اس نے ہمت کر کے سالک سے کہا کہ آگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں ایک عرض کروں۔ تو سالک نے کہا کہ اگر سچ بولو گے تو مجھے خوشی ہوگی، اپنے دل کی بات صاف صاف کہو۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ مُلا عزت سالک کی جانب دیکھے بغیر جھجکتے، ہچکچاتے اور لرزتی ہوئی آواز میں یوں گویا ہوا: ''جناب میں مہرک کو دل و جان سے چاہنے لگا ہوں اور اس سے شادی کا خواہش مند ہوں۔ میں اسی غرض سے پیردان آیا ہوں'' سالک پہلے ہی سے اس کے ارادوں کو بھانپ گیا تھا اور اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ نوجوان بغیر کسی مقصد کے پیردان نہیں آیا مگر وہ غصے میں آنے کی بجائے انتہائی نرم اور شفیق لہجے میں بولا: اے نوجوان شاعر! تم نہیں جانتے ہو کہ مہرک کی نسبت اس کے چچازاد بھائی یعنی میرے بھتیجے سے طے ہو چکی ہے جس میں دونوں خاندانوں اور مہرک کی مرضی بھی شامل ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے محبت بھی ہے۔ اس لیے تم اپنے دل سے یہ خیال نکال دو کیونکہ تمہاری یہ تمنا کبھی بھی پوری نہیں ہوسکتی۔

سالک کا یہ جواب سُن کر مُلا عزت واپس اپنی اقامت گاہ کی جانب چلا گیا۔ بجائے اس کے کہ مُلا عزت سالک کی باتیں اور جواب سننے کے بعد مہرک کا خیال ہی دل سے نکال دیتا اور اسے بھول جاتا کہ وہ پہلے سے ہی اپنے چچازاد کے ساتھ منسوب تھی اور دونوں کو ایک دوسرے سے بے حد محبت بھی تھی۔ لیکن وہ تو مُلا عزت کے دل پر نقش ہو چکی تھی اور اس کی آنکھوں میں ہر وقت اس کا عکس نظر آتا تھا، وہ جہاں دیکھتا اسے مہرک کا چہرہ نظر آتا، مہرک تو اس کے رگ رگ میں خون بن کر دوڑ رہی تھی، وہ تو مُلا عزت کی روح بن چکی تھی پھر بھلا وہ اسے کیونکر بھول جاتا ؟ کیونکر چھوڑ دیتا؟ کہ زندگی کا سودا اُس نے طے کر دیا تھا اور اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہر حال میں مہرک کو حاصل کر کے رہے گا چاہے اس کے لیے کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ اس پر

دیوانگی اور مستی کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی اور وہ عشق کی جنونیت میں مبتلا ہو چکا تھا، اسے کسی کی کوئی خبر نہ تھی وہ دنیا و مافیا سے بے خبر ہو چکا تھا، لہٰذا مہرک کے باپ سے ملاقات کے بعد اور اس کا جواب سننے کے باوجود بھی اس نے مہرک کے لیے اپنی شاعری بند نہ کی بلکہ اس کی شاعری میں مزید درد و سوز کے ساتھ ساتھ امید و جہدِ مسلسل کا پیغام بھی نظر آنے لگا تھا۔ پہلے وہ صرف مہرک کے حسن و جمال اور خوبصورتی و رعنائی، دلفریبی و دلکشی، قد و قامت اور سراپا، زلفِ معطر و گیسوءِ دراز، رُخِ زیبا و چہرہ تاباں کے تذکرے کرتا تھا اور ان کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا تھا مگر اب اسے دیکھنے اور اس کا دیدار کر لینے کے بعد وہ اسے حاصل کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا اور اُس کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود بھی اس کا ارادہ کم نہ ہوا تھا بلکہ اس کا عزم اور زیادہ مصمم و پختہ ہو گیا تھا اور اُس نے اُسے ہر حال میں اپنانے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا اور اس کے لیے وہ کوئی بھی قیمت چکانے کو تیار تھا۔ اب اُس کی شاعری میں بھی اُس کے حاصل کرنے کے عزم کا اظہار کرتا تھا اور یہ اعلان کرتا پھر رہا تھا کہ مہرک صرف اسی کی ہے اور کسی کی نہیں۔

مہرک کے والدین اس صورتحال سے سخت پریشان اور نالاں ہو گئے مگر وہ طاقت کے استعمال سے ڈرتے تھے کہ اس سے مزید بدنامی ہوگی اور ان کی عزت ختم ہو جائے گی اور ان کے لیے پیرداان میں رہنا بھی ناممکن ہو جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس دیوانے اور حواس باختہ شاعر سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ اس کی مہرک سے شادی کرنے کے لیے اس پر ایسی کڑی شرطیں لگا دیں کہ جنہیں وہ کبھی بھی پورا نہ کر سکے۔ اس طرح اس سے جان چھوٹ جائے گی۔ لہٰذا سارے خاندان والوں نے اس بات پر اتفاق کیا اور ایک دن عزت کی دعوت کی اور اسے اپنے گھر بُلایا۔ مُلا عزت اس اچانک بُلاوے پر حیران بھی ہوا اور خوش بھی کہ شاید کچھ دال گلنے والی ہے اور مہرک کے گھر والوں کے دل میں اس کے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا ہو چکا ہے۔ اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہ تھی اور نہ اس نے سوچا کہ ممکن ہے مہرک کے گھر والے دھوکے سے اُسے بُلا کر کہیں مار ہی نہ ڈالیں۔ وہ پیغام ملتے ہی خوشی خوشی سالک کے گھر پہنچا تو سارے گھر والوں نے اُسے ایسے خوش آمدید کہا جیسے وہ اس سے ناراض نہیں بلکہ راضی اور خوش ہیں۔ حال احوال کے بعد سالک نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے مُلا عزت سے انتہائی شفقت اور نرمی کے ساتھ کہا کہ: تمہاری کیفیت سے لگتا ہے کہ تم مہرک سے شادی کرنے

کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو اور اسے بہت چاہنے لگے ہو۔ اگر تم واقعی مہرک سے شادی کرنا چاہتے ہو اور سنجیدہ ہو تو ہماری چند شرطیں تمہیں پوری کرنی ہوں گی؟ مہرک کے گھر والوں کی جانب سے لفظ رضامندی سن کر وہ خوشی سے پاگل ہو گیا، وہ اسے حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا، کوئی بھی شرط پوری کرنے کو راضی تھا، بس اسے مہرک چاہیے تھی صرف مہرک۔ وہ تو اس کو حاصل کرنے کے لیے اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پیردان میں اقامت پذیر ہو چکا تھا۔ وہ اپنا تن من دھن سب کچھ مہرک کو حاصل کرنے کے لیے لٹانے کو تیار تھا اور عملاً وہ اپنا سب کچھ اُس پر نچھاور کر چکا تھا۔ لہٰذا خوش ہوتے ہوئے اس نے فوراً پوچھا: ''میں مہرک کو حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی شرط پوری کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے شرائط بتائیں، میں انہیں ہر حال میں پورا کروں گا۔'' سالک کو مُلا عزت کی جانب سے اسی جواب کی توقع تھی لہٰذا اس نے منصوبے کے تحت اپنی شرائط مُلا عزت کو بتاتے ہوئے بولا:

تم اگر مہرک سے شادی کرنا چاہتے ہو تو تمہیں مخصوص تعداد میں بیل، گائے، بھیڑ، بکریاں ہمیں دینے ہوں گے، جو شادی کی دعوت اور کھانوں کا خرچہ ہوگا، کیونکہ میرے تعلقات اور عزیز و اقارب کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہ سب میری اکلوتی اولاد مہربانو کی شادی میں شرکت کریں گے اور کئی دنوں تک میرے مہمان ہوں گے۔ ان کے کھانے پینے کا تمام تر خرچہ، چاہے وہ جتنے دن بھی یہاں قیام کریں، آپ پر ہے اور آپ ہمارے بتائے ہوئے تعداد کے مطابق ہمیں یہ مویشی اور جانور پہنچائیں گے۔ تم ہمیں نقدی بھی دو گے۔ پھر سالک نے اس کی ایک حد جو بہت زیادہ تھی اسے بتاتے ہوئے کہا کہ شادی سے پہلے یہ رقم ہمیں دو گے، اس کے علاوہ زیورات اور مہرک کے لیے کپڑے وغیرہ کی مقدار بھی اتنی بتادی کہ بیچارے مُلا عزت کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ وہ جانتا تھا کہ اس قدر سامان مہیا کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے اپنے جو زیورات تھے، جو وہ اپنے ساتھ فروخت کرنے کے لیے لایا تھا وہ سب فروخت کر چکا تھا جبکہ اُن سے حاصل ہونے والی رقم کا بڑا حصہ پیردان میں اقامت کے دوران خرچ کر چکا تھا، اس کے پاس جو جمع پونجی تھی اس سے مہرک کے والد کے مطالبات پوری کرنا ناممکن تھا۔ وہ پریشان ہو گیا اور اس کے چہرے پر مختلف تغیرات آتے جاتے رہے اور وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اُدھر مہرک کے والد کی آواز دوبارہ آئی کہ دیکھو

عزت! اگر تم کو یہ شرائط قبول ہیں تو بسم اللہ ہم آپ کی شادی اپنی بیٹی سے کر دیں گے، آپ شرائط پوری کریں ورنہ براہِ خدا آپ آئندہ کے لیے ہمیں پریشان کرنا چھوڑ دیں اور اپنے گھر جا کر آپ اپنی شاعر کریں۔

مُلا عزت نے سالک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ مجھ پر یہ شرائط آپ لوگوں نے سوچ سمجھ کر لگائی ہیں مگر آپ نہیں جانتے کہ مہرک میرے رگ رگ میں بسی ہوئی ہے اور میں ہر شرط پر اسے حاصل کرنے کا عہد کر چکا ہوں چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔ آپ مجھے کچھ عرصہ کی مہلت دے دیں میں بہت جلد مہرک کو لینے آؤں گا۔ سالک نے کہا کہ ٹھیک ہے ہم تمہیں مہلت دیتے ہیں مگر جب تک ہماری مطلوبہ شرائط پوری نہ کرو آپ پیردان نہیں آؤ گے۔ مُلا عزت نے کہا کہ مجھے منظور ہے اور یہ امید بھی ہے کہ آپ لوگ میرا انتظار کریں گے اللہ نے چاہا تو بہت جلد میں مطلوبہ اشیاء سمیت آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا اور پھر آپ وعدے کے مطابق مہرک کی شادی مجھ سے کر دیں گے۔

مہرک کے والدین نے سوچا کہ اب اس پاگل اور دیوانے عاشق سے ان کی جان چھوٹ گئی اور اب وہ انہیں تنگ نہیں کرے گا اور نہ ہی ان کی بے عزتی و بدنامی کا باعث بنے گا۔ لہٰذا وہ بالکل مطمئن ہو گئے۔ جبکہ مُلا عزت تو ہر حال میں مہرک کو حاصل کرنے کا تہیہ کر چکا تھا اور اس کے لیے اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا حتیٰ کہ اپنی زندگی تک۔ لہٰذا وہ ان شرائط سے پریشان ضرور ہوا لیکن اس کے ارادے متزلزل نہیں ہوئے اور نہ ہی مہرک کی چاہت میں کمی آئی۔ ان شرائط نے اس شعلہ مزید طبع شاعر عاشق کی عشق کے جذبات کو اور زیادہ تقویت دی، اس مقولے کے مطابق کہ: ''منزل جتنی شکل سے ملتی ہے اسے پانے کی خوشی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے'' اس نے ہر حال میں اور جلد از جلد مہرک کے والد کی شرائط پوری کرنے کا تہیہ کر لیا اور پیردان چھوڑ گوادر چلا آیا اور یہاں پر اس نے اپنا مختصر سا سامان فرخت کیا اور زیورات بنانے کے کام میں جُت گیا۔ یہ اس کا ہنر تھا اور وہ بہت خوبصورت اور منقش زیورات بناتا تھا جو خواتین میں بے حد پسند کیے جاتے تھے اور ہاتھوں ہاتھ بِک جاتے تھے۔ لہٰذا وہ اپنے اسی ہنر کے ذریعے پیسہ جوڑنے لگا اور سالک کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے رقم جمع کرنے لگا۔

پیردان میں مُلا عزت کے چلے جانے کے بعد سالک اور اس کے خاندان کو کسی حد

تک سکون ملا مگر لوگوں کی زبان پر اب بھی مُلا عزت کے اشعار ہوتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ مُلا عزت کے یہ جذبات دیکھ کر مہرک کے دل میں بھی کچھ کچھ ہونے لگا تھا اور اسے مُلا عزت اچھا لگنے لگا تھا۔ اس دعوے میں کس حد تک صداقت ہے حتمی طور پر اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ مہرک کی نسبت طے ہو چکی تھی اور وہ اپنے چچا زاد سے منسوب تھی جو ایک دوسرے کو بچپن سے ہی پیار کرتے تھے۔ لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اگر اس کی نسبت طے ہو گئی تھی تو اس کے والد نے مُلا عزت سے اس کی شادی کی بات کیوں طے کی۔ اگر صرف جان چھڑانا ہی مقصود تھا تو اس کے اور بھی کئی طریقے تھے جبکہ بلوچ سماج میں یہ حتمی ہے کہ اگر کسی لڑکے یا لڑکی کی نسبت بچپن میں طے ہو جاتی ہے تو پھر شادی بھی وہیں ہوتی ہے اور ایسی لڑکی کے لیے رشتے نہیں آتے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ وہ کسی کے نام منسوب ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر مہرک کی نسبت طے ہوتی تو اس کہانی میں کہیں نہ کہیں اس کے چچا زاد کا کوئی کردار بھی نظر آتا مگر حیرت ہے کہ اتنا کچھ ہو جاتا ہے مگر شروع سے آخر تک اس کا کوئی تذکرہ سامنے نہیں آتا اور نہ ہی کسی موڑ پر وہ کہانی میں نظر آتا ہے۔ ممکن ہے مہرک کسی سے منسوب نہ تھی اور ابھی تک اس کے لیے کوئی رشتہ نہیں آیا تھا، وگرنہ اس کا والد اور دیگر گھر والے مُلا عزت کو کبھی بھی یہ آسرا نہ دیتے کہ وہ مطلوبہ مال اور سامان لے کر آئے تو اس کی شادی مہرک سے کر دی جائے گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مہرک کسی سے منسوب تھی، اور مُلا عزت سے بھی اس کی شادی کی بات طے ہو گئی تھی، اب اگر مُلا عزت فوراً وہ سامانِ مطلوبہ سالک کو پہنچا دیتا تو، کیا سالک اس کی شادی مُلا عزت سے کر دیتا؟ اور کیا اس کا منگیتر اسے چھوڑ دیتا؟ کیا یہ ایک معاشرتی و ثقافتی مسئلہ نہ بنتا؟ یقیناً کہانی کا یہ پہلو قابلِ غور اور تحقیق طلب ہے۔

بہر حال یہ تمام واقعات کے بعد مُلا عزت اپنے مقصد کے حصول میں مگن ہوا اور پیردان میں سالک کے گھر میں زندگی دوبارہ معمول پر آ گئی۔ دن گزرتے گئے اور مہرک پیردان میں اپنے خاندان اور ہمجولیوں کے ساتھ خوش و خرم اچھلتی کودتی رہی اور ہر دن اس کے حسنِ تاباں میں اضافہ ہوتا گیا اور اس کی تابندگی و شگفتگی میں بڑھتی ہی گئی۔ پیردان میں دور دراز ممالک کے مسافر آتے اپنا سامان فروخت کرتے اور باقی ماندہ سامان لے کر آگے کی ممالک کی جانب اپنا سفر جاری رکھتے۔ ایک دن مہرک اپنی سہیلیوں کے ساتھ ندی کنارے

ٹہل رہی تھی کہ ندی کے صاف پانی کو دیکھ کر شوخ و چنچل مہرک نے اپنی سہیلیوں سے کہا کہ آؤ نہاتے ہیں۔ اس کی سہیلیوں نے منع کیا اور اسے سمجھایا کہ راستہ ہے لوگ آتے جاتے ہیں یہاں ہمارا نہانا مناسب نہیں ہے مگر مہرک کسی صورت نہ مانی اور نہانے پر بضد رہی۔ لہٰذا اس کی سہیلیوں نے کہا کہ تم نہا لو ہم یہاں نگرانی کرتے ہیں تاکہ اگر اس طرف کوئی آئے تو ہم آپ کو خبردار کر سکیں۔ مہرک اپنے کپڑے اتار کر پانی میں اُتر گئی اور دیر تک وہ پانی میں رہی اور نہاتی وچھلیں کرتی رہی۔ اس دوران اس کی سہیلیوں کا دھیان اس سے ہٹ گیا اور وہ اپنی خوش گپیوں اور شغل میں لگی رہیں کہ اچانک وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک قافلہ نمودار ہوا۔ مگر مہرک کی سہیلیاں اس قافلے کی آمد سے بے خبر رہیں اور جب ان کی نظر قافلے پر پڑی یا قافلے کے لوگوں اور جانوروں کی آوازیں ان تک آنے لگیں تب انہیں پتہ چلا کہ قافلہ بالکل سر پر آ پہنچا ہے۔ انہوں نے گھبرا کر بدحواسی میں مہرک کو آواز دی کہ جلدی سے پانی سے باہر آ کر اپنے کپڑے پہن لو کہ ایک قافلہ بالکل قریب پہنچ چکا ہے۔ مہرک بھی گھبرا گئی۔ دوسری طرف قافلہ بڑی تیزی کے ساتھ ان کی طرف آ رہا تھا، مہرک کے لیے اب پانی سے باہر نکلنے اور کپڑے پہننے کے لیے وقت نہیں تھا اور نہ ہی اس کی سہیلیوں کے لیے وہاں سے رفو چکر ہو جانے کا وقت تھا۔ لہٰذا سہیلیاں تو وہاں موجود گھنے پیڑوں میں چھپ گئیں جبکہ مہرک نے خود کو گردن تک گہرے پانی میں ڈبو دیا اور صرف اپنا سر پانی سے باہر نکالا اور اپنے لمبے، گھنے سیاہ بال پانی کے اوپر بکھیر دیا اور اپنا چاند سا روشن اور چمکتا ہوا چہرہ بھی اس میں چھپا دیا۔ اس کے سیاہ بال پانی کے اوپر پھیل گئے اور مہرک کو مکمل طور پر ڈھانپ دیا۔ اس دوران قافلہ بھی اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں مہرک کی سہیلیاں اور وہ خود چھپی ہوئی تھیں۔ قافلے میں شامل چند لوگوں کی نظر پانی میں موجود مہرک کے سیاہ بالوں پر پڑی تو وہ ڈر گئے۔ اور خوفزدہ ہو کر اس جگہ سے جلدی جلدی گزر گئے۔ قافلے کو گزرتے گزرتے کافی وقت لگا اور اتنی دیر تک مہرک پانی کے اندر گردن تک ڈوبی رہی اور باہر نہیں نکلی جبکہ اس کے لمبے لمبے سیاہ بال پانی کے اوپر ناگ کی طرح لہراتے رہے۔ کاروان میں شامل لوگوں کی نظریں اس پر پڑتی رہیں اور وہ اسے کوئی ڈائن، چڑیل یا کوئی مافوق الفطرت شئے سمجھ کر خوفزدہ ہو رہے تھے اور جلدی جلدی یہاں سے گزرتے جا رہے تھے۔

قافلے والے جب پیردان پہنچے اور اپنی اشیاء فروخت کرنے لگے۔ تو انہوں نے قصبے کے لوگوں سے بھی اس بات کا تذکرہ کیا اور انہیں کہا کہ ندی کے آس پاس کوئی چڑیل یا ڈائن ہے۔ اس پر قصبے کے لوگوں نے قافلے والوں سے کہا کہ آپ لوگوں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اس قصبے میں کوئی ڈائن یا چڑیل وغیرہ نہیں ہے، جسے آپ نے دیکھا ہوگا وہ یقینا کوئی عورت ہوگی جو نہا رہی ہوگی۔

جب قافلہ گزر گیا تو اس کی سہیلیاں بھی درختوں کے پیچھے سے باہر نکل آئیں اور مہرک کو قافلے کے نکل جانے کی اطلاع دی تو مہرک بھی پانی سے باہر نکل آئی اور اپنے کپڑے پہن لیے اور سب قصبے کی جانب اپنے گھروں کو چل دیے۔ کافی دیر تک پانی میں رہنے کی وجہ سے مہرک کا جسم دکھنے لگا تھا اور اسے بخار سا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ تھکاوٹ سے نڈھال تھی اور سہیلیاں اسے سہارا دے کر گھر تک لے آئیں۔

کہتے ہیں کہ چونکہ قصبہ کا سب سے متمول شخص سالک تھا لہٰذا اس نے قافلے والوں کی دعوت کی۔ اس دعوت میں قافلہ کا سالار اپنے چند مخصوص ساتھیوں کے ساتھ مدعو تھا۔ سالک کی بیٹی بھی اس دعوت میں آگئی اور سالک نے قافلے کے سالار اور اس کے ساتھیوں سے اپنی بیٹی مہرک کا تعارف کیا۔ تعارف کرانے سے پہلے جب مہرک مہمان خانے میں آئی اور قافلے والوں کی اس پر نظر پڑی تو وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے اور ان پر ایک دم سکتہ طاری ہوا۔ لیکن انہوں نے فوراً اپنے حواس پر قابو پایا اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر آپس میں کچھ چہ میگوئیاں کرتے رہے۔ وہ آپس میں کہنے لگے کہ ہو نہ ہو یہی وہ دوشیزہ تھی جو کل ندی پر نہا رہی تھی۔ ایک نے کہا کہ میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا یہ بالکل وہی ہے۔ دوسرے نے کہا کہ اس کے بال دیکھو کتنے لمبے اور سیاہ ہیں یقینا یہی وہ دوشیزہ ہے جسے ہم نے ڈائن سمجھا تھا۔ اتنے میں سالک نے مہرک کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے اس کا تعارف کروایا۔ قافلے والوں نے اسے دعا دی مگر اس بات کا اظہار نہیں کیا کہ انہوں نے اس کا چہرہ ندی پر نہاتے ہوئے دیکھا تھا۔

جب قافلے والے سالک کے گھر سے واپس کاروان سرائے کی طرف آئے تو وہ دیر تک مہرک کے یاقوتی حسن، نرگسی اور جھیل جیسی گہری آنکھوں، سرو قامت قد و بالا د، کالی گھٹاؤں جیسے گھنے سیاہ گیسوؤں اور چاند سے زیادہ حسین و روشن چہرے کی تعریف کرتے

رہے۔ وہ اس کے حسن لاثانی پر واہ واہ کرتے رہے اور ہر ایک یہ دعویٰ کرتا رہا کہ اس نے زندگی میں کبھی اتنی حسین اور خوبصورت دوشیزہ نہیں دیکھی۔ یقیناً سالک کی بیٹی دنیا کی سب سے حسین ترین لڑکی ہے کہ جس کا ایک ایک نقش بڑی ہی فرصت اور معقول انداز میں بنایا گیا ہے۔ اسے انتہائی فرصت کے لمحات میں فرشتوں نے جیسے آبِ نورِ تاباں سے بنایا ہو۔ الغرض قافلے کے وہ لوگ جنہوں نے سالک کے گھر میں مہرک کو دیکھا تھا وہ نیم دیوانگی کا شکار تھا اور ساری رات ان میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آئی اور وہ اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتے رہے۔

ادھر جب مہرک ندی سے گھر پہنچی تو اس کی طبیعت خراب تھی مگر اگلے دن قافلے والوں کے ان کی دعوت سے واپس جانے کے بعد اس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی اور اسے شدید بخار نے آلیا۔ اس کے گھر والے سخت پریشان ہوگئے اور اس کا علاج معالجہ شروع ہوا مگر وہ تندرست اور صحتیاب نہ ہوسکی بلکہ اس کی طبیعت روز بروز بگڑتی چلی گئی۔ وہ دن بدن نحیف اور کمزور ہوتی گئی۔ کسی حکیم کے دارو یا مُلا کی دعا کا اس پر اثر نہیں ہورہا تھا۔ وہ پری پیکر اور حور جمال مہرک کہ جو کبھی رات کے وقت چھت پر یا بالکونی میں آجاتی تو اس کے آنے سے چاند بھی شرما کر بادلوں کی اوٹ لے لیتا، چند ہی دنوں میں سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔ ہر ایک اسے دیکھ کر دکھ کا اظہار کرتا اور رونے لگتا۔ بالخصوص خواتین اور بڑی بوڑھیاں، نوجوان حسینائیں حتیٰ کہ اس کی صحت کے بارے میں ہر ایک متفکر اور ہر چشم پُرنم تھی۔ ہر ایک بے ساختہ یہی کہتا تھا کہ

''قافلے والوں کی نظر بد مہرک کو لگ گئی ہے۔''

مُلا عزت گوادر میں سالک کے مطالبات پورے کرنے کے لیے شب و روز محنت مشقت کرکے پیسہ کما رہا تھا اور انہیں جمع کررہا تھا۔ اس دوران دن رات محنت کرکے اس نے خاصی رقم جمع کرلی تھی اور مزید جمع کرنے میں دن رات مگن تھا تاکہ جلد از جلد اپنی پری رو محبوبہ اور اپنی شاعری کے موضوع اور زندگی کے مقصد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاسکے۔ جب اس نے دیکھا کہ اب اس کے پاس اتنی دولت جمع ہوگئی ہے جس سے وہ سالک کے مطالبات کو باآسانی پورا کرسکتا ہے تو اس نے مطلوبہ سامان خریدنا شروع کیا اور اس کی کمائی ہوئی رقم سے باآسانی وہ

تمام تر سامان پوری ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ملا عزت کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اسے اتنی جلدی اتنی بڑی دولت جمع ہونے کی امید نہ تھی اور جب یہ سب کام مکمل ہوا تو اس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور پیردان جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اب مہرک میری ہے اور اسے کوئی بھی میرا ہونے سے نہیں روک سکتا۔

اس کی شاعری رنگ لانے والی تھی اور اس کا مقصد حیات پورا ہونے والا تھا کہ اس نے اپنی محبوبہ کے والد کی طے کی ہوئی تمام شرائط کو پورا کر دیا تھا اور اب وہ اپنی محبوبہ کے قصبہ کی جانب رخت سفر باندھ رہا تھا اور دل ہی دل میں مہرک کے پھولوں جیسے نازک اور چاند سے زیادہ حسین چہرے کا تصور کر کے اسے اپنی بے پناہ محبتوں کے پھول پیش کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ۔۔۔۔ اے مہرک! اب تم میری ہو اور صرف میری۔ ہم دونوں ایک ہونے والے ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔۔ اے حسین و جمیل دلربا میری محبوبہ! بس تھوڑا سا انتظار صرف چند دن اور کہ میں راہ میں ہوں اور پہنچنے والا ہوں۔ وہ نادان شاعر اور مجنوں طبع عاشق نجانے کیا سے کیا سوچتا جا رہا تھا اور گنگناتا جا رہا تھا کہ:

"تم نے میری محبوبہ کو نہیں دیکھا،
جب وہ ناز و ادا کے پھول بکھیرتی ہوئی نکلتی ہے تو
اس کے حسن کے سامنے چاند اور ستارے ماند پڑ جاتے ہیں
جب وہ زیور پہنتی ہے اور قید (بلوچی زیور کی ایک قسم) ڈالتی ہے
تو مجھ جیسے نوجوان عاشقوں کے ہوش اڑ جاتے ہیں
جب وہ عطر، مشک اور عنبر لگاتی ہے
تو مجھے اس پر پہاڑی ہرنی کا گمان ہوتا ہے
جب وہ بڑی بڑی حسین آنکھوں میں کاجل لگا کر
پتلیوں کو حرکت دیتی ہے
تو میرے سینے میں تیر پیوست ہو جاتے ہیں
اور میں بے حال ہو جاتا ہوں
جب وہ اپنی پتلی کمر کو کمان کی طرح لچکاتی ہے

تو اس کی لمبی اور خوبصورت گردن
ہزار فتنے برپا کردیتی ہے
وہ تخت پر بیٹھ کر شیریں کی یاد تازہ کرتی ہے
اور اس نامراد دل کو قرار پہنچاتی ہے
میں کسی دیوانے کی مانند مست ہوں
اور میری محبوبہ حسین سہیلیوں کے جمگھٹے میں
اپنے دوست کو بلارہی ہے"

(عقیل (1997):302)

مُلا عزت نے رخت سفر باندھا۔ اس نے زیورات، کپڑے اور بعض ضروری سامان گوادر سے ہی خریدیں جبکہ اتنی رقم اس کے پاس مزید تھی کہ جس سے وہ پیردان سے مال مویشی اور کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ خرید سکتا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں میں لاکھوں سپنے سجائے اور آنے والے مستقبل کے لیے ہزاروں منصوبے ذہن میں لیے مہرک کی شان میں گیت گاتے اور گنگناتے ہوئے پیردان روانہ ہوا۔ بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ وہ پنجگور آیا تھا جہاں کا وہ باسی تھا اور وہیں سے ضروری خریداری کر کے مہرک کے قصبے پیردان کی جانب روانہ ہوا تھا۔

وہ جوں جوں اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا تھا اور فاصلے سمیٹ رہا تھا اس کی دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جارہی تھیں، اس کے خون کی گردش بڑھ رہی تھی اور اس کے جذبات میں ہلچل مچتی جارہی تھی۔ اسی کیفیت میں جب وہ قصبہ پیردان کے قریب پہنچا تو اس کی نظر قصبہ سے باہر کچھ لوگوں پر پڑی جو ایک جنازہ لے کر جارہے تھے اور ان میں سے اکثر زور زور سے رو رہے تھے اور بلند آواز میں گریہ وزاری کررہے تھے۔ مُلا عزت کو ایک دم دھچکا سا لگا اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے جنازے میں شامل ایک شخص کو روک کر کہا کہ یہ جنازہ کس کا ہے؟ کون فوت ہوا ہے؟ جواب میں وہ شخص روتا ہوا بولا کہ آہ! پیردان کی شہزادی ہماری سب کی پیاری سالک کی لاڈلی بیٹی مہرک مرگئی ہے۔ یہ اس بدنصیب ماہ پری اور ماہ دیم مہرک کا جنازہ ہے۔۔۔آہ۔۔آہ

وہ شخص آہ و بقا کرتا ہوا آگے بڑھ گیا، مگر عزت کو اس کی بات کا یقین نہیں ہوا اس

نے ایک اور شخص کو روک کر اس سے جب پوچھا تو اس نے بھی اس کی تائید کی اور روتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس پر سکتہ سا طاری ہوا اتنے میں اس نے سالک کو دیکھا جو سب سے زیادہ آہ و بقا اور گریہ وزاری کرتا ہوا جنازہ کو کندھا دیتا ہوا جا رہا تھا۔ اور ساتھ ہی زور زور سے روتا ہوا کہتا جا رہا تھا آہ میری پیاری بیٹی مہرک! تو کیسے جوان موت مر گئی اور ہم سب کو غموں کا شکار کر دیا۔

اب عزت کو مزید تصدیق کی ضرورت نہیں تھی، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہوا، اس نے وہ تمام سامان جو وہ ساتھ لایا تھا وہیں پھینک دیا اور زور زور سے چیختا اور سینہ کوبی کرتا ہوا جنازے میں شریک ہو گیا۔ مہرک کو دفنانے کے بعد عزت کئی دنوں تک اس کی قبر کے ساتھ لپٹ کر روتا رہا، آہ وزاری کرتا رہا، ماتم کناں رہا، سینہ کوبی کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ وہاں سے اٹھا اور قصبہ پیردان کو بددعا دیتے ہوئے وہاں سے چل پڑا۔ محققین کہتے ہیں کہ اس نے کہا:

''اے پیردان! تیری سرزمین نے
مہرک جیسی حسین وجمیل دوشیزہ کو نگل لیا
خدا کرے تیری ان رنگین فضاؤں پر
بھیانک موت کی اداسیاں چھا جائیں''

(عقیل (1997):303)

کہتے ہیں کہ مُلا عزت کی بددعا کے بعد قصبہ پیردان میں ایک خوفناک وبا پھوٹ پڑی جس کی وجہ سے کئی لوگ اور مال مویشی ہلاک ہوئے، لہٰذا لوگوں نے وہ قصبہ چھوڑ دیا اور وہاں سے نقل مکانی کر گئے، قصبہ پیردان کی سرسبزی وشادابی اُجاڑ ویرانوں میں اور اس کی رونقیں موت کی سی خاموشی میں بدل گئیں۔ قصبہ کی ساری رونقیں اور شادابی جاتی رہی۔ مُلا عزت مہرک کی محبت کو دل میں زندہ رکھے پیردان سے نکلا اور دیوانگی کے عالم میں ویرانوں، پہاڑوں، جنگلوں، صحراؤں میں بھٹکنے لگا، اس پر ایسی خود فراموشی اور بے اختیاری طاری ہو گئی تھی کہ اسے نہ تو اپنا پتہ تھا اور نہ ہی اپنے گرد و پیش کا اسے کوئی علم تھا، بس وہ تھا اور مہرک کا نام تھا جو اس کے لبوں پر کلمے کی طرح جاری وساری تھا اور اس کی یاد میں وہ درد بھرے اشعار کہتا پھرتا تھا۔ وہ مہرک کی تلاش میں نگر نگر گھومتا پھرتا رہا مگر مہرک تو دوسری دنیا میں پہنچ کر جنت کے

پھولوں کے درمیان حسین وجمیل اور مرمریں بدن حوروں کے مابین بیٹھی عزت کی منتظر تھی، وہ بھلا کسی انسانی دیس میں کیا کرتی، جہاں کی شہزادی تھی وہیں پہنچ گئی اور اب اپنے شہزادے کی منتظر تھی، اور شہزادہ یہاں دیوانہ ومجنوں بنا اسے دیس دیس نگر نگر تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

"میں نے خراسان کا سفر اختیار کیا
اور ہندوستان کی آرام دہ زندگی دیکھ لی
میں نے یہودیوں کے ملک کا بھی نظارہ کیا
مگر مجھے گل اندام مہرک سی صورت کہیں نظر نہ آئی
کابل سے غزنی تک
گنداوہ سے مریوں کے دیس تک
مجھے ایسی پری نظر نہیں آئی
جو مہرک کی ہم پلہ ہو
میں اب مہرک کو نہیں دیکھ سکتا
کاش! میں دنیا کے باغ کا یہ خوبصورت پھول حاصل کر سکتا"

(عقیل (1997):304)

کہتے ہیں اس کے بعد مُلا عزت اپنے آبائی علاقے پنجگور آیا اور کچھ عرصہ یہاں قیام کیا مگر بے چین روح کو کبھی بھی سکون نہ ملا اور آنکھوں سے بہتے آنسو ہر وقت جاری رہتے، لبوں پر مہرک مہرک کی صدا ہوتی اور دیوانگی کی انتہا تھی، بالآخر وہ پنجگور سے بھی نکلا اور جنگلوں اور بیابانوں کی راہ لی، اس کے بعد کسی کو بھی مُلا عزت کے بارے میں پتہ نہ چلا اور نہ ہی اسے کسی نے زندہ یا مردہ حالت میں دیکھنے کی گواہی دی۔

بلوچی زبان وادب میں مُلا عزت کا مقام بہت اونچے درجے پر ہے اور وہ بلند وبالا مرتبے کا حامل شاعر ہے۔ اس کی شاعری بلوچی ادب کے لیے ایک عظیم سرمایہ ہے کہ جو معنویت کے اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ یقیناً مُلا عزت، ان کی داستانِ عشق اور شاعری مزید تحقیق اور جستجو کے طالب ہیں کہ جن سے ادب کے ساتھ ساتھ بلوچ ثقافت کے بھی کئی خفیہ گوشے منور ہو سکتے ہیں۔

دین جان منینی:

کہتے ہیں کہ جھلاوان کے کسی گاؤں میں ایک بانکا اور طاقتور نوجوان رہتا تھا جس کا نام دین جان تھا۔ وہ بہت طاقتور اور بہادر شخص تھا اور پورے علاقے میں اس کی بہادری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ شمشیر زنی، نشانہ بازی، شہہ زوری اور شہسواری میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ جب کبھی کوئی شخص کسی طاقتور شخص کی مثال دیتا تو وہ دین جان کا نام لیتا۔ دین جان جب اپنے اونٹ پر سوار تلوار، بندوق اور ڈھال اٹھا کر نکلتا تو گاؤں کے نوجوان عش عش کر اٹھتے اور دین جان کو دیکھتے رہ جاتے۔ وہ عجب شان بے نیازی سے اپنے اونٹ پر بیٹھا جا رہا ہوتا تھا۔ گاؤں اور اردگرد کا کوئی نوجوان طاقت و شہہ زوری، تلوار بازی اور نشانہ بازی اور شہسواری میں دین جان کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا اور چند لمحے بھی اس کے آگے ٹھہرنے کی جرأت بھی کسی کو نہیں ہوتی تھی۔ سب دین جان سے ڈرتے اور اس سے خوف کھاتے تھے۔

اسی گاؤں میں منین نام کی ایک خوبصورت لڑکی بھی اپنے خاندان سمیت رہتی تھی۔ اُس جیسی خوبصورت لڑکی پورے گاؤں میں نہ تھی۔ وہ چاند جیسی حسین و جمیل دوشیزہ صرف خوبصورت ہی نہ تھی بلکہ انتہائی لائق، سگھڑ اور ہوشیار بھی تھی۔ ایک دن منین مشکیزہ اُٹھا کر گھر سے باہر بہنے والی ندی سے پانی لینے گئی اور جب وہ واپس آ رہی تھی تو راستے میں اس کی نظر دین جان پر پڑی جو اپنے اونٹ پر بیٹھا شکار سے واپس آ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور دونوں ہی دل ہار بیٹھے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے پیار ہو گیا۔ ان کی محبت آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھانے لگی اور وہ دونوں ہی بے چین اور بے تاب رہنے لگے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے ملنا چاہتے تھے مگر اس تنگ نظر اور سخت قبائلی روایات پر مشتمل معاشرے میں یہ سب ناممکن تھا اور اس کی سزا موت تھی۔ بہر حال دونوں ہی دل کے ہاتھوں مجبور تھے اور بالآخر انہوں آپس میں طے کیا کہ وہ ایک دوسرے سے ملتے رہیں گے اور اپنی آنے والی زندگی کی منصوبہ بندی بھی کریں گے اور پیاری پیاری بھری باتیں بھی۔ لہٰذا دونوں ایک دوسرے سے خفیہ طور پر ملنے لگے۔ دین جان جب بھی اور جہاں بھی منین کو بلاتا وہ اپنی جان کی پرواہ کیے

بغیر مطلوبہ مقام پر پہنچ جاتی اور پھر دونوں آدھی آدھی رات تک بیٹھے محفل کرتے اور باتیں کرتے اور پھر اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے۔ مینین بھی نازک مگر بہادر اور بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ عام نوجوانوں کو اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ مینین اپنی اور دین جان کی دوستی پر فخر کرتی تھی۔ اس کی بہنوں اور سہیلیوں کو بھی ان کی محبت کی خبر ہوگئی۔ مینین ہر وقت ان کے سامنے دین جان کی بہادری کی تعریفیں کرتی رہتی تھی۔ لہٰذا اس کی بہنوں نے کہا کہ دین جان جب بھی پیغام بھیجتا ہے تم اپنی جان اور عزت کی پرواہ کیے بغیر اس کے مطلوبہ جگہ پر اس سے ملنے کے لیے پہنچ جاتی ہو، کبھی تم بھی اسے آزماؤ اور کسی جگہ ملنے کے لیے بلاؤ۔ یہ سن کر مینین ہنس پڑی اور اپنی بہنوں سے کہا کہ دین جان جیسا بہادر اور دلیر نوجوان اس پورے علاقے میں نہیں ہے۔ یہ کہہ کر مینین چلی گئی مگر دل ہی دل میں اپنی بہنوں کے سوال پر غور وفکر کرتی رہی۔ اب اس کے بھی دل میں یہ خیال آیا کہ اس کی بہنیں ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ دین جان کو بھی آزمانا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ وہ بھی اتنا بہادر اور دوستی و محبت میں اتنا ہی مخلص ہے یا نہیں۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ میں اپنی بدنامی، عزت اور جان کی پرواہ کیے بغیر جب دین جان سے ملنے جاسکتی ہوں تو دین جان کو بھی کبھی اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر اس سے ملنے آنا چاہیے۔ لہٰذا اس نے ایک دن دین جان سے کہا کہ میں اپنی جان، عزت اور بدنامی کی پرواہ کیے بغیر آپ سے ملنے آتی ہوں۔ تم ایک مرد ہو، بہادر ہو، دلیر اور طاقتور ہو۔ کبھی تم بھی مجھ سے ملنے آجاؤ۔ دین جان سوچ میں پڑ گیا کہ واقعی مینین کی محبت اس کی نسبت کہیں زیادہ ہے کہ جب بھی اس نے اسے بلایا وہ مطلوبہ جگہ پر اپنی جان اور عزت کی پرواہ کیے بغیر پہنچ گئی مگر وہ مرد ہوتے ہوئے بھی کبھی مینین سے ملنے نہیں گیا۔ وہ شرمندہ ہوا اور مینین سے کہا کہ میں بھی تم سے بہت پیار کرتا ہوں اور تمہارے بغیر اور تمہیں دیکھے بناء میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم جہاں اور جب بھی کہو گی میں تم سے ملنے آجاؤں گا۔ مینین نے اگلی ملاقات کے لیے وقت اور جگہ طے کی اور دین جان سے کہا کہ وہ وہاں پہنچ جائے۔ اس دوران اس ساری کہانی کی مینین کے خاندان والوں کو علم ہوا تو انہوں نے مینین کو بُرا بھلا کہا اور اس پر زور دیا کہ وہ دین جان سے ملنا بند کردے مگر مینین نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ مر تو سکتی ہے مگر دین جان کو نہیں چھوڑ سکتی۔ ان باتوں کا دین جان کو بھی علم ہوا اور وہ بھی مینین کے

گھر والوں کے رویے سے سخت پریشان ہوا۔ بہرحال طے شدہ دن دونوں ایک دوسرے سے ملنے کے لیے مقررہ مقام کی جانب روانہ ہوئے۔ منین نے مردانہ لباس پہن لیا۔ خود کو امیل، بندوق اور تلوار سے مسلح کیا اور مقررہ مقام پر پہنچ کر دین جان کا انتظار کرنے لگی۔ دین جان نے جب دور سے مقررہ مقام پر منین کی جگہ ایک مرد کو کھڑے ہوئے دیکھا تو دل ہی دل میں سخت خوفزدہ ہوا اور ڈر کر واپس جانے لگا۔ اس نے سمجھا کہ شاید یہ منین کا کوئی رشتہ دار ہے اور اسے مارنے آیا ہے تو نجانے بدنامی کے ڈر سے یا جان کے خوف سے وہ واپس جانے لگا تو منین نے آواز دی کہ،

''کہاں مڑ کر جا رہے ہو یہ میں ہوں منین''

دین جان یہ سن کر سخت شرمندہ ہوا۔

دونوں کے چھپ چھپ کر ملنے کا سلسلہ جاری تھا اور وہ ہر چند دن بعد آپس میں ملتے اور خوب دیر تک پیار بھری باتیں کرتے اور اپنے مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرتے رہتے۔ انہوں نے آپس میں شادی کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ یہی منصوبہ بنا رہے تھے کہ کس طرح منین کے خاندان والوں کو اس شادی پر راضی کیا جائے کہ جو اب دین جان کو ناپسند کرنے لگے تھے کیونکہ دین جان ان کی بیٹی سے چوری چھپے ملتا رہتا تھا اور ان کی بدنامی اور رسوائی کا باعث بنتا جا رہا تھا۔ بالآخر منین کے خاندان والوں نے یہی فیصلہ کیا کہ دین جان اور منین کے قصے کا خاتمہ کر دیا جائے تا کہ اس بدنامی اور رسوائی سے نجات مل جائے جو ان دونوں کے چوری چوری ملنے کی وجہ سے پورے خاندان کی ہو رہی ہے۔

منین کے خاندان کے چند نوجوانوں اور منین کے بھائی موقع کی تاڑ میں لگے رہے کہ وہ دین جان اور منین کو ایک ساتھ دیکھیں اور دونوں کا کام تمام کر دیں۔ وہ موقع کی تلاش میں رہے اور ہر وقت ان دونوں پر نظریں جما کر رکھتے اور ان کی سرگرمیوں سے آگاہ ہوتے رہے۔ دوسری طرف دین جان اور منین ان خطرات سے لاپراوہ اپنی محبتوں کی دنیا میں مگن تھے اور اپنے اردگرد سے مکمل طور پر لاتعلق اور لاپرواہ ہو چکے تھے۔ انہیں اس بات کا بھی احساس نہ ہوا کہ وہ ایک قبائلی سماج میں رہتے ہیں جہاں عشق و عاشقی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مگر وہ دونوں اب عشق کے سمندر میں اس حد تک ڈوب چکے تھے کہ ان کا واپس نکلنا مشکل ہی

نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر اب جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی اس سلسلے میں وہ مزید کچھ سوچ سکتے تھے۔ وہ محبت کی اس معراج پر پہنچ چکے تھے کہ جہاں محبت دیوانگی اور جنون میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ لہٰذا منین کے بھائی اور دیگر رشتہ دار اس صورتحال سے سخت نالاں، ناخوش اور غصے میں تھے اور وہ اب ہر حال میں دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ضروری سمجھتے تھے کیونکہ ان بے ضرر محبت کرنے والے انسانوں کے لطیف و پاک جذبات سے قبائلی روایات اور ان روایات کو قائم کرنے والے لوگوں کے دستارِ انا کے نیچے گر جانے کا خدشہ تھا۔ ایک دن جب، منین اور دین جان ایک جگہ بیٹھ کر اپنی محبتوں کی دنیا میں گم تھے اور آپس میں میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے اور اپنے آنے والے دنوں کے لیے پریشان تھے اور ان پریشانیوں کے حل کے لیے مشورہ کر رہے تھے کہ اچانک منین کے بھائی اور رشتہ دار وہاں پہنچ گئے اور دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس طرح دو انتہائی محبت کرنے والے معصوم لوگ بدترین قبائلی روایات اور انا پرستی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ دین جان اور منین تو اس دنیا میں نہ رہے مگر ان کی سچی داستان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لوگوں کے دلوں پر نقش ہوگئی اور شعرائے کرام نے انہیں اور ان کی محبت کو اپنے کلام میں جگہ دی اور ان کی منفرد محبت کہانی کو منظوم انداز میں انتہائی خوبصورت طریقے سے بیان کیا اور اس خوبصورت لوسٹوری پر خوب اشعار کہے۔ انہوں نے اس پوری کہانی اور اس کے کرداروں کو اشعار کے ذریعے تاریخ میں زندہ رکھا۔ اس محبت بھری کہانی پر کہے گئے تمام اشعار کو یہاں جگہ دینا ممکن نہیں البتہ چند منتخب اشعار اس کتاب میں شامل کر رہے ہیں۔

جی جی کریٹ پھل کنا منین ءِ
ای داخس رڑیوہ مذہب تہ ہنین ءِ
پنانے پنانے جی پھلی نالٹ کنا
پائے کنے کسفر دین جان ءِ مٹ کنا

(مینگل (2014):179)

علاوہ ازیں اس موضوع پر درج ذیل اشعار بھی بڑے مقبول ہیں:

کسر تیٹ بریوہ دینلُ کہ وئرنا

حوال ئس ہلیوہ دین جان نا خیر نا
ملہ بر کنتو دینل کہ منین ءِ
دے خدا کپہ کہ خدا نا پنے نے
دین جان شہرٹی ٹیپ آتا فریادے
دشمن تا نیام ٹی تینے ختنون ارادے
کسرٹ بریوہ دین جان کہ وئر نا
دوشہ ئس کنو کہ ہیت کے درونا
ملہ برنی کنتو سنگت اس ساہ کنا
دوشہ ئس کنو کے ہیتاتے کہ باہ نا
جھمرس تمانے ڈانسو نا سری آ
درداتا دوائے توفنگ گوری آ
تمانے پنانے بوزنا پھلو کا
دوشہ ئس کنو کہ روح کے خلو کا
ملہ برنی کنتو جی لعل کہ منو کو
دے منٹ گدارٹ دین جان کہ گنو کو
پچاک ءُ دین جان ناجی خدا دھے ٹی
کسران رد کریٹ خیال کنا نمے ٹی
بند غاک بریرہ کسر تیٹ لوپ نا
ریفل ءِ ہلبونم دین جان نا کوپہ نا
داکان نی ہنانس روح ءِ کنا گدرے
جند تہ پاپیرے جان کنا بدرے۔

(براہوئی (2013):72-167)

اس موضوع پر مزید اور تفصیلی شاعری پڑھنے کے لیے ذوق براہوئی کی کتاب "دیر دیر کیوہ کنے دیر ایتہِ" کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

بی بگر رند، بیبرگ رند (بیورغ رند) گراں ناز:

میر بیورغ رند بلوچ تاریخ کے ان کرداروں میں شمار ہوتا ہے جو بیک وقت ایک بہادر و شجاع شمشیر زن، ایک معرکۃ الآرا شاعر اور نامی گرامی عاشق اور رومانوی شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔ بلوچستان کی تاریخ میں میر بیورغ رند المشہور بہ میر بیبرگ رند کی کہانیاں بڑی دلچسپ ہیں اور بالخصوص رند و لاشار عہد میں اس معتبر رند بہادر کی کہانیاں زبانِ زدِ عام تھیں اور آج بھی لوگ اس کی بہادری اور رومانویت کی مثالیں دیتے ہیں۔ وہ ایک بہادر و دلیر شمشیر زن، بلا کا شہسوار اور جنگجو مگر فہیم و عاقل شخص تھا۔ اس نے رند و لاشار خانہ جنگی روکنے کے لیے اپنا پورا زور لگایا اور مکمل کوشش کی کہ کسی طرح سے اس خوفناک جنگ کو روک کر برادر کشی سے دونوں قبائل کو منع کر سکے اور روک سکے۔ گو کہ وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہوا اور رند و لاشار کی خانہ جنگی کو تو نہ روک سکا مگر تاریخ بلوچستان میں اپنے مثبت کردار کی وجہ سے ایک ہیرو کا درجہ حاصل کیا اور تاریخ کے اوراق پر اپنا نام ہمیشہ ایک مثبت انسان کے طور پر ثبت کروایا۔

وہ میر چاکر رند کا بھانجا تھا میر باہر کا بیٹا تھا جو چاکر خان رند کا بہنوئی تھا۔ (بگٹی (2010):60) میر بیورغ رند کو اپنی بہادری اور شجاعت کے علاوہ فہم و فراست کی وجہ سے بھی اسے دربار چاکری میں اہم مقام و مرتبہ حاصل تھا حتیٰ کہ لاشاری قبائل کے لوگ بھی اس کی عزت اور تکریم کرتے تھے۔ اسے ہمیشہ ایک معاملہ فہم اور غیر جھگڑالو نوجوان کے طور پر جانا جاتا تھا کہ جو بے شک بہادری اور دلیری میں یکتا تھا مگر جنگ و جدل اور لڑائی جھگڑوں سے متنفر رہتا تھا۔ وہ جنگ کو قوموں کی تباہی سے تعبیر کرتا تھا اسی وجہ سے رند و لاشار یونین میں شامل تمام چوالیس قبائل کی آنکھوں کا تارا تھا اور سب ہی اس سے محبت کرتے تھے اور اس کو ہمیشہ عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جب لاشاری اور رند قبائل نلی کی خونی میدانِ جنگ میں آمنے سامنے ہوئے تو دونوں جانب کے ہزاروں لوگوں میں میر بیورغ رند ہی وہ واحد شخص تھا کہ جس نے اس جنگ کی مخالفت کی اور میر چاکر خان رند کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر کہا:

ترجمہ:

''چاکر اپنے بغض و کینے کو کم کرو

اپنی ہی ہم قوم کے خلاف غصہ تھوک دو
نوحانی قبیلہ کے ایک ہزار آدمی ہوں گے
ہزاروں شمشیر زن لاشاری ان کے علاوہ ہیں
جو تمہارے مقابلے میں یکجا ہوں گے
تب پیچھے ہٹنا تمہارے لیے عیب ہونے کے باعث دشوار ہوگا
اور آگے بڑھنے سے تم خونی جنگ کے سلسلے میں پھنس جاؤ گے
(فتح کی صورت میں بھی) چونکہ اپنے ہی بھائیوں کو قتل کرنے میں نقصان وخسارہ ہی ہے
یہ دنیا ہمیشہ سے گردش میں ہے، اس فانی دنیا میں تمہارے لیے دوام نہیں
ایسا حملہ کر کے بعد میں زندگی بھر ارمان (افسوس) کرتے رہو گے"

(بگٹی (2010):61)

علاوہ ازیں میر بیبرگ رند خوبرو اور حسین نوجوان تھا، لمبا قد، بڑی بڑی آنکھیں خوبصورت سیاہ گھنی داڑھی، سفید رنگت اور وجیہہ و حسین شکل وصورت کی وجہ سے بھی وہ کافی شہرت رکھتا تھا۔ وہ شاعر تھا اور رومانوی شاعری میں یکتا تھا۔ ان کا اور شہہ مرید کا دور ایک ہی تھا۔ عجیب بات ہے کہ رند و لاشار یونین کے عہد میں بلوچ شعرأ کرام کی ایک لمبی اور طویل لائن ہے کہ جہاں بڑے بڑے نامی گرامی اور بلوچی ادب کی دنیا کے نامور شعرأ کے اسماء شامل تھے۔ جیسا کہ خود میر چاکر رند، گواہرام لاشاری، میر شہہ مرید، حانی بنتِ مندو، حسن مولا ناغ اور میر بیورغ وغیرہ۔ علاوہ ازیں بھی اس دور کے کئی دیگر شعرأ کرام بلوچی ادب کو منظوم بلوچی ادب کا ایک بڑا حصہ فراہم کر رہے تھے۔ جہاں اس دور میں بلوچی رزم آرائیوں کی داستانیں ملتی ہیں تو اس دور میں ہونے والی شاعری کا بھی تاریخ بلوچستان میں منفرد مقام ہے۔

میر بیورغ رند کے معاشقوں کے قصے کہانیوں سے بلوچستان کی رومانوی تاریخ کے صفحات مزین ہیں اور ان کے کئی معاشقوں اور محبتوں کے تذکرے مصنفین نے اپنی کتب میں کی ہیں۔ ان کی محبت اور عاشقی کی سب اہم کہانی افغانستان کے ارغون حکمران ذالنون بیگ کی حسین وجمیل اور خوبصورت بیٹی شہزادی گراں ناز کے ساتھ مشہور ہوئی۔ گراں ناز افغانستان کی شہزادی تھی اور اس زمانے میں افغانستان پر ارغون منگولوں کا قبضہ تھا جن کا مرکز قندھار تھا۔

رند و لاشار قبائل مکران سے نکل کر مشرق کی جانب کچھی و گنداوہ تک بڑھتے چلے گئے اور ایک وسیع و عریض مملکت کی داغ بیل ڈالی، انہوں نے مکران کو چھوڑ کر سبی کو اپنا مرکز بنایا اور حاکمیت کرنے لگے۔ یہ ایک بڑا یونین تھا جس میں چوالیس بلوچ قبائل شامل تھے جو مختلف تحفظات کے تحت متحد ہوئے تھے اور پندرہویں صدی عیسوی میں مکران سے اپنی حاکمیت کا آغاز کیا اور آہستہ آہستہ مشرق کی جانب بڑھتے ہوئے سندھ و پنجاب حتیٰ کہ ہندوستان تک پہنچ گئے۔ جب یہ قبائل سبی اور گنداوہ کے میدانی علاقوں میں پہنچے تو بعض وجوہات کی بناء پر ان میں شدید خانہ جنگی کا آغاز ہوا جو تقریباً ستائیس سالوں تک جاری رہا اور ہزاروں لوگ اس خانہ جنگی کے نتیجے میں ہونے والی شدید اور خونریز لڑائیوں میں مارے گئے۔ اس کتاب کا موضوع رند و لاشار قبائل کے مابین ہونے والی خانہ جنگی نہیں ہے بلکہ اس دوران پیش آنے والا وہ واقعہ ہے جو میر بیورغ رند اور شہزادی گراں ناز کی محبت کے بارے میں ہے۔ کیونکہ اس محبت کہانی کے نتیجے میں کئی اہم واقعات پیش آئے اور ان کی محبت کے قصے ہر سُو ہونے لگے تھے جبکہ شعراُ نے ان کی محبت کہانی کو بھی اپنا موضوع بنائے رکھا۔ جنگ کے واقعات اور رند و لاشار قبائل کی خانہ جنگی کے تذکروں سے ہٹ کر میر بیورغ رند کی کہانی کی جانب آتے ہیں۔

جس زمانے میں رند و لاشار سبی اور گنداوہ کے میدانوں میں ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ رہے تھے اور بردارکشی کی بدترین مثالیں قائم کر رہے تھے، تو ان جنگوں میں رند آہستہ آہستہ کمزور پڑتے گئے اور لاشاری قبائل سندھ کے نوحانی بلوچوں اور کئی دیگر سندھی و بلوچ قبائل کی مدد حاصل کی اور انہوں نے رندوں کو کئی جنگوں میں شکست سے دوچار کیا تو ان حالات میں میر چاکر نے بھی ضروری سمجھا کہ کسی بیرونی طاقت کی مدد حاصل کی جائے تاکہ وہ لاشاریوں کی مشترکہ قوت کا مقابلہ کر سکے اور اپنی حاکمیت قائم رکھ سکے۔ لہٰذا اس مقصد کی خاطر اس نے اپنے ممتاز اور مدبر طبع مشیروں اور رفقاء پر شامل ایک وفد افغانستان کے حکمران ذالنون بیگ ارغون کے پاس ہدایہ و تحائف کے ساتھ بھیجا کہ وہ مدد کے سلسلے میں ارغون حکمران سے بات کریں اور اس سے مدد حاصل کرنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کریں۔ اس وفد کی سربراہی اپنے قابل و لائق اور دانشور اور مدبر بھانجے میر بیورغ رند کے حوالے کی اور اس امید پر انھیں قندھار روانہ کیا (زبیری (2002):72) کہ وہ اپنے تدبر اور فہم و فراست سے افغان

حکمران کو رام کرنے اور اس سے مدد حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوگا۔

میر بیورغ رند اپنے وفد کے ساتھ افغانستان کی جانب عازمِ سفر ہوا اور کئی دنوں کے سفر کے بعد وہ بالآخر قندھار پہنچا۔ افغانستان کے حکمران اور اہلیان حکومت نے ان کا پُرجوش اور والہانہ استقبال کیا۔ وہ شاہی مہمان بنے اور سارے وفد کے ارکان کو شاہی مہمان خانے میں بڑے اعزاز اور احترام کے ساتھ ٹھہرایا گیا۔ میر بیورغ رند نوجوان تھا، حسین و جمیل تھا، خوبصورت و توانا تھا، سرخ و سفید اور کھلی ہوئی رنگت تھی، دراز قامت اور وسیع سینہ تھا اور بڑے وقار کے ساتھ چلتا تھا۔ اہلیان دربار اس کی جب باتیں سننے لگے تو وہ جو پہلے ہی اس کے ہوش رُبا خوبصورتی اور وجاہت پر حیران تھے، اب اس کی باتیں سننے کے بعد اس کے فہم و فراست اور دانش و تدبر پر داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ بہت جلد بادشاہ اور درباریوں کے دل جیتنے میں کامیاب ہوا اور وہ اس کو دیکھنے اور سننے کو پسند کرنے لگے تھے۔ درباریوں کو اس نوجوان کی باتوں میں بڑی عقل و دانش نظر آئی تھی اور اس کے اندازِ گفتگو نے ان کے دل جیت لیے تھے۔ میر بیورغ رند ایک زبردست شاعر تھا اور اس کے اشعار بلوچی دنیا میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔ عام پڑھنے اور سننے والوں کے علاوہ شعرائے کرام بھی اس کی شاعری اور ادائیگی الفاظ پر اسے دل کھول کر داد دیتے تھے۔ حتیٰ کہ اس کے مخالفین بھی اس کی اس لیے عزت کرتے تھے کیونکہ اس کی شاعری میں فطرت اور اس کے مناظر کے علاوہ امن، دوستی، محبت اور آشتی کے پیغامات ہوتے تھے جبکہ وہ جنگوں کو قوموں کی تباہی و بربادی سے تعبیر کرتا تھا۔ لہٰذا الفاظ کا تو وہ جادوگر تھا ہی اور اس جادو کا مظاہرہ اس نے ارغون دربار میں بڑی خوبی کے ساتھ کیا اور بہت جلد بادشاہ بمعہ اہلِ دربار کے اس کی دانش مندی، فہم و فراست، حسنِ اخلاق اور ذوق ادب سے متاثر ہو کر اس کے گرویدہ بن گئے۔

اس نے آدابِ سفارت کی ایسی مثالیں قائم کیں جن کی وجہ سے اسے ارغون دربار میں طلب کیا گیا اور انہیں عزت و احترام سے اونچی نشست دی گئی، جہاں وہ بیٹھ کر بادشاہ اور اہلِ دربار سے گفتگو کرتا تھا۔ اس نے انتہائی دانشمندی اور تدبر سے اپنے قندھار آنے کا مدعا پیش کرتے ہوئے کہا: کہ ہماری حکومت میں بعض زعماء کی جانب سے غلط فہمیاں پیدا ہوئیں جس کی وجہ سے پوری مملکت جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آگیا اور ہمارا خطہ بدترین خانہ جنگی

کا شکار ہوا۔ ہم بلوچوں نے ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار اٹھائے اور بھائی نے بھائی کی گردن زدنی شروع کی۔ غلط فہمی پر غلط فہمی اور بدلے پر بدلے نے اس جنگ کو مزید ہوا دی اور دونوں بڑے گروہوں رند اور لاشاریوں کی جانب سے سیکڑوں بلکہ ہزاروں قابل اور بہادر لوگ مارے گئے، بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہوئیں، معاشی و معاشرتی طور پر ناقابل گفتہ نقصانات کا سامنا دونوں قبائل کو کرنا پڑا اور ان کی حالت روز بروز پتلی ہوتی گئی۔ ہمیں اس خانہ جنگی میں کئی سال لگے جس کے شعلے ابھی تک اسی شدت کے ساتھ بھڑک رہے ہیں، بلکہ اب تو اس کی شدت میں مزید تیزی اس لیے آ گئی ہے کیونکہ ہمارے ہمسایہ سندھ میں رہنے والے بعض قبائل جیسا کہ نوحانی، بھٹو اور چند دیگر قبائل ہمارے مخالف گروہ یعنی لاشاریوں کی مدد کو آ گئے ہیں۔ لاشاری ہمارے بھائی ہیں اور ہمارا اور ان کا جھگڑا اپنے گھر کا جھگڑا ہے اس میں سندھیوں کی مداخلت کی وجہ سے ہمارے مخالف گروہ کو تقویت ملی اور ہمیں ایک ہولناک جنگ میں عبرتناک شکست ہوئی۔ اب ہمارا امیر اور حکمران میر چاکر خان رند کی خواہش ہے کہ ان غیر ملکی حملہ آوروں اور مداخلت کاروں کے خلاف آپ ہمیں فوجی مدد دیں تاکہ ہم ان سے چھٹکارا حاصل کر سکیں اور لاشاریوں کے مقابلے میں اپنی پوزیشن مستحکم کر سکیں۔

اہل دربار اپنے بادشاہ سمیت میر بیورغ رند کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اسے یقین دلایا کہ وہ اس مسئلے پر ہمدردی کے ساتھ غور کریں گے۔

اگلے دن ذالنون بیگ نے میر بیورغ رند اور اس کے وفد میں شامل دیگر ساتھیوں کے لیے ایک پُرتکلف ضیافت کی جس میں ارغون حکومت کے حکومتی اہلکار، امرأ، اعیانِ سلطنت، وزرأ، فوجی سربراہ وغیرہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس پُرتکلف اور بڑی ضیافت میں ذوالنون بیگ اور اس کی نوجوان، حسین و جمیل اور پری چہرہ بیٹی شہزادی گراں ناز نے بھی شرکت کی۔ جب دعوت میں شریک مہمانوں کا تعارف شہزادی گراں ناز سے کیا جانے لگا تو وہ یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئی کہ بلوچ وفد کا سربراہ ایک انتہائی خوبصورت، وجیہہ، دراز قد، کم عمر نوجوان ہے۔ اس نے جب بیورغ کو دیکھا تو دیکھتے ہی اسے دل دے بیٹھی اور اس پر ہزار دل و جان سے فدا ہو گئی۔ میر بیورغ رند کی نظر جب شہزادی گراں ناز سے چار ہوئیں تو وہ بھی اپنے اندر اٹھنے والے طوفان پر قابو نہ پا سکا اور دل ہار بیٹھا۔ اگلے دن شہزادی

گراں ناز نے اپنی ایک انتہائی راز دار آیا (نگہداشت کرنے والی خاتون) کے ہاتھوں بیورغ کو ایک مخصوص جگہ پر ملنے کا پیغام بھیجا۔ اس طرح ان میں ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا جس نے دونوں کی محبت کی آگ کو اور زیادہ بھڑکایا اور دونوں نے ایک ساتھ جینے مرنے کے عہد و پیمان کیے اور ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں۔

میر بیورغ رند تو افغانستان آیا تھا امداد کی خاطر اور اپنی کامیاب سفارت کاری سے اس نے ارغونوں سے امداد حاصل کرنے میں کامیابی بھی حاصل کر لی تھی مگر دلِ نادان کے ہاتھوں ایسا مجبور ہوا کہ سفارت اور امداد کو بھی بھول گیا اور یہ بھی کہ ان کے مخالف لاشاری سندھیوں کی امداد ملنے کی وجہ سے اب رندوں سے زیادہ طاقتور ہو چکے ہیں اور وہ کسی بھی وقت رندوں کی حاکمیت ختم کر کے اپنی حاکمیت قائم کر سکتے ہیں۔ اس لمحے جب وہ اپنا دل ہار بیٹھا اور شہزادی گراں ناز سے طویل ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا تو وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ ایک بڑے یونین اور ایک حاکم میر چاکر خان رند کا نمائندہ اور سفیر ہے اور افغانستان کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کی خاطر قندھار آیا ہے۔ مگر وہ تو بالکل ماضی قدیم میں یونان میں پیش آنے والے اُس عظیم واقعہ کو دُھرا رہا تھا جب ٹرائے کا شہزادہ ہیکٹر اور اس کا چھوٹا بھائی سفارت کی خاطر ایتھنز والوں کے پاس پہنچے تھے اور طویل عرصے سے خراب اور کشیدہ تعلقات کو بحال کرانے میں کامیاب ہوئے تھے مگر اس کے چھوٹے بھائی نے سارا کھیل ہی بگاڑ دیا جب اسے ایتھنز کی شہزادی ایلن سے محبت ہو گئی اور شہزادی بھی اس پر مرمٹی تھی، وہ دونوں چوری چھپے ہیکٹر کے بحری جہاز میں چھپ گئے اور ہیکٹر کو پتہ بھی نہ چلا۔ بعد میں ایلن کو بھگا لے جانے کے جرم میں یورپ کی متحدہ قوتوں نے ٹرائے پر حملہ کیا۔ جس کے نتیجے میں ٹرائے تو تباہ ہوا مگر یونان (یورپ) کی متحدہ طاقتیں بھی تباہی و بربادی سے دوچار ہوئیں۔

بیورغ کی کہانی بھی بالکل اسی کہانی کی ہو بہو نقل ہے حالانکہ یہ کہانی اس سے جدا اور حقیقی ہے مگر تاریخ یونان سے نکل کر یہاں اپنے آپ کو دُھرا رہی تھی۔ دل کے ہاتھوں مجبور خوبصورت و حسین شہزادی گراں ناز اور خوبرو و وجیہہ بیورغ رند بھی محبت اور عشق کے اس زنجیر میں جکڑ گئے تھے کہ جن سے آزاد ہونا اب اُن کے بس کے بات نہیں تھی۔ ایک دن بیورغ نے گراں ناز سے کہا کہ ہمارا اس طرح چوری چھپے ملنا بالکل درست نہیں ہے اس طرح ہم دونوں

کی بدنامی کا ڈر ہے، اگر میں آپ کو ہاتھ آپ کے والد سے مانگ لوں تو کیا وہ یہ رشتہ قبول فرمائیں گے؟ اس پر شہزادی گراں ناز نے کہا کہ بالکل بھی نہیں مانیں گے کیونکہ ہمارے ہاں اپنے خاندان سے باہر لڑکی کی شادی نہیں کی جاتی۔ ہم ارغون منگول ہیں جبکہ آپ بلوچ ہیں، میرے والد اس طرح غیروں میں میری شادی ہرگز نہیں کریں گے۔ اس پر بیورغ نے کہا کہ شہزادی گراں ناز میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا اور میری زندگی تلخیوں کا مجموعہ بن جائے گی۔ گراں ناز نے بھی اتنی ہی محبت اور چاہت کے ساتھ جواب دیتے ہوئے بولی۔ بیورغ میں بھی آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، اب میرا جینا مرنا سب آپ کے ساتھ ہے، میں اب کسی اور کی نہیں ہوسکتی اور خود کو آپ کی امانت سمجھتی ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو، میرے والد مجھے کبھی آپ سے بیاہ نہیں دیں گے، ہمارے ایک ہونے کا ایک اور واحد راستہ یہی ہے کہ میں آپ کے ساتھ بھاگ چلوں اور آپ کے ملک میں آپ کے ساتھ رہوں۔ شہزادی گراں ناز کی اس بات پر میر بیورغ رند شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ کس کام سے یہاں آیا ہے اور اگر وہ شہزادی گراں ناز کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے تو اس کے اثرات انتہائی خطرناک ہوں گے اور ارغون منگول بلوچستان پر پل پڑیں گے اور پوری قوم کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، اور اگر وہ شہزادی گراں ناز کو ساتھ لے جانے سے انکار کرتا ہے تو یہ اس کی مردانگی اور جرأت کے لیے کھلا چیلنج ہوگا اور ساتھ ہی یہ کہ وہ خود بھی شہزادی کے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس کے بغیر اس کی زندگی عجیب وغریب بن جائے گی۔ لہٰذا اس نے حتمی فیصلہ کیا کہ وہ شہزادی گراں ناز کو اپنے ساتھ سبی لے کر جائے گا اور اس سے وہیں پر شادی کرے گا، اس کا نتیجہ جو بھی ہوگا بعد میں دیکھا جائے گا۔

جب رندوں کے وفد کی واپسی کا وقت آیا تو میر بیورغ رند نے شہزادی گراں ناز کو پیغام بھیجا کہ آج رات تیار رہنا میں تمہیں لینے کے لیے آؤں گا۔ شہزادی گراں ناز نے اس کے پیغام پر لبیک کہا اور رات کو میر بیورغ رند کے ساتھ بھاگ نکلنے کی تیاریاں شروع کیں۔ وہ اپنی تیاری مکمل کر کے تیار بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسری جانب میر بیورغ رند نے وفد کے ساتھیوں کو رخصت کرتے ہوئے کہا کہ وہ سبی میں اُن سے ملیں گے اور خود رات کا انتظار کرنے لگا۔ رات ہوتے ہی وہ شاہی محل کے متعلقہ جگہ پہنچا جہاں شہزادی سے ملنے کا کہا تھا، بعض بیانات

کے مطابق اس نے ارغون محافظوں کو ختم کر کے شہزادی گراں ناز کو اپنے پیچھے گھوڑے پر بٹھایا اور قندھار سے نکل بھاگا جبکہ بعض بیانات کے مطابق محافظوں نے اس کا پیچھا کیا مگر اسے پکڑنے میں ناکام رہے اور بیورغ شہزادی گراں ناز کو ساتھ لے کر بھاگا اور محافظوں کو چکمہ دے کر نکل جانے میں کامیاب ہوا۔ جب ذوالنون بیگ کو اس کے محافظوں نے اس واقعہ کی اطلاع دی تو اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی اور وہ غصے اور غضب کی حالت میں اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اور فوراً فوج کو ان کا پیچھا کرنے کا حکم دیا۔ ذوالنون بیگ خود اپنی فوج لے کر ان دونوں کے پیچھے روانہ ہوا۔

بعض مصنفین یہ بھی لکھتے ہیں کہ میر بیورغ رند کسی اور کام سے قندھار گیا تھا کہ وہاں اسے گرفتار کرلیا گیا، ایک دن اسے دربار میں پیش کیا گیا تو وہاں پر اس نے اور گراں ناز نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا اور وہیں پر دونوں ہی ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے بعد میر بیورغ رند قید خانے سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا اور ساتھ ہی وہ شہزادی گراں ناز کو بھی اٹھا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ جب ارغونوں کو اس کی اطلاع ملی تب تک میر بیورغ اور شہزادی گراں ناز قندھار سے ایک منزل آگے نکل چکے تھے۔

میر بیورغ رند جانتا تھا کہ ارغونوں کا لشکر سبی اور مضافات کو اُجاڑ دے گا اور ہزاروں لوگوں کو مار ڈالے گا۔ یہاں بھی میر بیورغ رند کی فہم وفراست نے بڑا کام کیا اور وہ بجائے سبی کی جانب جانے کے، گنداوہ کی جانب جانے والے راستے پر مُڑ گیا اور سرپٹ بھاگتے گھوڑے کو لاشاریوں کے خطے کی جانب موڑ دیا۔ امکان غالب یہی ہے کہ وہ کوہلو اور بارکھان کے راستے پیلاوغ اور ڈیرہ بگٹی سے ہوتے ہوئے روجھان پہنچا اور پھر وہاں سے وہ گنداوہ کے زرخیز میدانوں میں داخل ہو کر گاجان پہنچا اور سیدھا اپنے مخالف اور دشمن میر گواہرام لاشاری کی اقامت گاہ کی جانب چلا آیا۔ میر گواہرام لاشاری گو کہ رندوں کا مخالف تھا اور ان دونوں قبائل کے مابین خونریز خانہ جنگی چل رہی تھی مگر وہ بلوچی روایات کا امین نکلا اور اس نے میر بیورغ رند اور اس کی محبوبہ شہزادی گراں ناز کو اپنی باہوٹی میں لیا اور عزت واحترام کے ساتھ قلعہ کے اندر لے گیا۔ میر گواہرام لاشاری نے انہیں تسلی دی کہ وہ بے فکر رہیں یہاں اُن کی ہر قیمت پر حفاظت کی جائے گی چاہے تمام لاشاریوں کی جانیں چلی جائیں۔ میر بیورغ

رند نے بڑی ہوشیاری اور فراست سے کام لیا تھا کیونکہ اگر وہ سیدھا سبی چلا جاتا تو ارغون لشکر جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے وہ سیدھا سبی پہنچ کر رندوں پر حملہ آور ہوتا جس کا فائدہ ان کے مخالف لاشاری اٹھا سکتے تھے اور وہ ارغونوں کے ساتھ مل کر رندوں کو شدید اور نا قابل تلافی نقصانات پہنچا سکتے تھے۔ لہٰذا اس نے میر چاکر خان رند کے پاس جانے کی بجائے لاشاریوں کا رخ کیا۔ پروفیسر عزیز بگٹی لکھتا ہے کہ

> ''عظیم لاشاری قائد نے نہ صرف ان کو تمام عزت واحترام کے ساتھ اپنے ہاں رکھا بلکہ ان کے تحفظ اور سلامتی کے لیے لاشاری لشکر کو جمع کیا۔''
> (بگٹی (2010):62)

پروفیسر عزیز بگٹی مزید لکھتا ہے کہ:

> ''میر گواہرام نے اپنے تمام لشکر کو لڑائی کے لیے تیار کرنے کے ساتھ میر چاکر کو بیورغ کی حرکت، اپنے ہاں قیام اور ذوالنون بیگ کے اس کے تعاقب میں آمد سے مطلع کیا، جس کے نتیجے میں میر چاکر بھی اپنے لشکر کو جمع کر کے میر گواہرام کے شانہ بشانہ بیورغ کی حفاظت کے لیے لڑنے کی غرض سے آیا۔ اس طرح بیورغ کی تدبیر کامیاب ہوئی۔'' (بگٹی (2010):62)

اس طرح میر بیورغ رند نے ایک بار پھر اپنی فہم وفراست سے رند اور لاشار قبائل کو قریب لانے کی کوشش کی مگر افسوس چاکر اور گواہرام کی ذاتی انا ہر اتحاد کے آڑے آتی رہی اور انہوں نے کسی بھی ایسے موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا جو ان کے اتحاد اور تنظیم کا سبب بنتی۔ ارغون لشکر گنداوہ پہنچ چکا تھا اور اس کی تعداد رند ولاشار لشکر کے متحدہ طاقت سے بھی کئی گنا زیادہ تھی مگر اس کے باوجود رند اور لاشار ان کے خلاف سر بکف ہو کر میدان میں اُترے۔ ارغون بادشاہ ذوالنون بیگ نے میر گواہرام کو پیغام بھیجا کہ وہ میری بیٹی اور اس کو اغوا کر کے لانے والے میر بیورغ کو اس کے حوالے کردے تو وہ واپس قندھار چلا جائے گا انکار کی صورت میں لاشاریوں اور رندوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی۔ جواب میں میر گواہرام نے اپنے باہوٹ کو کسی بھی صورت ارغونوں کے حوالے کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ وہ کٹ مرنے کو تیار ہیں مگر اپنے مہمانوں کو کسی کے حوالے نہیں کریں گے کیونکہ یہ ہماری قومی روایات

کے برعکس ہے۔

اگلے دن میدان کارزار نے سجنا تھا اور ہزاروں گردنوں نے اپنے جسموں سے الگ ہونا تھا، گنداوہ کے زرخیز میدانوں میں سروں کی فصل کٹنے والی تھی اور زمین کو پانی کی بجائے خون سے سیراب کرنے کی تیاریاں ہورہی تھیں اور دونوں جانب کے سورما اور بہادر اگلے دن اپنے جوہر دکھانے کے لیے بیتاب تھے۔ ایک بار پھر ہزاروں بچے یتیم اور سیکڑوں عورتیں بیوہ ہونے والی تھیں، کئی سہاگ اُجڑنے والے تھے، کئی جوان زندگی کی رعنائیاں دیکھنے سے قبل خاک وخون میں لوٹنے کے لیے تیار تھے، جوش وجنون اپنی انتہا پر تھا اور رند و لاشاری جوان اپنے باہوٹ اور بہادر جوانمرد میر بیورغ رند اور اس کی محبوبہ کی عزت کی حفاظت کے لیے سر بکف ہوچکے تھے جو اب ان کی قومی عزت اور غیرت بن چکی تھی۔ مگر رند و لاشار جنگجوؤں کے برعکس اس سارے واقعہ اور کہانی کے مرکزی کردار میر بیورغ رند کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ گراں ناز کو اپنے ساتھ لے آیا اور اب نجانے میرے اس اقدام کے بعد کتنے بے گناہ اور معصوم لوگ مارے جائیں گے، بچے یتیم ہوں گے، خواتین کے سہاگ لٹ جائیں گے اور رند و لاشار قبائل پر قیامت ٹوٹ پڑے گی اور نجانے مزید کتنی دربدری ان کے نصیب میں لکھی ہو۔ اس نے سوچا کہ میری وجہ سے یہ سب کچھ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میں نے ہمیشہ امن اور محبت کا پیغام دیا ہے اور ہمیشہ سے یہ کوشش مخلصانہ طور پر کی ہے کہ رند و لاشار قبائل کا اتحاد یہ ہمیشہ قائم رہے اور اس میں کبھی بھی کوئی دراڑ نہ پڑے، اس نے یہ بھی سوچا کہ موجودہ خانہ جنگی کو روکنے کے لیے بھی اس نے سرتوڑ کوششیں کیں، گوکہ وہ کوششیں بارآور ثابت نہ ہوسکیں مگر رند و لاشاری جانتے ہیں کہ میں نے مخلصانہ طریقے سے دونوں قبائل کو جنگ کی آگ میں کودجانے سے منع کیا تھا اور ان کی تباہی کی تصویر انہیں پہلے ہی دکھائی تھی۔ اب بھلا میں کیسے اپنی ذات کی تسکین اور خواہشوں کے حصول کی خاطر پوری قوم کو آگ اور خون کے دریا میں دھکیل سکتا ہوں۔ یہ یقیناً خودغرضی اور قوم دشمنی ہوگی اور اس ساری بربادی اور تباہی کا ذمہ دار وہ خود ہوگا اور تاریخ کبھی بھی میر بیورغ رند کو اچھے الفاظ میں یاد نہیں رکھے گی۔ یہ سوچ کر میر بیورغ رند سر سے پاؤں تک لرز اٹھا اور خوف سے کانپنے لگا۔ اس نے خود سے کہا کہ نہیں نہیں میں یہ سب کچھ نہیں ہوتے دوں گا صرف اپنی اور گراں ناز کی خواہشات کی خاطر ساری

قوم کو تباہی اور بربادی سے دوچار کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا اور نہ ہی یہ کسی طور دانشمندی ہوگی۔ زندگی مختصر اور عارضی سی شئے ہے، مرنے کے بعد لوگ اور خود اس کی قوم اسے کن الفاظ میں یاد کرے گی، یہ سوچ کر میر بیورغ رند کانپ سا گیا اور ایک ایسا دانشمندانہ فیصلہ کیا کہ جس نے اس کی فہم وفراست کو مزید اثبات عطا کیا۔ تمام محققین، ادیب، دانشور اور اہلِ قلم جنہوں نے اس موضوع پر کچھ تحریر کیا ہے، اس بات پر متفق ہیں کہ میر بیورغ رند نے فیصلہ کیا کہ وہ خود کو ارغون بادشاہ کے حوالے کر کے اپنی قوم اور وطن کو تباہی سے بچالے گا، اکیلے اس کی قربانی سے اگر اس کی قوم بچ جاتی ہے تو یہ بہت بڑی خدمت اور بڑا کارنامہ تصور ہوگا۔ یہ فیصلہ کر کے اس نے اسی رات، جب کہ اگلے دن جنگ کا میدان سجنے والا تھا، ارغون بادشاہ کے پاس خود جانے کا فیصلہ کیا۔

چنانچہ اسی رات میر بیورغ رند ارغونوں کے کیمپ میں چلا گیا اور سر ہتھیلی پر رکھ کر وہ لشکر کے درمیان میں قائم سیدھا ارغون بادشاہ کے کیمپ تک پہنچ گیا۔ اس نے ارغون بادشاہ کے محافظوں کو آواز پیدا کیے بغیر اور ان کی آواز بلند ہوئے بغیر مار ڈالا اور آہستہ سے اس خیمے میں گھس گیا جہاں ارغون بادشاہ لیٹا ہوا تھا اور ایک ملازم اس کے پاؤں دبا رہا تھا۔ اس نے آواز پیدا کیے بغیر اس ملازم کو بھی مار ڈالا اور اس کی جگہ بیٹھ کر بادشاہ کے پاؤں دبانے لگا۔ بادشاہ ایک دم حیران ہوا کہ اس ملازم کے ہاتھوں میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی ہے کہ جو آج اس طرح میرے پاؤں دبانے لگا ہے، لہٰذا اس نے اپنے چہرہ کا رخ جب دوسری طرف پھیرا تو اس نے دیکھا کہ ایک نامعلوم شخص اس کے پاؤں دبا رہا ہے جبکہ اس کا ملازم ایک طرف مردہ حالت میں پڑا ہے۔ میر بیورغ رند نے جب دیکھا کہ بادشاہ نے اسے دیکھ لیا ہے تو اس نے فوراً اپنا ڈھاٹہ سر سے اتار دیا اور بادشاہ سے یوں گویا ہوا:

حضور میں ہی آپ کا مجرم بیورغ رند ہوں جو آپ کی بیٹی کو اٹھا کر لاتے کا مجرم ہے جس کو پکڑنے اور سزا دینے کی غرض سے آپ اپنی افواجِ کثیر لے کر آ گئے ہیں۔ میں نے آپ کے محافظوں کو ختم کر دیا ہے کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے آپ تک نہیں پہنچنے دیں گے، میرا یہاں آنے کا مقصد خود کو آپ کے حوالے کرنا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ آپ تک پہنچنے سے قبل ہی آپ کے محافظ میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے جبکہ میں خود کو زندہ آپ کے حوالے

کرنا چاہتا تھا۔ اب میں آپ کے سامنے حاضر ہوں، یہ میری تلوار اور یہ میری گردن۔ آپ بڑے حکمران اور بڑے انسان ہیں چاہے تو میری خطا معاف کر دیں چاہے تو میری گردن ابھی اور اسی وقت اُڑا دیں، مگر میری قوم پر میری غلطیوں کی وجہ سے حملہ کر کے انہیں برباد نہ کریں اور نہ ہی میری خطاؤں کی سزا دوسرے معصوم لوگوں کو دیں۔ یہ کہہ کر میر بیورغ رند ارغون بادشاہ کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھا اور اپنی تلوار اس کے حوالے کرتے ہوئے اپنی گردن جھکا دی۔ ذوالنون بیگ پہلے ہی بیورغ کی آدابِ سفارت کاری اور طرزِ تکلم سے متاثر تھا اب اس کی جرأت و بہادری اور طاقت وشجاعت نے اسے اور زیادہ متاثر کیا۔ اس نے بیورغ کو سزا دینے کے لیے جو کچھ سوچا تھا اور بیورغ کے بارے میں جو رائے رکھتا تھا وہ یکسر بدل گیا اور اس کے خیالات مکمل طور پر بدل گئے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ میری بیٹی گراں ناز کے لیے بیورغ سے زیادہ بہادر، شجاع، جوانمرد، دلیر، خوش گفتار، معاملہ فہم، خوبصورت اور وجیہہ شریک حیات ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اس نے اسی وقت میر بیورغ رند کو اپنی دامادی میں لینے کا فیصلہ کیا اور اپنے امرائے سلطنت اور فوجی افسروں کو اپنے خیمے میں طلب کیا اور ان کو مخاطب کرتے ہوئے اُن پر گرج برس پڑا اور یوں گویا ہوا: کہ اتنے بڑے فوجی کیمپ میں میر بیورغ رند داخل ہوا اور میرے خیمے تک پہنچا، اس نے میرے محافظوں اور ملازم کو انتہائی خاموشی کے ساتھ قتل کیا اور کسی کو کچھ پتہ بھی نہ چلا۔ اگر اس کی نیت میں فتور ہوتا یا وہ ہمیں مارنا چاہتا تو کون اس کو روک سکتا تھا، اگر وہ چاہتا تو تلوار کے ایک ہی وار سے ہماری گردن اڑا دیتا اور کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا۔ مگر اس بہادر اور دلیر نوجوان نے اپنی تلوار ہمارے حوالے کر کے اپنی گردن ہمارے سامنے جھکا دی تا کہ ہم اس کو اس کے جرائم کی سزا دیں۔ ہم اسے سزا ضرور دیں گے اور اس کی سزا یہ ہے کہ یہ اب میرا داماد ہے اور میری پھولوں جیسی پیاری اور نازک اندام بیٹی گراں ناز کا شوہر ہے، کل ان کی شادی ہوگی۔ آپ لوگوں کو یہاں بلانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ کل جنگ کی بجائے میری بیٹی گراں ناز کی شادی کی تیاریاں کی جائیں۔

اگلے دن جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو ذوالنون بیگ اور بیورغ رند دونوں گھوڑوں پر سوار ارغون لشکر میں سے برآمد ہوئے تو رند ولاشار لشکری حیران رہ گئے، ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ ذوالنون بیگ میدان جنگ کے بیچ میں آیا اور دونوں لشکروں کو

مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آج میری بیٹی شہزادی گراں ناز کی شادی ہے اور اس کی شادی بلوچوں کے سب سے بہادر وشجاع اور عقلمند و دانا نوجوان میر بیورغ رند کے ساتھ طے ہوئی ہے۔ لہٰذا آج کوئی جنگ نہیں ہوگی بلکہ دونوں لشکری شادی کی تیاریاں کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ شادی یادگار رہے اور اس میں خوب دھوم دھام ہو۔

اس طرح عقلمند و دانا، بہادر و دلیر میر بیورغ رند نے اپنی عقلمندی، دانائی، فہم و فراست، ہوشیاری، تدبر، بہادری، دلیری اور شجاعت سے نہ صرف اپنی محبت کو حاصل کیا اور ارغون بادشاہ ذوالنون بیگ کا داماد بنا بلکہ اس نے منگولوں کے ہاتھوں اپنی قوم اور وطن کو یقینی تباہی سے بچایا۔ علاوہ ازیں اس نے اپنے تدبر سے دونوں قبائلی طاقتوں یعنی رند اور لاشار کو امن اور سلامتی کا راستہ دکھایا مگر ان دونوں انا پرست سرداروں نے سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی دشمن کے خلاف تو متحد ہوئے مگر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خاطر وہ سالہا سال تک لڑتے رہے اور ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے۔ کاش چاکر اور گواہرام نے دانا و عقلمند بیورغ کی باتوں پر عمل کیا ہوتا تو آج بلوچوں کی تاریخ میں رند و لاشار کی خانہ جنگی کی بجائے طویل اور وسیع وعریض حکومت کے تذکرے ملتے۔

حمل ماہ گنج:

حمل جیئند کا تعلق بلوچستان کی تاریخ کی اُن شخصیات میں ہوتا ہے کہ جو بیک وقت رزم و بزم کے میدانوں کا عمدہ ترین شہسوار تھا اور بلوچستان کی عسکری تاریخ میں ان کے کارنامے سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہیں۔ کیونکہ انہوں نے سولہویں صدی عیسوی میں بلوچستان کے ساحلوں پر حملہ آور پرتگیزی قزاقوں کا ایسا ڈٹ کر مقابلہ کیا کہ وہ قزاق، جو سمندری جنگوں میں اپنے آپ کو یکتا اور لاثانی سمجھتے تھے، بھی عش عش کر اٹھے اور اس کی بہادری، دلیری، جانبازی اور قیادت کے دل سے معترف ہوئے اور اسے بہادر دشمن تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے۔ جس طرح حمل رزم کاری کا ماہر اور تجربہ کار تھا اسی طرح وہ بلوچستان کی رومانوی تاریخ میں اپنی رومانویت اور بلند درجہ رزمیہ اور عشقیہ شاعری کی وجہ سے بھی شہرت کی بلندیوں پر فائز ہے۔ ان صفحات پر بلوچستان کی تاریخ کے اس مایہ ناز ہستی کی رزم آرئیاں

مقصود نہیں ہیں بلکہ یہاں صرف اُن کی رومانوی زندگی کے چند گوشوں کو آشکارا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اس بات کا بھی ادراک ہو کہ بلوچستان کے باشندے صرف جنگجو ہی نہیں بلکہ بزم کاری اور جمالیات کے بھی دلدادہ ہیں اور رومان ان کی زندگی کا اہم ترین حصہ ہے جس کے بغیر وہ اپنے آپ کو نامکمل سمجھتے ہیں۔ بلکہ رومان اور جمالیاتی ذوق کی شدت بہ نسبت جنگی جنون کے زیادہ ہے کیونکہ جنگ تو انہوں نے اس وقت لڑی جب ان پر مسلط کی گئی، انہوں نے خود جنگ کی طرح نہیں ڈالی۔ بلوچوں کی تاریخ گواہ ہے کہ بلوچوں پر جنگیں مسلط کی گئیں تو انہوں نے مزاحمت کا راستہ اختیار کیا وگرنہ یہ فطرت سے پیار اور انسانیت سے محبت کرنے والی قوم ہے کہ جس کے ہر فرد زن و مرد کے لبوں پر پیار و محبت کے گیت ہوتے ہیں۔ بلاشبہ جتنے شاعر، عشاق اور رومانوی کردار اس قوم میں ملتے ہیں شاید ہی اتنی بڑی تعداد خطے کی کسی اور قوم میں ملتی ہوں۔ اگر غیر جانبداری اور لگن و جستجو کے ساتھ بلوچ قوم کے عشاق اور شاعروں کی تفصیلات جمع کی جائیں تو یہ کئی جلدوں پر مشتمل کتاب کی شکل اختیار کرے گی۔ اس موضوع کو کسی ایک کتاب میں سمونا ناممکن ہوگا۔ لہٰذا جہاں حمل کا رزمیہ کردار نظر آتا ہے تو یہ بات ذہن نشین ہو کہ یہ رزم کاری تو ان پر مسلط کی گئی تھی۔ انہوں نے پرتگال پر حملہ نہیں کیا تھا بلکہ پرتگال کے بحری قزاق بلوچستان کے ساحلوں کلمت، پسنی، اور ماڑا اور گوادر پر حملہ آور ہوئے تھے تب حمل نے اپنے ان ساحلوں کی حفاظت کے لیے ہتھیار اٹھائے اور ان قزاقوں کے سامنے ایسی مزاحمت پیش کی جس پر تاریخ کے صفحات خود گواہی دیتے ہیں۔ وگرنہ حمل تو کلمت کے حکمران میر جیئند خان ہوت کا خوبصورت اور لاڈلہ بیٹا تھا، جو بہادری دلیری، شجاعت، شمشیر زنی، تیراندازی اور رزم آرائی کی دیگر صفات میں اپنا ثانی نہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کا زبردست شاعر اور بذلہ سنج نوجوان بھی تھا۔ وہ ہر وقت اپنے دوستوں کے ساتھ شکار میں مشغول رہتا تھا جو اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ چونکہ قرب و جوار میں گھنے جنگلات کی کمی تھی لہٰذا وہ دور دراز کے علاقوں کی جانب شکار کے لیے نکلتا اور خوب شغل میلے کرتا اور دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر راگ رنگ کی محفلیں سجاتا، خوب شاعری ہوتی اور فنکار موسیقی کی دھن پر مکمل لے کے ساتھ ان شکار پارٹیوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور ان شعراُ کے کلام کو گا گا کر پیش کرتے۔ یہ تھے خوبرو خوش شکل، ہنس مکھ اور ملنسار، خوش اخلاق و خوش گفتار حمل کی زندگی کے مشاغل، جنگ

کے شعلوں میں تو حملہ آوروں نے اسے کھینچا تھا اور لڑنے پر مجبور کیا تھا۔

بلوچستان کی رومانوی تاریخ میں حمل کے ماہ گنج کے ساتھ محبت کی داستان بڑی شہرت کی حامل ہے اور اسے ادبی وثقافتی موضوعات پر لکھنے والے احباب میں بھی اہمیت حاصل ہے۔ بالخصوص حمل کی شاعری کو ادبی مفکرین اعلیٰ درجہ کی شاعری قرار دیتے ہیں اور اسے معنویت کے حوالے سے بلوچی زبان وادب کے اہم ترین منظوم اثاثوں میں شمار کرتے ہیں۔

میر حمل کلمت (ساحلِ بلوچستان کی ایک قدیم بندرگاہ) کے حکمران میر جیئند کا لاڈلہ اور خوبصورت بیٹا تھا جو اپنی وجاہت اور خوبصورتی کے علاوہ اپنی بہادری، شہسواری، تیراندازی، شمشیرزنی، سیرت وکردار اور حُسنِ اخلاق کی وجہ سے نہ صرف مکران بلکہ آس پاس کے علاقوں میں بھی معروف ومشہور تھا۔ وہ سیر وشکار کا شوقین تھا اور ہر وقت اپنے شکاری دوستوں کے ساتھ قرب وجوار کے علاقوں میں شکار کھیلتا رہتا تھا۔ اسے شاعری کا از حد زیادہ شوق تھا اور وہ رزمیہ اور عشقیہ ہر دو طرح کی شاعری پر دسترس رکھتا تھا اور شاعری کے تمام اسرار ورموز کے متعلق وہ خوب جانتا تھا لہٰذا وہ بڑی بامعنی وبامقصد شاعری کرتا تھا جسے عوامی حلقوں اور باذوق طبقات میں بہت پسند کیا جاتا تھا۔ یہاں اس نے کوئی شعر کہا تو وہاں وہ نوجوانوں کی لبوں پر آیا اور پھر گلی کوچوں میں لوگ ان اشعار کو گنگنا رہے ہوتے تھے۔ ان کی شاعری مکران سے نکل کر دیگر بلوچ علاقوں میں بھی مقبولیت حاصل کرتی جارہی تھی اور ادب دوست حلقوں میں ان کی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جارہا تھا۔

میر حمل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی خوبصورتی، بہادری، شجاعت، بذلہ سنجی، شاعری اور دیگر خوبیاں دیکھ کر کئی بااثر اور امیر لوگوں کی خواہش تھی کہ میر حمل ان کی دامادی میں آئے، کئی خوبصورت لڑکیاں اس کے نام کا کاجل آنکھوں میں لگائے ہمیشہ اس کے سپنے دیکھا کرتی تھیں، کئی لڑکیوں نے اپنے اپنے خیالوں میں اسے اپنے خوابوں میں سجایا تھا اور اسے اپنا مان چکی تھیں مگر میر حمل کی نظر میں کوئی بھی ایسی نہیں تھی کہ جس کو دل دیا جائے اور جسے اپنی زندگی کا ساتھی چُن لیا جائے۔ اس قصبہ میں ماہ گنج نام کی ایک خوبصورت لڑکی بھی اپنے خاندان اور اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ حسن وجمال اور رعنائی وخوبصورتی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ وہ علاقے کی سب سے خوبصورت اور حسین لڑکی تھی

جس پر اس کی ہمجولیاں ہمیشہ رشک کرتی تھیں۔ اس کو بھی اپنے خوابوں میں ہمیشہ حمل کی صورت نظر آتی تھی اور وہ بھی اسے اپنے وجود کا حصہ سمجھتی تھی۔ یہ بات ذہن نشین ہو کہ حمل بھی ماہ گنج کو بچپن سے پسند کرتا تھا اور اسے دل سے چاہتا تھا لہٰذا جب میر جیئند بوڑھے ہو گئے اور وہ سیاسی و ریاستی امور سنبھالنے سے قاصر ہونے لگے تو انہوں نے اپنے بیٹے میر حمل سے خواہش ظاہر کی کہ وہ شادی کر لیں تا کہ میں اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے کی شادی کروا سکوں اور اس کی خوشیوں میں شامل ہوسکوں۔ میر حمل نوجوان تھا اور شادی کی عمر کو پہنچ چکا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنے والد سے کہا کہ وہ جو حکم دیں گے وہ سر آنکھوں پہ۔ میں شادی کے لیے تیار ہوں اور لڑکی آپ کی پسند کی ہوگی۔ والد یہ سن کر بہت خوش ہوا اور انہوں نے ان کی شادی قصبہ کی سب سے خوبصورت لڑکی ماہ گنج سے کر دی جو نہ صرف خوبصورت اور سگھڑ لڑکی تھی بلکہ حمل کے بچپن کی پسند بھی تھی۔ حمل کو اپنی بیوی سے بے حد محبت تھی اور وہ اسے بہت چاہتا تھا اسی طرح ماہ گنج کو بھی حمل سے بہت پیار تھا اور وہ دل و جان سے حمل کو چاہتی تھی اور اس سے جنون کی حد تک محبت کرتی تھی۔

یہ وہی زمانہ تھا جب بلوچستان کے ساحلوں پر غیر ملکی پرتگیزی بحری قزاقوں نے حملہ کیا اور ایک طرف انہوں نے عمان، مسقط اور بحرین کو اپنی ترکتازیوں اور حملوں کا نشانہ بنایا تو دوسری طرف وہ ساحلِ مکران پر پِل پڑے کیونکہ میر جیئند خان نے سلطنت عثمانیہ کے اُن جہازوں کی مدد کی تھی جو ایک خونریز اور تباہ کُن سمندری جنگ میں پرتگیزیوں کے ہاتھوں شکست کھا کر پسپا ہو رہے تھے۔ میر جیئند خان اور ساحل مکران پر آباد اس کے لوگوں نے ان جہازوں کی مدد کی۔ میر جیئند خان اور اس کے لوگوں نے ان جہازوں کی ضروری مرمت وغیرہ کرنے کے علاوہ ان جہازوں پر سوار ترک فوجوں کو خورد و نوش کا سامان اور پینے کا صاف پانی بڑی مقدار میں فراہم کیا۔ جس پر پرتگیزی حملہ آوروں نے ساحلِ مکران کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے اور بلوچوں کو سلطنت عثمانیہ کا حلیف ہونے کے جرم میں سزا دینے کا فیصلہ کیا اور ان کے ساحلوں پر حملہ کر دیا۔ وہ ساحل مکران کو اپنے دسترس میں رکھ کر سلطنت عثمانیہ کو بحیرہ عرب کے گرم پانیوں سے بے دخل کرنا چاہتے تھے۔ پرتگیزیوں کے ان حملوں کی وجہ سے مکران کے ساحلی شہر بُری طرح متاثر ہوئے اور پسنی و گوادر سمیت کئی بندرگاہوں کو ان حملہ آور قزاقوں نے

اپنی تاخت کا نشانہ بنایا اور ان کے باشندوں پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑے اور ان کی ساحلی آبادیوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ ان پرتگیزی حملہ آوروں کے خلاف میر حمل اور اس کے سربکف ساتھیوں نے گہرے سمندر کے بیچوں بیچ پرتگیزیوں سے جنگ لڑی۔ اس طرح حمل اور پرتگیزیوں کے مابین خونریز یورشیں شروع ہوئیں۔ جو طویل عرصہ تک جاری رہیں۔ میر حمل نے انہی سمندری لڑائیوں میں وطن و قوم کی عزت و آبرو کے لیے لڑتے ہوئے گرفتار ہوا اور بعدازاں جام شہادت نوش کیا اور بلوچستان کی تاریخ میں اونچے مقام پر فائز ہوا۔ یہاں ان کی ان جنگوں سے غرض نہیں ہے اور نہ ہی ان کی رزم آرائیوں سے کوئی مقصد ہے بلکہ ان سطور اور ان اوراق پر میر حمل کی شخصیت کی رومانوی کردار پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

میر حمل نے شادی کے بعد بھی اپنے شکار کے مشغلے کو جاری رکھا اور دوستوں کے ساتھ اکثر شکار پر چلا جاتا اور خوب سیر و تفریح کرتا۔ ان کی زندگی ہنسی خوشی گزر رہی تھی اور وہ بڑے آرام اور سکون و امن کے ساتھ رہ رہے تھے۔ اس دوران میر حمل کو اللہ نے دو بیٹے عطا کیے جن کی پیدائش نے ان کی خوشیوں کو مزید دوبالا کر دیا اور ان کی محبت مزید مضبوط اور مستحکم ہوگئی۔ اس دوران میر جیئند جو کہ اب بہت بوڑھا ہو چکا تھا، چند دن بیمار رہ کر اس دارفانی سے کوچ کر گیا۔ میر جیئند کی فوتگی کے بعد میر حمل کو اس کی جگہ سربراہی عطا کی گئی۔ اس طرح میر حمل اپنے قابل و بہادر والد میر جیئند کے بعد کلمت اور ساحلی مکران کے علاقوں کا حکمران بنا اور بڑے نامساعد حالات اور بحرانی کیفیت میں حکومت کرنے لگا۔ چونکہ وہ حاکم بننے سے قبل بھی اپنے علاقے کے لوگوں میں مشہور و معروف اور ہردلعزیز تھا لہٰذا اس کی حاکمیت پر عوام نے خوشیاں منائیں اور کئی دنوں تک اس علاقے میں جشن کا سماں رہا۔

حاکم بننے کے بعد بھی میر حمل کے شکار اور سیر سپاٹوں کے شوق میں کوئی کمی نہیں آئی اور وہ بدستور اپنے سیر سپاٹوں اور شکار کے پروگراموں کو جاری رکھے ہوئے تھا اور ساتھ ہی پرتگیزیوں کے خلاف مبارزت بھی جاری رکھے ہوا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اسی طرح نکل جاتا اور کئی کئی دنوں تک گھر سے باہر اپنے شوق کی تکمیل میں مگن رہتا۔ ایک بار اسی طرح میر حمل اور اس کے کچھ ساتھی سمندر کی سیر کو نکلے اور اپنی کشتی میں سوار ہو کر گہرے سمندر میں چلے گئے۔ وہ خوب ہلہ گلہ کرتے جا رہے تھے کہ اچانک موسم خراب ہو گیا اور سمندر میں

طوفان اٹھا۔ جس کی وجہ سے میر حمل اور اس کے ساتھیوں کی کشتی ساحل مکران سے دور ہوتی ہوئی نجانے کس جانب نکل آئی۔ اس طرح انہیں سمندر میں طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا اور وہ سمندر کے اندر بھٹکتے رہے۔ بالآخر جب طوفان کا زور تھما تو وہ کسی انجان ساحل کی طرف آ نکلے۔ جب وہ ساحل پر اترے تو اچانک پرتگیزیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ اس طرح حمل اور پرتگیزیوں کے مابین سخت لڑائی شروع ہوئی۔ میر حمل کے ساتھیوں نے کمزوری دکھائی اور ان میں سے اکثر پرتگیزی حملہ آوروں سے بچاؤ کی خاطر سمندر میں کُود پڑے جبکہ میر حمل برابران قزاقوں کے ساتھ نبرد آزما رہا۔ اس نے کئی پرتگیزی مار ڈالے۔ اب میر حمل کو اندازہ ہوا کہ وہ عمان کے ساحل پر ہے جہاں پرتگیزی قابض ہیں اور یہاں ان کی بڑی بحری فوج تعینات ہے اور عمان کا یہ ساحل ان کا بحری فوجی اڈہ ہے۔ وہ لڑتا رہا حتیٰ کہ وہ شدید زخمی ہوا۔ پرتگیزیوں نے یکبارگی اس پر حملہ کر کے اس کے ہتھیار اس سے چھین کر اسے غیر مسلح کر دیا۔ انہوں نے سوچا کہ اس کو قتل کرنے سے بہتر ہے کہ زندہ اپنے کمانڈر کے پاس لے جائیں اور اس کی بہادری کا اس سے ذکر کریں اور اسے یہ بتائیں کہ یہ کتنا بڑا جنگجو ہے کہ جس نے ہمارے کئی ساتھی مار ڈالے اور ہم نے اسے بڑی مشکل سے گرفتار کیا ہے۔ یقیناً ہمارا کمانڈر ہمیں اس کے بدلے بڑا انعام دے گا اور اعزازات عطا کرے گا۔ یہ سوچ کر انہوں نے میر حمل کو رسیوں یا زنجیروں میں باندھ دیا اور اپنے کمانڈر کے پاس لے گئے۔ جب وہ میر حمل کو اپنے ساتھ گرفتار کر کے لے جا رہے تھے تو اس نے اس وقت ایک نظم کہی کہ جس میں اس نے اپنے دوستوں کی کمزوری اور پرتگیزیوں کے ہاتھوں اپنی گرفتاری کا تذکرہ انتہائی خوبصورت اشعار میں کیا ہے۔ ان کے یہ اشعار بلوچی ادب کے لیے گرانقدر سرمایے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی مشہور نظم کچھ یوں ہے۔

"حمل ءِ ہمراہے دلیں دشتی پیشگنت
جانش چو گزی اشکرءِ بے برانز پیشگنت
آن دگہ سید آن لکغی او مان کنگ
سیاہ زود سیاہیں میدززءِ گپ ءِ کپتگنت
من دف اوریش آن ساروءِ بوجان"

ترجمہ:

حمل کے ساتھی بزدل دشتی تھے

جوگز کے انگاروں کی طرح بجھ گئے

اس کے دیگر ساتھی ملاح تھے جنہوں نے بھاگنے کا ارادہ کیا

وہ منہ کالے ملاح سمندر میں کود پڑے

ان کے منہ اور داڑھیوں پر سمندر کا جھاگ پھیل گیا

(بگٹی (2010):62)

بعض محققین، ادیب اور دانشور لکھتے ہیں کہ جب حمل کو پرتگیزیوں نے گرفتار کرلیا اور اسے اپنے کمانڈر کے پاس لے آئے تو کمانڈر ایک انتہائی خوبصورت اور وجیہہ نوجوان کو اپنے سامنے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے فوراً اپنے ملاحوں سے کہا کہ اس خوبصورت نوجوان کو کہاں سے پکڑ کر لائے ہو تو ملاحوں نے جواب میں کہا کہ یہ صرف خوبصورت ہی نہیں انتہائی بہادر اور دلیر بھی ہے اور اسے گرفتار کرنے کے لیے ہمیں اپنے کئی ساتھیوں کی قربانی دینی پڑی ہے۔ ہم تو اسے قتل کرنا چاہتے تھے لیکن ہم نے سوچا کہ یہ ایک بہادر اور شجاع نوجوان ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی خوبصورت اور وجیہہ ہے لہٰذا ہم نے اسے زندہ گرفتار کر کے آپ کے سامنے پیش کرنے کو ترجیح دی۔ پرتگیزی کمانڈر نے فوراً اس کی زنجیریں کھولنے کا حکم دیا اور اسے ان کی بندش سے آزاد کرتے ہوئے مخاطب کیا کہ اے خوبصورت نوجوان! تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ اور تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے جواب میں اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتادیا اور کہا کہ وہ اپنے علاقے کا حاکم ہے اور اپنے دوستوں کے ساتھ سیر سپاٹے اور شکار کی غرض سے نکلا تھا کہ طوفان نے اسے عمان کے ساحل تک پہنچادیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مجھے اس ساحل کا علم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آپ کے آدمیوں نے مجھ پر حملہ کیا، میرے ساتھی اپنے بچاؤ کی خاطر سمندر میں کود پڑے اور میں گرفتار ہو کر آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہوں۔ اتنا کہہ کر حمل خاموش ہوا۔ پرتگیزی کمانڈر نے ذرا توقف کرتے ہوئے میر حمل کو ایک پیشکش کی اور اس سے یوں گویا ہوا: اے خوبرو و بہادر نوجوان ہم تم سے مل کر خوش ہوئے ہیں۔ میرے ساتھیوں نے تمہاری بہادری اور شجاعت کی بہت تعریف کی

ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ انہوں نے تمہیں زندہ گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کیا۔ اب میں آپ کو ایک پیشکش کرتا ہوں، یعنی میں تمہیں اس علاقے کا گورنر مقرر کرتا ہوں، تم اپنا مذہب چھوڑ دو اور عیسائیت قبول کرو اور میری قوم کی جس خوبصورت لڑکی سے چاہو میں تمہاری شادی کر دوں گا، بس اپنے علاقے کو واپس جانے کا خیال دل سے نکال دو۔ یہ پیشکش سُن کر میر حمل کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے کمانڈر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ نہ تو مجھے تمہاری پیشکش قبول ہے اور نہ ہی مجھ سے اس کی قبولیت کی کوئی امید رکھنا۔ نہ میں اپنی بیوی کے ساتھ بے وفائی کر سکتا ہوں اور نہ ہی تمہاری قوم کی کسی لڑکی کو اپنی بیوی بنا سکتا ہوں اور مجھے میرے ساحلوں کی حاکمیت قبول ہے نہ کہ تمہاری بخشی ہوئی گورنری۔ میر حمل کا جواب سن کر کمانڈر کو سخت غصہ آیا اور اس نے اسے دوبارہ زنجیروں میں جکڑنے کا حکم دیا اور کہا کہ اسے سلاخوں کے پیچھے بند کر دو، اس کا کھانا پینا بھی بند کر دو اس کے ہوش خود بخود ٹھکانے آ جائیں گے اور اس کی سرکشی ختم ہو جائے گی۔

اس طرح میر حمل کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ وہ روز قید خانے سے اپنی والدہ اور اپنی پیاری اور خوبصورت بیوی ماہ گنج کے نام پیغامات بھیجتا تھا۔ اس کا قاصد کبھی ہوا کے جھونکے ہوتے تھے تو کبھی کوئی جنگلی کبوتر۔ وہ اشعار کے موتی بکھیر رہا تھا اور قید کے زمانے میں بلوچی ادب کے لیے خزانے کے انبار لگا رہا تھا۔ وہ اپنی رزمیہ اور عشقیہ شاعری میں پوری مقصدیت اور معنویت کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔ جہاں وہ اپنے اوپر بیت جانے والے دردناک اور اذیت ناک لمحات کا تذکرہ المیاتی انداز میں کرتا ہے اور ساتھ ہی وہ اپنی ماں اور بیوی کو اپنی قید ہونے کی اطلاع بھی بھیج رہا ہوتا ہے۔

دوسری طرف اس کی والدہ اور بیوی کو اس کے بارے میں سخت پریشان تھے کیونکہ انہیں اس کی کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی اور نہ ہی اس کے ساتھیوں کی طرف سے کوئی زندہ سلامت واپس آیا تھا۔ اس وجہ سے وہ بہت زیادہ فکرمند ہو گئے تھے۔ وہ گذشتہ دنوں آنے والے طوفان کے بارے میں جانتے تھے اور انہیں خدشہ تھا کہ کہیں □ طوفان نے انہیں نقصان نہ پہنچایا ہو۔ کافی دنوں بعد انہیں قصبہ کے ایک سیلانی باشندے نے اطلاع دی کہ حمل اور اس کے ساتھی پرتگیزیوں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ اس کے کچھ ساتھی تو مارے گئے باقی سمندر

میں کود پڑے جن کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں، البتہ حمل کو زندہ گرفتار کرلیا گیا ہے اور اب وہ عمان میں قید ہے۔ اس کی والدہ اور ماہ گنج جو پہلے ہی رو رو کر ہلکان ہو رہی تھیں، ان کی حالت مزید خراب ہوگئی۔ ماہ گنج اپنے پیار کرنے والے پُرخلوص شوہر کی جدائی میں آنسو بہاتی تھی اور روتی رہتی تھی۔ اس کی حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی تھی جبکہ میر حمل کی والدہ کی طبیعت بھی بیٹے کی جدائی اور قید کی خبر سننے کے بعد سے بہت خراب رہنے لگی تھی۔ وہ گھر جہاں کچھ عرصہ قبل تک خوشیاں ہی خوشیاں اور مسکراہٹیں ہی مسکراہٹیں تھیں ایک دم غم واندوہ کا مرکز بن گیا۔ اس کے سب مکین اداس، پریشان اور غمگین تھے کہ ان کا میر حمل ان سے جدا ہو کر ظالم اور جابر دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے اور اب نجانے وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔

میر حمل قید خانے میں بند تھا کہ ایک دن کمانڈر کی خوبصورت اور جمال آفرین بیٹی اچانک کچھ لذیذ کھانا اور مشروبات لے کر میر حمل کے پاس قید خانے میں پہنچی۔ وہ دراصل اس وقت دربار میں موجود تھا جب میر حمل کو اس کے باپ کے سپاہیوں نے گرفتار کر کے پیش کیا تھا۔ وہ تو اسی وقت اس پر فریفتہ ہوگئی تھی اور اسے دل دے بیٹھی تھی۔ وہ قید خانے میں میر حمل کے لیے کھانا لے کر آئی اور اسے کھانے کے لیے جب پیش کیا تو میر حمل نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ تو اس نے کہا کہ میں کمانڈر کی بیٹی ہوں اور مجھے آپ سے ہمدردی اور محبت ہے۔ آپ مجھے اچھے لگے ہو، اگر میری بات مانو تو میرے والد کی پیشکش کو قبول کرو اور مجھ سے شادی کرلو، ہم ہنسی خوشی زندگی بسر کریں گے۔ میر حمل کو اس لڑکی کی باتوں پر سخت غصہ آیا مگر اس نے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا کہ میں پہلے بھی اپنی بات پر قائم تھا اور اب بھی قائم ہوں۔ میں تم سے ہرگز شادی نہیں کروں گا کہ میں پہلے ہی سے شادی شدہ ہوں اور مجھے اپنی بیوی سے بہت محبت اور پیار ہے۔ میر حمل کا یہ روکھا سا جواب سن کر اس لڑکی کو سخت غصہ آیا اور اسے اپنی بے عزتی قرار دیتے ہوئے میر حمل سے مخاطب ہوئی کہ میں تم سے اس بے عزتی کا بھیانک بدلہ لوں گی۔

میر حمل اپنی شاعری میں ان واقعات کا تذکرہ کرتا ہے اور ان پیشکشوں اور لالچوں کا بھی تذکرہ کرتا ہے جو پرتگیزیوں کی جانب سے اسے دی گئیں مگر اس نے سوچا کہ یہ زندگی ویسے بھی مختصر ہے ان عارضی لذتوں اور سہولتوں کی خاطر میں اپنی قوم اور وطن کے ننگ و ناموس کا سودا ہرگز نہیں کروں گا اور نہ ہی اپنی خوبصورت اور پاک صاف معاشرتی اقدار پر آنچ آنے

دوں گا۔ چاہے پرتگیزی میری جان ہی کیوں نہ لیں۔ وہ جب تک قید رہا شاعری کرتا رہا اور بلوچی ادب کی خدمت حالت قید میں جاری رکھی۔ شاید حمل کو بھی یقین نہیں تھا کہ جب وہ نہیں رہے گا تو اس کا نام اور اس کلام ہمیشہ اسے زندہ رکھیں گے اور اس کی قومی و وطنی خدمات اور کارنامے ہر بلوچ کے دل میں اس کی محبت اور عظمت کو قائم رکھے گا۔

کچھ دنوں تک قید میں رکھنے کے بعد کمانڈر نے اسے دوبارہ طلب کیا اور پھر اسے یہی پیشکش کی اور مزید مال و دولت اور اختیارات دینے کی پیشکش کر کے اسے منانے کی کوشش کی مگر سب کوششیں بے سود اور رائیگاں گئیں۔ میر حمل نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ اس کی کوئی پیشکش اسے قبول نہیں نہ ہی وہ اپنے مذہب سے بے وفائی کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنی وفادار اور خوبصورت بیوی سے۔ گورنر اس کے جواب سے سخت مایوس ہوا اور اسے دوبارہ قید میں ڈالنے اور اذیت دینے کا حکم دیا۔ حمل کو کمانڈر نے بار بار بلایا اور اپنی پیش کش بار بار دھراتا رہا اور اس پر زور ڈالتا رہا کہ وہ اس پیشکش کو قبول کر کے اپنی جان بچا سکتا ہے لیکن بہادر اور شجاع میر حمل نہ جھکنے والا تھا اور نہ ہی بکنے والا، اس کا جواب ہر بار وہی رہا جو پہلا جواب تھا یعنی وہ کسی بھی طور کمانڈر کی شرائط ماننے، اپنے مذہب کو چھوڑنے اور اس کی بیٹی سے شادی کرنے سے صاف صاف انکار۔ جب کمانڈر اور اس کی بیٹی میر حمل کی جانب سے مکمل طور پر مایوس ہوئے تو کمانڈر نے اسے کڑی سزا دینے کا فیصلہ کیا، اسی وقت اس کی بیٹی بھی بول پڑی کہ پچھلے دنوں میں اس کے پاس گئی تھی، اسے کھانا بھی پیش کیا جو اس نے انتہائی حقارت کے ساتھ ٹکرایا اور ہمارے مذہب کے بارے میں بھی الٹی سیدھی باتیں کیں۔ کمانڈر اپنی بیٹی کی جھوٹی باتیں سن کر آگ بگولہ ہوا اور اس نے میر حمل کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ اس طرح قوم و وطن کا یہ عظیم سپاہی نہ تو پرتگیزیوں کے آگے جھکا اور نہ ہی ان پر اپنے وطن اور ساحلوں کو فروخت کیا بلکہ اپنی زندگی کی قربانی دے کر اس نے اپنے ملک اور ساحلوں کا دفاع کیا۔ اس کی وفا شعار بیوی ساری زندگی میر حمل کا انتظار کرتی رہی۔ اس کی بوڑھی والدہ کچھ عرصہ بیٹے کی جدائی کا غم برداشت کیا اور بالآخر وہ بھی راہی ملک عدم ہوا۔

میر حمل کی قربانی، اس کی شاعری اور اس کا رومان بلوچ تاریخ، ادب اور ثقافت کا مضبوط اور قیمتی اثاثہ ہیں جن سے بلوچ تاریخ کے صفحات روشن اور مزین ہیں۔

میر حمل کا ایک اور معاشقہ:

میر حمل کی شاعری کے مطالعہ سے اس بات کا بھی ادراک ہوتا ہے کہ ماہ گنج سے شادی کرنے سے قبل یا تو میر حمل کی کوئی محبوبہ لسبیلہ میں رہتی تھی یا صرف شاعری کی حد تک یہ ایک بیان ہے مگر میر گل خان نصیر نے حمل ہی کی شاعری سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ میر حمل کی کوئی محبوبہ لسبیلہ میں رہتی تھی جس کا نام کہیں پر تحریر نہیں ملتا۔ اس نے کسی دن میر حمل سے ملنے کی خواہش کی اور اسے لسبیلہ طلب کیا۔ لہٰذا میر حمل اپنی محبوبہ سے ملنے لسبیلہ چلا گیا۔ وہ اپنے صبا رفتار گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا لسبیلہ کی جانب رواں دواں تھا کہ اچانک لسبیلہ کے پہاڑی سلسلے کے اندر ایک بھوکا اور خونی شیرِ ببر اس کے سامنے آیا۔ میر حمل شیر کو دیکھ کر بھاگنے کی بجائے اس کے سامنے ڈٹ گیا اور اسے حملہ کا موقع دینے سے قبل ہی اس پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی اور شیر کو اپنی آہنی اور تیز ریروں سے مار ڈالا اور اس کے پنجے کاٹ کر اپنے گھوڑے کی خرجین میں ڈال دیے۔ اپنی اس مہم جوئی اور شیر کے ساتھ مقابلہ کے بارے میں وہ کہتا ہے:

"عاشقیں مردو شیر شکارانی
دائم چو حونیءَ گوئر کائنت"

ترجمہ:
عاشق مزاج نوجوان اور شکار کے لیے پھرنے والے شیر
ہمیشہ خونی دشمنوں کی طرح آپس میں ٹکراتے ہیں

(نصیر (1979):140)

شیر سے مقابل کرنے اور پھر اس کے پنجے کاٹنے میں بھی اسے کافی وقت لگا اور وہ کافی دیر تک وہیں کھڑا رہا کہ مبادا کوئی دوسرا حملہ نہ ہو۔ لہٰذا اسے اپنی محبوبہ تک پہنچنے میں دیر ہوگئی جو اس کی منتظر بیٹھی ہوئی تھی، لہٰذا وہ سوچنے لگا کہ اب تک وہ لسبیلہ نہیں پہنچا اور ابھی تک اس کی محبوبہ کا گھر کافی دور ہے، لہٰذا وہ کہتا ہے کہ:

"شپ کسان انت بانگ و دنت ملا

شپ کسان انت وچون کنت اللہ
دیرنت منی مہرنگ مس گور گیں کھّل ءَ"

ترجمہ:

رات کم باقی رہ گئی ہے اور مُلا اذان دینے والا ہے
رات کم باقی رہ گئی ہے نہ جانے اللہ کو کیا منظور ہے
میری مہرنگ (محبوبہ) اب تک اپنے سفید خیمے میں بہت دور ہے

(نصیر(1979):239)

جب وہ اپنی محبوبہ کے خیمے میں پہنچتا ہے تو اس کے ردِعمل کے بارے میں کہتا ہے کہ:

"زُنب کُت چومُر گھانِ ہوائیان
گردوں گردیت گوں دُروبانہیان"

ترجمہ:

وہ ہوا میں اڑنے والے پرندے کی طرح جھپٹ پڑی
اپنی چوڑیوں کو کھنکھناتی اور بالیوں کو لہراتی میرے چاروں طرف گھومنے اور بلائیں لینے لگی

(نصیر(1979):241)

اس دوران حمل نے اپنی محبوبہ کو اپنے دیر سے آنے کی وجہ بتائی اور راستے میں پیش آنے والے واقعہ یعنی شیر کی ساتھ لڑائی کا حال سنایا۔ تو وہ ذرا مسکرائی مگر جب میر حمل نے اسے شیر کے کٹے ہوئے پنجے خرجین سے نکال کر دکھائے تو وہ حیران رہ گئی اور پریشان ہو کر میر حمل سے لپٹ گئی اور اس نے میر حمل کی بلائیں لینی شروع کی۔ تب میر حمل نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اسے اسی وجہ سے دیر ہو گئی ورنہ وہ کچھ دیر پہلے ہی پہنچ جاتا۔ پھر میر حمل اپنی محبوبہ کی تعریف ان الفاظ میں کرنے لگا:

"دستی گوں بائیکاں رونت بُرزا
جنتی بِماَچینی کا گھدیں دیمءَ
جھل تناآسرزاناں پنیریگین

ھوئیے من باتاں گوں بدیں کارۓ
گردنوں درروُت گوں گوئرۓھارۓ
پہ چشیں شیوازاں تر گیھتک
نیم شپی بیے وھداں تراشپتگ
دوستوں، انبازۓمن وتی گپتگ"

ترجمہ:

اس نے اپنے چوڑیوں بھرے دونوں ہاتھ اوپر کو اُٹھائے
اور اس نے اپنے کاغذ جیسے سفید چہرے پر
اور اپنی پنیر جیسی سفید رانوں پر مار کر کہنے لگی
ہائے میں مرجاؤں کیا بُرا کام میں نے کیا
کہ تم کو ایک ایسی آزمائش میں ڈال دیا
اور آدھی رات کو تمہیں ایسی مصیبت میں پھنسایا
میں نے محبوبہ کو اپنی آغوش میں لے لیا

(نصیر (1979):42-241)

رات اپنی محبوبہ کے ساتھ گزارنے کے بعد میر حمل نے صبح سویرے اس سے جانے کی اجازت لی اور اسی راستے واپس اپنے گھر کی راہ لی جس راستے سے وہ لسبیلہ اپنی محبوبہ سے ملنے آیا تھا۔ جب وہ اس جگہ پہنچا جہاں گذشتہ رات اس کا مقابلہ شیر کے ساتھ ہوا تھا تو اس نے دیکھا کہ شیر کی لاش ابھی تک جوں کی توں پڑی ہے اور اس کے جسم میں میر حمل کے مارے ہوئے تیر اب تک پیوست تھے۔ میر حمل ہولے سے مسکرایا اور گھوڑے سے نیچے اُتر کر اس نے شیر کے جسم میں لگے ہوئے تیر نکالے اور یہ کہتا ہوا اپنے ترکش میں ڈالے کہ یہ تیر کہیں اور کام دیں گے۔

الغرض میر حمل بلوچ تاریخ کی اُن شخصیات میں شمار ہوتا ہے کہ جن کی محبت بھری کہانی کی اس خطے اور قوم کی تاریخ میں جداگانہ اور منفرد حیثیت ہے تو دوسری جانب بطور وطن کے ایک سپاہی کے ان کے کارنامے بلوچ تاریخ کا انمٹ باب ہیں اور ان کی شاعری بلوچی

ادب کا سرمایہ عظیم ہے۔ یقیناً میر حمل کا نام اور ان کے ہر نوع کے کارنامے بلوچ تاریخ میں ہمیشہ زندہ و پائندہ رہیں گے۔

کیاّ و سَدّو:

کیاّ اور سَدّو کی محبت بھری کہانی بھی بلوچستان کی لوک کہانیوں میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ کہانی کے دونوں مرکزی کردار شاعر ہیں اور ان کی شاعری بلوچی ادب میں اہم مقام رکھتی ہے اور بلوچی رومانوی منظوم ادب کے اہم ترین خزائن میں شمار ہوتی ہے۔ اس لوسٹوری کے بارے میں مختصر معلومات دستیاب ہیں۔ کچھ معلومات بلوچی ادب کی منظوم و منثور کتب سے شنید میں آتی ہیں جبکہ کچھ معلومات لوک داستانوں پر لکھنے والے مصنفین اور ادیبوں کی تحریروں سے مل جاتی ہیں جن کے مطالعہ سے اس کہانی کے کرداروں اور اس کے پورے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے۔ میر گل خان نصیر کی کتاب ''بلوچی عشقیہ شاعری'' میں اس کہانی کے مرکزی کرداروں یعنی کیاّ اور سَدّو اور ان کی شاعری کے بارے میں کسی حد تک معلومات مل جاتی ہیں، جبکہ میر گل خان نصیر ہی کی تحریر کردہ کتاب ''بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی'' میں بھی ان کرداروں کے تذکرے ملتے ہیں۔ مصنف جمیل زبیری نے بھی کیاّ اور سَدّو کی کہانی کو انگریزی زبان میں مختصراً اپنی کتاب ''فوک ٹیلز آف بلوچستان'' میں بیان کیا ہے۔ لہٰذا ان کرداروں کی کہانی کسی حد تک واضح ہو جاتی ہے البتہ وقت اور تاریخ کا تذکرہ کسی نے نہیں کیا۔ اغلب خیال یہی ہے کہ یہ کہانی سولہویں یا سترہویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کہانی کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے:

کہتے ہیں کہ ایرانی بلوچستان کے علاقے ''باہو'' میں ایک نوجوان رہتا تھا کہ جو پیشہ کے لحاظ سے گلہ بان تھا اور اس کے پاس بھیڑ بکریوں اور مویشیوں کا بڑا ریوڑ تھا۔ اس کا نام ''کیاّ'' تھا۔ ایرانی بلوچستان کا علاقہ بیشتر صحرا اور بنجر پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہے جہاں پانی اور چارے کی شدت قلت رہتی ہے، جبکہ ماضی میں بھی یہی صورتحال تھی۔ اگر بارشیں ہوتی ہیں تو کسی حد تک چرواہوں کا گزر بسر ہو سکتا ہے وگرنہ زیادہ تر خشک سالی اور پانی کی قلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیاّ کے لیے بھی حالات کچھ ایسے ناسازگار ہوئے کہ باہو میں طویل خشک سالی

ہوئی جس کے نتیجے میں وہ اپنا ریوڑ لے کر مشرق کی جانب مکران میں داخل ہوا اور سفر کرتا ہوا دریا پورالی کے قریب لک کے مقام پر پہنچ گیا۔ یہاں اسے اپنے اور اپنے جانوروں کے لیے وافر مقدار میں پانی اور خوراک مل گیا۔ دریا پورالی کے کنارے سرسبز گھاس سے بھرے ہوئے تھے اور سال بھر یہاں سبزہ رہتا تھا جبکہ پانی بھی کافی مقدار میں دستیاب تھا۔ لہٰذا اُس نے اپنے ریوڑ سمیت یہیں پر قیام کیا۔

یہاں قریب ہی ایک گاؤں تھا جبکہ کئی دیگر خانہ بدوش خاندان بھی آس پاس سکونت رکھتے تھے جو کہ بلوچستان کے ان علاقوں سے اس طرف نکل آئے تھے جہاں خشک سالی تھی۔ اس گاؤں کی جانب سے ایک کمسن وخوبرو، حسین وجمیل، خوبصورت ورعنا، دلبرو دلربا سولہ یا سترہ سال کی لڑکی (زبیری (2002):56) بھی اپنی بھیڑ بکریاں چرانے آتی تھی اس کا نام سَدّو تھا۔ رِکیا اکثر اس کی طرف دیکھتا اور اس سے مخاطب ہونے کی کوشش کرتا مگر لڑکی کی بے اعتنائی اور بے رُخی دیکھ کر اسے ہمت نہیں پڑتی تھی مگر اس میں شک نہیں کہ اس نے رِکیا کا دل چھین لیا تھا اور اس کے آرام اور سکون کو غارت کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت اس کے بارے میں سوچنے لگا تھا اور سورج نکلتے ہی اس کی راہ تکنے لگتا تھا۔ لیکن مجال ہے کہ سَدّو نے آنکھ اُٹھا کر بھی اس کی طرف جو دیکھا بھی ہو۔ اس کی اس بے اعتنائی اور بے رُخی کی وجہ سے وہ کبھی مایوس ہوتا تو کبھی اس آس پر پُرامید ہوتا کہ کبھی نہ کبھی تو اس کا دل پسیج جائے گا اور اس کی طرف مائل ہو جائے گی۔ رِکیا کو اپنی امیدوں میں جب ناکامی نظر آنے لگی تو اس سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا اور بجائے لڑکی سے براہِ راست مخاطب ہونے کے ایک دن سیدھا اس کے گھر پہنچا اور اس کے والد سے ملا۔

سَدّو کے والد نے رِکیا سے اس کے حسب نسب، مال املاک اور ذرائع معیشت کے بارے میں پوچھا، اور جب اس طرف سے مطمئن ہوا تو اس نے ایک اور عذر پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم بنیادی طور پر ہوت ہیں اور کلمتی کہلاتے ہیں، ہم ہوت خاندانوں کے علاوہ اور کہیں پر اپنی لڑکیاں نہیں بیاہتے لہٰذا اس سلسلے میں مجھے کچھ سوچ و بچار کرنے دو۔ رِکیا نے جب دال گلتے ہوئے دیکھا تو کہا میں ابھی تک اپنے ریوڑ کے ساتھ یہیں پر ہوں جب بھی آپ مجھے بلائیں گے میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اس طرح اس نے سَدّو کے گھر تک رسائی حاصل کر کے

بات بھی چھیڑ دی تھی اور اس کو اپنانے کا راستہ بھی کافی حد تک استوار کر لیا تھا، اس سے بھی بڑھ کر اس نے سَدّو کے دل میں اپنے لیے مقام اور مرتبہ بنا لیا تھا اور اس کی مکمل توجہ حاصل کر لی تھی۔ سَدّو شروع میں اس کی طرف اس لیے بھی نہیں دیکھتی تھی کیونکہ اول تو یہ روایات کے خلاف تھا کہ کسی غیر مرد کے ساتھ بات چیت کی جائے اور اس سے راہ و رسم بڑھائے جائیں، دوم یہ کہ سَدّو کے خیال میں وہ جو ٹکٹکی باندھے ہر وقت اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے یا اس کا منتظر رہتا ہے بس عام مردوں کی طرح ہے جو ہر عورت کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ مگر جب رِکیا نے اس کے والد سے عزت اور آبرو کے ساتھ اس کا رشتہ طلب کیا تو وہ نہ صرف مطمئن ہوئی بلکہ بہت خوش بھی ہوئی کیونکہ وہ بھی رِکیا کو پسند کرتی تھی اور روز اس طرف جانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اُسے دیکھ سکے اور اس کا دن بہتر گزر سکے، مگر رسم دنیا کی وجہ سے اس سے کوئی بات نہیں کر پاتی تھی اور اسے کچھ ڈر بھی لگتا تھا، مگر اب ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ دل و جان سے ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ سَدّو تو دن بھر اس کے خیالوں میں کھوئی رہتی تھی اور اسی کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ اب رِکیا اس کی زندگی کا مقصد بن چکا تھا اور اس نے اپنے آپ کو اس کے نام کر دیا تھا۔ وہ اب ندی کنارے اپنے ریوڑ کو چرانے جاتی تھی تو رِکیا سے بھی ملتی تھی اور دونوں ندی کنارے اپنے ریوڑوں کو چرنے کے لیے چھوڑ کر آپس میں بیٹھ کر باتیں کرتے اور اپنے مستقبل کے بارے میں منصوبہ بندی کرتے۔ دونوں ہی اپنی جگہ خوش تھے کہ انہیں ان کی منزل ملنے والی ہے۔ سَدّو نے اسے یقین دلایا تھا کہ ان کا والد انہیں رشتہ دینے سے انکار نہیں کریں گے لہٰذا رِکیا کسی حد تک مطمئن تھا۔ پھر ایک دن سَدّو کے والد نے رشتے کے لیے ہاں کر دی تو رِکیا اور سَدّو خوشی سے پاگل ہو گئے کہ ان کو ان کی منزل مل گئی ہے۔ اب رِکیا کی باری تھی کہ وہ قدم بڑھاتا اور اپنی سَدّو کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا مگر اس نے اس وقت شادی کرنے کی بجائے اپنا ریوڑ سَدّو کے پاس چھوڑا اور خود اپنے علاقے با ہو چلا گیا۔

رِکیا وہاں جا کر جیسے سَدّو کو بھول ہی گیا اور اپنے گاؤں کی کسی اور لڑکی سے اسے پیار ہو گیا۔ سَدّو بیچاری پورالی کنارے اس کا انتظار میں اپنے شب و روز بسر کرتی رہی۔ وہ صبح اپنا اور رِکیا کا ریوڑ لے کر نکلتی اور اس جانب نکلتی جہاں سے اس کے آنے کی امید تھی اور اُن راہوں

کو صبح سے دن ڈھلنے تک تکتی رہتی۔ رِکیا کو نجانے کیا ہو گیا تھا کہ وہ اپنی سَدّو کو بھول گیا تھا، سَدّو دل ہی دل میں نجانے کیا کیا سوچتی رہتی۔ کبھی اس کے دل میں یہ خیالات آتے کہ کہیں خدانخواستہ اسے کچھ ہو تو نہیں گیا، پھر خود سے کہتی: نہیں نہیں اسے کچھ نہیں ہوا یقیناً اسے کوئی لمبا کام پڑ گیا ہوگا اور وہ اسے نمٹا کر جلد واپس آ جائے گا۔ کبھی سوچتی کہ اس نے کہیں اور شادی نہ کر لی ہو اور اپنی نئی دلہن کے ساتھ خوش و خرم رہ رہا ہو اور اسے بالکل بھول گیا ہو، پھر کہتی کہ نہیں میرا رِکیا ایسا نہیں ہو سکتا، وہ صرف مجھ سے پیار کرتا ہے اگر اس کے دل میں کچھ ہوتا تو وہ میرا رشتہ نہ مانگتا اور اپنا ریوڑ ہمارے پاس چھوڑ کر نہ جاتا۔ اس نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ ضرور آئے گا اور مجھے اس پر پورا پورا بھروسہ اور یقین محکم ہے۔

سَدّو کا والد بھی رِکیا کی طویل غیر حاضری اور سَدّو کی پریشانی سے آگاہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سَدّو صبح سویرے دونوں ریوڑوں کو لے کر ان راستوں کی طرف جا نکلتی ہے جہاں سے رِکیا کے آنے کی امید ہے۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سَدّو دن بدن جوان ہوتی جا رہی ہے اور اس کے خاندان میں کئی لوگ اس کا رشتہ طلب کر رہے ہیں۔ سَدّو کے والد کے کئی قریبی عزیز و اقارب بھی اس کی بیٹی کا رشتہ طلب کر رہے تھے اور اس پر دباؤ بھی ڈال رہے تھے۔ سَدّو کا والد ایک دن اُس سے کہنے لگا کہ بیٹی پتہ نہیں کہ رِکیا آتا بھی یا نہیں، اس کی خیر خبر بھی کوئی نہیں دے رہا، نجانے وہ زندہ بھی ہے یا خدانخواستہ کسی حادثے کا شکار تو نہیں ہوا، مجھے برادری والے بہت تنگ کر رہے ہیں اور تمہارا رشتہ اپنی برادری میں کرنے کے لیے دباؤ ڈال رہے ہیں۔ اب تو دو سال ہو گئے اور رِکیا کا کوئی حال احوال نہیں ہے۔ میری بات مانو اب اس کا مزید انتظار چھوڑ دو، اگر وہ زندہ ہوتا تو ہمیں ضرور کوئی اطلاع بھیجتا، مگر ان دو سالوں میں نہ تو اس نے ہماری کوئی خیر خبر لی اور نہ ہی اپنا کوئی حال احوال بھیجا۔

والد کی باتیں سن کر سَدّو بولی کہ بابا! میں رِکیا کے بغیر کسی سے شادی نہیں کروں گی، میری نسبت اسی سے طے ہوئی ہے، مجھے امید ہے کہ وہ زندہ ہے اور بہت جلد ہم سے ملنے اور شادی کرنے آئے گا، آپ جلد بازی نہ کریں اور مزید کچھ عرصہ تک انتظار کریں۔ اس کا والد بیچارہ خاموش رہا اور مزید انتظار کرنے لگا۔ ادھر سَدّو دن رات رِکیا کے واپس آنے کے لیے دعائیں کرتی رہی۔ شاعر کہتا ہے کہ اس نے ایک طوطی کو اپنا پیامبر بنایا اور اسے رِکیا کے قصبہ

باہو کی جانب اس پیغام کے ساتھ بھیجا:

طوطی نلی! طوطی نلی!

طوطی نلی وش رامگین!

ہر دینکہ ئیلہت بی رَوَگ

کُو کُو کن وڈاہ دَے من ءَ

مُلکے نشانہت من دیان

مُلکے کہ نامی باہو اِنت

کھورے کہ مان اِنت دِیر سرین

آپے کہ مان اِنت زمزمین

بگے کہ مان اِنت گِردَ گین

مردے کہ مان اِنت پھُل گُدین

شہ پھُل گُدان، پھُل گُدتَرین

سِرین جابوءَ بارگ کُتہ

کوپگ چُڑَّ گین اِسپرء"

ترجمہ:

اے ندیوں کی طوطی! اے ندیوں کی طوطی!

اب تم اچھی طرح سدھائی گئی ہو

جب تمہارا جی جانے کو چاہے

تو کُوکُو کی صدا لگا کر

مجھے اطلاع دے دو

میں تم کو ایک ایک ایسے ملک بھیجوں گی

جس کا نام باہو ہے

جس میں ایک لمبی پہاڑی ندی بہتی ہے

جس کا پانی آبِ زمزم کی مانند ہے

جس میں اونٹوں کا ایک مُدَوّر گلہ چرتا ہے
جہاں ایک ایسا خوش پوش شخص رہتا ہے
جو خوش پوشوں میں بھی خوش پوش ترین ہے
جس کی کمر ترکش نے پتلی
اور دوش کو مضبوط ڈھال نے
سخت کر دیا ہے۔

(نصیر (1979): 58-257)

پھر سَدّو طوطی سے مزید کہتی ہے کہ جب تم باہو پہنچ کر اس شخص کو دیکھ لو جس کی طرف تمہیں بھیجا جا رہا ہے تو اس سے کہنا:

"کُو کُو کن وِیا نگائی پِنند
مں چُوڑیں باسکائی پِگر
گستا چہ بیلانی پِبَر
وَش وَش مں گوشائی بگوئش
پیگھام صدوتی آرتگان"

ترجمہ:

کُوکُو کی صدا لگا کر
اس کی پگڑی پر بیٹھ جاؤ
اور اپنی منقار سے اس کا بازو پکڑ لو
ساتھیوں سے اسے علیحدہ لے جاؤ
اور آہستہ سے اس کی کان میں کہہ دو
میں صدو کا پیغام لائی ہوں

(نصیر (1979): 59-258)

سَدّو طوطی کو مزید سمجھاتے ہوئے کہتی ہے کہ جب تم اسے علیحدہ لے جا کر میرا سلام دینا تو اسے میرا یہ پیغام بھی پہنچانا:

"اَچ من ترا دوستے گِرِنت
اَچ مں گہہِ د گہترتِرِنت
پہ مہذب ءَسنگین ترنت
ہِزمی قومی و مَستیرِنت
نا کوئی پھُلیں گیشتَرنت
میشی ہزار و پنچ صدنت
نوک زنکین ماد گ یک صدنت"

ترجمہ:

کیا مجھ سے بھی اچھی
کسی اور حسینہ پر تیرا دل آ گیا ہے
کیا وہ مجھ سے زیادہ حسین اور بہتر ہے
مجھ سے بھی زیادہ مہذب اور شائستہ ہے
یا اس کے بھائی بند طاقتور اور بڑے آدمی ہیں
اس کے چچا اور ماموں تعداد میں زیادہ
اور توانا لوگ ہیں
یا اس کی بھیڑیں ہزار اور پانچ سو ہیں
دودھ دینے والی گائیں ایک سو ہیں
اور اونٹوں کے گلے زیادہ اور بہتر ہیں

(نصیر (1979) :60-259)

کہتے ہیں کہ کِیا کے پاس ایک اونٹنی تھی جس کا نام شلنگ تھا۔ اس پوری داستان میں جہاں کِیا اور سَدّو کا کردار شعرأ کرام نے بیان کیا ہے تو ساتھ ہی کِیا کی اس اونٹنی کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ جس پر بیٹھ کر کیا نے بڑا طویل سفر راتوں رات طے کیا تھا یا پھر وہ تیز وطرار اونٹنی بہت جلد ایک طویل فاصلے کو طے کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ لہٰذا جب سَدّو کا پیغام کِیا کو ملا تو اسے اپنی غلطی اور طویل غیر حاضری، سَدّو کی تنہائی اور ان کی پریشانیوں کا احساس ہوا

اور وہ شلنگ پر سوار ہوا اور لسبیلہ کی جانب روانہ ہوا۔ وہ راتوں رات گوادر، کرواٹ، پسنی اور کلمت سے ہوتے ہوئے لسبیلہ پہنچا اور اپنی پیاری سے وفادار محبوبہ سَدّو کے خیمے کی طرف چل پڑا۔ جب وہ سِدّو کے خیمے میں پہنچا تو آدھی رات ہو رہی تھی اور سِدّو محوِ استراحت تھی اور وہ سوتے میں بالکل پریوں کی رانی لگتی تھی۔ اس کی معصومیت اور حسن و رعنائی دیکھ کر کِیّا بے اختیار کہہ اٹھا:

"واب اِنت سِدّو پھُل کھند گین
من شیشم ءِ کَٹّ ءِ سرءِ
من ہیوت ءَ پادمی کنان
چکّانی آگاہ نہ بیت
لیٹِش دَیاں آگاہ نہ بیت
پہ چُکّگوں آگاہ بیت"

ترجمہ:

سَدّو، وہ گُلِ خندان
شیشم کے پلنگ پر سوئی ہوئی ہے
مَیں آہستہ سے اُسے جگانا چاہتا ہوں
اُسے اپنی طرف کھینچتا ہوں
وہ نہیں جاگتی
اُسے ایک پہلو سے دوسرے پہلو پر لٹاتا ہوں
وہ نہیں جاگتی
مگر، جب اُس کا بوسہ لیتا ہوں
تو جاگ اُٹھتی ہے

(نصیر (1979): 61-260)

سَدّو جب کِیّا کے بوسہ لینے پر جاگ جاتی ہے تو بے اختیار اُس کے ساتھ لپٹ جاتی ہے اور اس سے گلے شکوے کرنے لگتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ اس طرح چوروں کی طرح

آنے کی کیا ضرورت تھی، مجھے اپنے آنے کی اطلاع دیتے تاکہ میں آپ کے لیے بناؤ سنگھار کرتی اور خوشبوؤں میں نہا کر آپ کا استقبال کرتی۔ رِکیا اس کے جذبات پر ہنس پڑتا ہے اور اسے یوں جواب دیتا ہے:

"ہر کَس گوں بود عنتُران
تیلاں قبولے تو من ءَ"

ترجمہ:

دوسروں کو ممکن ہے تم
خوشبوؤں اور عطریات میں بسی ہوئی اچھی لگتی ہو
لیکن مجھے تو تم (سرسوں کے) تیل کی بُو کے ساتھ بھی
قبول ہو۔

(نصیر(1979):261)

سَدّو کے والد نے کچھ دن پہلے ہی سَدّو سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر ایک ہفتے کے اندر اندر رِکیا نہیں آیا تو وہ اس کی شادی اپنی برادری میں کر دے گا کیونکہ اس کے قبیلہ نے اسے بہت تنگ کیا ہوا ہے۔ والد کے اس بات کے جواب میں سَدّو نے کہا کہ وہ ضرور آئے گا، اس کا ریوڑ یہیں پر ہے، آپ دل چھوٹا نہ کریں اگر اللہ نے چاہا تو وہ ایک ہفتہ سے قبل ہی آجائے گا۔ اب جبکہ رِکیا آ گیا تھا تو سَدّو کے والد نے بھی اس کے آنے پر خوشی کا اظہار کیا اور چند ہی دنوں میں دونوں کی بڑی دھوم دھام کے ساتھ شادی ہوگئی۔ اس طرح دو محبت کرنے والے دل طویل اور صبر آزما جدائی کے بعد بالآخر ایک ہو گئے۔ رِکیا چند دنوں تک اپنی دلہن کے ساتھ لسبیلہ میں مقیم رہا اور پھر وہ سَدّو کو لے کر باہو چلا گیا جہاں انہوں نے اپنی باقی ماندہ زندگی آرام اور سکون کے ساتھ گزاری۔

بہرام و عزیز:

سردار بہرام خان موجودہ ایرانی بلوچستان کا ایک بااثر سردار تھا جس کا قبیلہ باران زئی کہلاتا تھا۔ باران زئی قبیلہ بلوچستان کے ایرانی حصے کے مضبوط قبیلوں میں شمار ہوتا ہے جس

کے مشاہیر نے خطے کی سیاسی و عسکری تاریخ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران بھی اس قبیلہ نے برطانوی حملہ آوروں کے خلاف زبردست مزاحمتی کردار ادا کیا اور تاریخ بلوچستان کے اوراق پر اپنا نام ثبت کیا۔

1909ء کے دوران ایران پر قاچاری خاندان کی حاکمیت قائم تھی جو اب رو بہ زوال تھی۔ قاچاریوں نے اسی سال ایران کی بلوچ آبادی پر مشتمل صوبہ بمپور سے اپنے گورنر کو واپس بلا لیا۔ ایرانی قاچاری حکومت کے اس غیر دانشمندانہ اقدام سے سرحد اور اس ریگستانی علاقے کے بلوچ قبائل کو متحد اور مسلح ہونے کا موقع مل گیا۔ اس علاقے کے تمام بلوچ سرداروں نے سردار بہرام خان باران زئی کو اپنا سرِ سردار تسلیم کیا اور اس کے جھنڈے تلے متحد ہو گئے۔ لہٰذا بلوچ قبائل کے اس اتحاد کے پیشِ نظر اور ان کی طاقت کے بل بوتے پر سردار بہرام خان نے ان بلوچ علاقوں پر اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ 1914ء کے دوران جرمن جاسوسوں اور ترکوں نے سردار بہرام خان باران زئی سے ملاقات کی اور اسے نہ صرف اسلحہ جنگ فراہم کیا بلکہ جنگی اور دفاعی اخراجات کے لیے بھاری رقم بھی انہیں دے دی گئی۔ ترکوں اور جرمنوں کی جانب سے اس امداد نے سردار بہرام خان کے حوصلے بلند کر دیے۔ لہٰذا اس نے مختصر عرصہ میں ہی ایرانی بلوچستان کے تمام سرداروں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا کر

"شاہِ بلوچستان شیرِ جہان" کا لقب اختیار کر کے حکومت کرنے لگا۔

(کمبرانی (2000):72)

سردار بہرام خان باران زئی کا جس طرح عسکری کردار تاریخ کے صفحات پر سنہرے الفاظ میں مرقوم ہے اسی طرح ان کی ایک رومانوی داستان بھی خطے کی تاریخ میں بڑی شہرت رکھتی ہے۔ ان کی یہ محبت بھری کہانی ان کے ایک غلام کی بیٹی عزیز (آزیز) کے ساتھ مشہور ہوئی کہ جس کے حسنِ لازوال نے ہزاروں دشمنوں کو مار ڈالنے والے میر بہرام خان کو ہی مار ڈالا اور وہ اس لڑکی کے حسن و جمال اور خوبصورتی پر ہزار دل و جان سے فدا و فریفتہ ہوا۔

عزیز کا پورا نام عزیز خاتون (خاتون) تھا اور وہ میر بہرام خان کے ایک بلوچ ملازم کی بیٹی تھی۔ جمیل زبیری لکھتا ہے کہ وہ مچھ قوم سے تعلق رکھتی تھی (زبیری (2002):60) یقیناً زبیری صاحب مید کو مچھ تحریر کر رہے ہیں جبکہ مچھ بلوچی زبان میں اس پودے کو کہتے ہیں

جس کے لمبے لمبے پتوں سے چٹائیاں اور اس نوع کی دیگر اشیاء بنتی ہیں۔ ممکن ہے کہ عزیز کا تعلق بلوچوں کے مشہور قبیلہ مید سے ہو جن کی اکثریت کا پیشہ ماہی گیری ہے۔ بہر حال اس بحث سے قطع نظر کہ اس کا تعلق کس قبیلہ سے تھا، صرف اتنا جاننا ضروری ہے کہ وہ میر بہرام خان کے ایک ملازم کی حسین و جمیل اور خوبصورت و رعنا، سگھڑ و لائق اور بردبار و ملنسار بیٹی تھی۔ میر بہرام خان کی ایک بار اس پر نظر پڑی اور پہلی ہی نظر میں وہ اپنا دل ہار گیا۔ میر بہرام خان ایک شریف النفس اور بہادر حکمران تھا، وہ چاہتا تو ملازم کی بیٹی کو دیگر حکمرانوں کی طرح اپنے حرم میں داخل کر سکتا تھا مگر چونکہ بلوچ قوم میں یہ انتہائی معیوب عمل سمجھا جاتا ہے اور اس کو عورت اور مرد دونوں کی بے عزتی اور بدنامی تصور کیا جاتا ہے لہٰذا بلوچ روایات میں کسی بھی عورت کو زبردستی اپنے حرم میں داخل کرنا ناقابلِ معافی جرم مانا جاتا ہے اور اس کی کوئی معافی نہیں ہوتی۔ لہٰذا میر بہرام خان نے رواج اور شریعت کے مطابق عزیز کے لیے رشتہ بھیجا اور اس سے نکاح اور شادی کی خواہش ظاہر کی۔ یہ پیغام سُن کر عزیز کے والدین سخت پریشان ہوئے کہ میر بہرام خان حاکم ہے اور وہ اس کی رعایا ہی نہیں بلکہ ذاتی ملازم بھی ہے، ان کی اور میر بہرام کی حیثیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، کہاں حاکمِ وقت اور کہاں اس کا غلام (ملازم)۔ عزیز کے والد نے یہ بھی سوچا کہ میر بہرام خان کی پہلے سے ہی تین بیویاں ہیں، نجانے وہ میری بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کریں جبکہ خاندانی اور سماجی لحاظ سے بھی اُن خواتین کا رتبہ ہم سے زیادہ ہے۔ وہ میری بیٹی کو ایک پل بھی اپنے محل میں یا میر بہرام خان کے پاس رہنے نہیں دیں گی اور اسے چلتا کریں گی۔ میر بہرام خان کے ساتھ ہماری بیٹی کی خوشیاں صرف چندروزہ ہوں گی اور پھر۔۔۔ یہ سوچ کر اس کے والد نے سوچا کہ یہ رشتہ کسی بھی طور موافق نہیں ہے، اگر رشتہ دے دیتا ہوں تو خدشہ ہے کہ میری بیٹی کی خوشیاں چندروزہ ہوں گی اور اگر رشتے سے انکار کرتا ہوں تو نجانے حاکم وقت میر بہرام خان ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے؟ وہ کئی دنوں تک انتہائی پریشانی کی حالت میں سوچتا رہا اور ہر طرح سے سوچ کر اور اس رشتہ کو نامناسب سمجھتے ہوئے میر بہرام خان کو انکار کر دیا اور عزیز کا رشتہ اسے نہیں دیا۔ میر بہرام خان نے بارہا کوشش کی اور کئی معززین کو درمیان میں ڈال کر یہ رشتہ طے کرانے کی کوشش کی مگر عزیز کا والد بھی اڑ گیا اور رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ میر بہرام خان عزیز سے رشتہ طے نہ پا جانے پر بڑا اداس اداس اور

پریشان وخستہ حال رہنے لگا۔ اسی دوران کسی نے اسے یہ اطلاع دی کہ عزیز کی شادی اس کے والد نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار سے کردی ہے تو جیسے اس پر بجلی آگری ہو اور وہ جل کر بھسم ہو گیا ہو۔ کم وقت ہونے کی وجہ سے اس نے وقتی طور پر اپنے حواس پر قابو پایا اور کسی پر بھی اپنی دلی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دی، مگر اندر ہی اندر جیسے کسی نے اس کو چھرا گھونپ دیا ہو اور وہ چھلنی جگر ہو چکا ہو۔ دربار سے رخصت ہو کر جب وہ محل سرا میں اپنے کمرے میں پہنچا تو اس کی طبیعت خراب ہوگئی اور وہ بیمار ہو کر بستر پر گر پڑا۔ اب اس کی طبیعت خراب رہنے لگی، اس نے کھانے پینے میں دلچسپی لینا بالکل چھوڑ دیا، اپنی صحت کی جانب سے بالکل لاپرواہ ہو گیا، دربار سے غیر حاضر رہنے لگا اور ریاستی امور اور سیاسی معاملات میں دلچسپی لینا بالکل چھوڑ دیا اور محل میں اداس اپنے کمرے میں قید تنہائی میں پڑا رہتا۔ اس کی اس گوشہ نشینی اور ریاستی معاملات میں عدم دلچسپی سے اس کے دشمنوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس کے علاقوں پر چڑھ دوڑے۔

ادھر جب عزیز نے دیکھا کہ میر بہرام خان ایک طاقتور اور خودمختار حکمران ہوتے ہوئے بھی اسے جس شرافت اور عزت کے ساتھ اس کے والد سے طلب کر رہا ہے تو اسے بھی میر بہرام خان سے عقیدت ہوگئی جو میر بہرام خان کے انتہائی شریفانہ اور وضع دار رویے کی وجہ سے حد درجہ گہری اور سچی محبت میں تبدیل ہوتی گئی اور عزیز کو بھی میر بہرام خان اچھے لگنے لگے۔ اسی دوران عزیز کے والدین نے اس کی مرضی و منشاء کے بغیر اس کی شادی اپنے ہی خاندان کے ایک نوجوان کے ساتھ کردی جو میر بہرام خان کی فوج میں سپاہی تھا۔

عزیز کی شادی سے میر بہرام خان کے دل کو سخت ٹھیس پہنچی اور وہ دل گرفتہ ہو کر گوشہ نشین ہو گیا۔ مگر جب اسے اپنے ملک بمپور و کرمان پر اپنے دشمن صفویوں کے حملے کی خبر ملی تو اس کی روایتی بہادری اور جلال جاگ اٹھی۔ اس نے ایک زبردست فوج تیار کی اور دشمن کے مقابلے پر نکل پڑا۔ اس فوج میں عزیز کا شوہر بھی شامل تھا۔ جب جنگ شروع ہوئی تو میر بہرام خان کی فوج نے بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ اپنے سے زیادہ تعداد دشمن کو ناکوں چنے چبوائے اور اسے شکست دے کر بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ میر بہرام خان نے دیکھا کہ عزیز کا شوہر انتہائی بہادری کے ساتھ لڑ رہا ہے تو اسے کسی قدر اطمینان ہوا کہ یہ نوجوان واقعی اس

قابل ہے کہ عزیز اس کی بیوی بنے۔ اس نے میر بہرام خان کی دیکھا دیکھی کئی دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور شمشیرزنی اور نیزہ بازی کے ایسے کرتب دکھائے کہ دشمن کے کئی سپاہی مل کر بھی اس کے حملوں کی تاب نہ لا سکے۔ میر بہرام خان اس کی بہادری سے سخت متاثر ہوا۔ مگر افسوس کہ جنگ میں وہ بہادر نوجوان مارا گیا۔ جنگ کے اختتام پر فاتح فوج بمپور کی گلیوں میں فتح کا جشن مناتا ہوا اندرون شہر پہنچا۔ شہدا کی تدفین کی گئی اور فاتح لشکر کے سپاہیوں کی خاطر و مدارت اور زخمیوں کے علاج معالجہ کا بندوبست کیا جانے لگا۔ اگلے دن میر بہرام خان عزیز کے گھر پہنچا اور اس کے والد سے عزیز کے شوہر کی موت پر افسوس اور دکھ کا اظہار کیا اور ساتھ ہی اس کی بہادری اور جانبازی کی زبردست الفاظ میں تعریف کرتے ہوئے اسے خراج عقیدت پیش کیا۔ اس کے علاوہ اس کی شہادت اور خدمات پر اس کی بیوہ اور گھر والوں کو نقد انعام بھی دیا۔ جس سے عزیز اور بھی زیادہ متاثر ہوئی کہ میرا شوہر اس کا رقیب تھا اور اُس سے پہلے اِس نے میرا رشتہ طلب کیا تھا مگر اس کی اعلیٰ ظرفی اور بڑا پن ہے کہ وہ میرے مرحوم شوہر کی بہادری کی تعریف کر رہا ہے اور اسے خراج عقیدت پیش کر رہا ہے اور ساتھ ہی نقد انعام بھی دے رہا ہے تا کہ ہماری کفالت کے لیے کوئی مالی مسئلہ نہ ہو۔ عزیز کو جیسے عشق ہو گیا اور وہ میر بہرام خان کو دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگی اور اس کے سپنے دیکھنے لگی۔

میر بہرام خان اس انتظار میں تھا کہ عزت اپنی عدت پوری کرے اور جب اس کی عدت کے دن پورے ہو گئے تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میر بہرام خان نے ایک بار پھر اُس کے والد سے اس کا رشتہ طلب کیا۔ اب کی بار انکار نہیں ہوا اور عزت کے خاندان والوں نے ہاں کر دی۔ اس طرح میر بہرام خان طویل انتظار اور اذیت ناک لمحات کے بعد بالآخر عزت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ عزت اس سے بے حد محبت کرنے لگی اور اسے وہ پیار دیا جس کا وہ حقدار تھا۔ عزت تو پہلے ہی سے مرمٹی تھی اور جب میر بہرام نے اس سے شادی کر کے اس کی عزت بڑھا دی تو وہ بھی اپنے شوہر پر جان دینے لگی تھی۔ اس طرح ان کی محبت زبانِ زدِ عام ہوتی گئی اور دور و نزدیک ان کی محبت اور عشق کے چرچے ہونے لگے۔ بعض لوگوں نے میر بہرام خان کے اس اقدام کو سراہا اور اس کا بڑا پن قرار دیا کہ اس نے اپنے ایک ملازم کی بیوہ بیٹی کو اتنی عزت اور شرف عطا کا اور اس کی پہلی شادی سے قبل بھی اس کا رشتہ طلب کیا جبکہ انکار

کی صورت میں اسے حاصل کرنے کی شرعی طریقے سے کوشش ضرور کی مگر مجال ہے کہ بطور حاکم اس نے اپنی طاقت کا ذرا برابر بھی غلط استعمال کیا ہو۔ اس نے تو اپنا سب کچھ عزت کی قدموں میں لا کر ڈال دیا تھا پھر بھلا اس کے خلاف یا اس کو حاصل کرنے کے لیے وہ طاقت کا استعمال کیسے کر سکتا تھا۔ جبکہ عزت کے بیوہ ہونے کے بعد بھی اسے اپنی زوجہ بنانے کی جب خواہش کی اور اسے عزت واحترام کے ساتھ اپنی منکوحہ بنانے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے نہ صرف عزت اور اس کے خاندان والوں کا دل جیت لیا بلکہ ہزاروں لوگ اس کے اس عظیم کردار اور شرافت پر فدا ہو گئے۔ البتہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس رشتے کو میر بہرام کی شان اور مرتبے کے خلاف سمجھتے تھے اور اس کی اس حرکت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ انہیں یہ پسند نہیں تھا کہ ایک غلام کی بیٹی میر بہرام خان کی بیوی بنے اور اس کا یہ غلام خاندان اُن کے ہم پلہ ہو۔ ان لوگوں کو اپنا دستار خطرے میں نظر آنے لگا تھا۔ ان کے خیال میں میر بہرام خان کے اس عمل کا مستقبل میں خطرناک اثرات مرتب ہو سکتے ہیں اور بلوچستان میں طبقاتی نابرابری کا خاتمہ ہونے کے لیے راستہ ہموار کر سکتی ہے اور میر بہرام خان کی یہ حرکت اس کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ میر بہرام خان یہ رشتہ نہ کرتے مگر جب میر بہرام خان نے نہ صرف عزت سے شادی کی بلکہ اس کی بے پناہ محبت میں اینسے کھو گیا کہ اس سے نکلنے کا نام ہی نہیں لینے لگا تو ایسے امراء، جو طبقاتی تقسیم کے حامی تھے، کے امیدوں پر اوس پڑ گئی۔

میر بہرام خان کی کوئی اولاد نہ تھی اور اس کمی کا اسے اس لیے بھی شدت سے احساس تھا کیونکہ اسے اپنی ریاست کے لیے ایک ولی عہد اور اپنے بعد ایک حکمران اور وارث کی بڑی خواہش تھی مگر پہلی تینوں بیویوں سے بھی اسے کوئی اولاد نہ ہوئی تو اس نے عزت سے شادی کی مگر شاید اس کے نصیب میں اولاد نہیں تھی کیونکہ عزت سے بھی اس کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ کافی عرصہ گزر جانے کے بعد میر بہرام خان نے عزت کی اجازت سے صرف اولاد کی خواہش کی خاطر ایک اور عورت سے شادی کی اجازت طلب کی۔ عزت نے بڑی خوشدلی کے ساتھ اسے شادی کرنے کی اجازت دے دی۔ جس خاندان میں اس نے شادی کے لیے رشتہ بھیجا وہ قبائلی اور سماجی مرتبہ کے لحاظ سے میر بہرام خان کے خاندان کا ہم پلہ تھا مگر انہوں نے میر بہرام خان کو رشتہ دینے سے انکار کرتے ہوئے انتہائی طنزیہ رویہ

اختیار کیا اور کہا کہ: میر بہرام خان آپ بہت بڑے آدمی ہو، ہم آپ کے مرتبے کے نہیں ہیں، آپ کے لیے عزت کا خاندان اور عزت جیسی بیوی ہی کافی ہے ہماری بیٹی اور خاندان ایسا نہیں کہ آپ اور عزت کی ہمسری کر سکیں۔

اس جواب سے میر بہرام خان بھی تلملا گیا اور اس نے بھی اس خاندان کو ایک خط لکھا اور اس میں اُن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ: میں ہزاروں عورتیں عزت کی وفا اور محبت پر قربان کر دوں، میرے لیے کوئی بھی عورت عزت کے برابر نہیں ہو سکتی اور جو محبت مجھے عزت سے ہے وہ دنیا کی کسی اور عورت سے نہیں ہو سکتی۔

میر بہرام خان کی اتنی محبت دیکھ کر اُس پر مر مٹنے اور فدا ہونے والی عزت اس کی اور زیادہ گرویدہ اور قدردان ہوگئی اور عبادت کی حد تک اس سے محبت کرنے لگی۔ کہتے ہیں میر بہرام خان کے دشمن ایک بار پھر اُس کے خلاف سازشیں کرنے لگے اور میر بہرام خان کے شہر بمپور پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ جب میر بہرام خان کو دشمن کے ان عزائم کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے لشکر کو تیار کیا اور اس سے پیشتر کہ دشمن اُس پر حملہ آور ہوتا وہ دشمن کے کیمپ کی جانب روانہ ہونے لگا۔ جب وہ اپنے لشکر کا معائنہ کرنے لگا تو اس نے ایک کمسن اور نازک سے فوجی کو دیکھا تو مبہوت رہ گیا کیونکہ وہ کوئی اور نہیں خود اس کی بیوی عزت تھی۔ اس نے جب عزت سے اس مہم جوئی پر جانے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ میرا جینا مرنا سب آپ کے ساتھ ہے آپ جنگ پر جا رہے ہیں بھلا مجھے گھر میں کیسے آرام آ سکتا ہے، لہٰذا میں نے بھی آپ کے ساتھ جنگ پر جانے کا فیصلہ کیا ہے، میر بہرام خان نے اس کی جانب مسکراتے ہوئے دیکھا اور اپنی فوج سے مخاطب ہوا کہ اس دفعہ جیت ہر حال میں ہماری ہے کیونکہ ہمارے ساتھ قوم کی ماں بھی جنگ میں شانہ بشانہ کھڑی ہے۔ یہ سن کر اس کے فوجیوں میں ایک نیا جوش اور جنون پیدا ہوا اور انہوں نے فلک شگاف نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں اور جنگ شروع ہوئی تو دشمن، جس کی تعداد میر بہرام کی فوج سے کئی گنا زیادہ تھی، میر بہرام کی فوج پر تابڑ توڑ حملے شروع کیے اور بہت جلد میر بہرام کی فوج میں پسپائی اور ہزیمت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ عزت نے جب یہ صورتحال دیکھی تو اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور یکبارگی دشمن کی صفوں میں گھس گئی،

اس کی اس جرأت نے پیچھے ہٹتے ہوئے فوج کے پاؤں جیسے روک دیے ہوں اور اس کے بعد میر بہرام اور اس کی فوج نے دشمن پر ایسا حملہ کیا کہ اس کی تعداد زیادہ ہونے کے باوجود اسے ہزیمت سے دوچار کیا اور دشمن کی فوج شکست کھا کر ایسے بھاگی کہ کسی سپاہی نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا .زبیری کے بیان کے مطابق میر بہرام خان اس جنگ میں مارا گیا مگر اس کی بیوی کی بہادری کی وجہ سے اس کی فوج یہ جنگ جیت گئی۔ (زبیری (2002:61) مگر دیگر مستند بیانات کے مطابق میر بہرام خان طبعی موت اس جہان فانی سے کوچ کر گیا اور اس کا انتقال 11 اگست 1921ء میں ہوا۔

میر بہرام خان کی موت سے عزیز کی جیسے جہاں لٹ گیا ہو، وہ اپنے بے پناہ پیار اور عزت کرنے والے شوہر کی یاد میں دن رات روتی اور اس کے لیے دعائیں کرتی تھی۔ بعض مستند بیانات کے مطابق جب تک عزت زندہ رہی اس نے اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں رکھا اور میر بہرام خان کی طرح سیاسی وریاستی امور چلاتی رہی اور عوام ان کی حاکمیت میں خوش، پُرامن اور آسودہ حال رہی۔ مگر وہ زیادہ عرصہ اپنے عظیم اور عزیز شوہر کی جدائی کا غم برداشت نہ کرسکی اور مختصر سی علالت کے بعد انتقال کر گئی۔ ان کے انتقال کے بعد میر بہرام خان کا بھتیجا امیر دوست محمد باران زئی بمپور کا حاکم بنا۔

بیبرگ و سدو:

بیبرگ رند جس کا اصل نام میر بیورغ رند تھا، رند قبیلہ کے نامور سردار میر چاکر خان رند کا بھانجا تھا اور میر باہر خان رند کا بیٹا تھا۔ بچپن ہی س عاشقانہ مزاج رکھتا تھا اور شعر وشاعری کا دلدادہ اور شوقین تھا۔ اس کے اشعار عام بلوچوں کے رزمیہ اشعار سے بالکل مختلف زیادہ تر رومانی، عشقیہ اور فطرت کے مناظر کے حوالے سے مشہور ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بہادر اور دلیر بیبرگ رند پُرامن اور پُرسکون زندگی کا خواہش مند تھا اور جنگ وجدل اور لڑائی جھگڑوں کے سخت خلاف تھا مگر جب بھی قوم وقبیلہ کو اس کی بہادری کی ضرورت پڑی تو اس نے کبھی بھی مایوس نہیں کیا۔ جہاں تاریخ بلوچستان میں میر بیبرگ رند کے معاشقوں کی داستانیں کثرت سے ملتی ہیں جو اس کی عاشقانہ مزاج کا ثبوت فراہم کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کی مہم جوئیوں

اور نا قابل یقین دلیرانہ کارناموں سے بھی اس خطے کی تاریخ کے صفحات مزین ہیں۔

میر بیورغ رند المشہور بہ بیبرگ رند کے معاشقوں میں سے ایک مشہور کہانی سَدّو نامی ایک جت عورت کے ساتھ سننے اور پڑھنے کو ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ علاقہ لاشار میں ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی جو جت (ہوت) قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ انتہائی خوبصورت، حسین، دلکش، بلند قامت، دراز گیسو اور جھیل جیسی گہری آنکھوں والی ایک شادی شدہ عورت تھی جسے دیکھ کر بیبرگ جیسا عاشق مزاج نوجوان اپنا دل ہار بیٹھا۔ وہ سَدّو کو دل دے بیٹھا اور چاہتا تھا کہ وہ اس کی طرف دیکھے اور اس سے بات کرے، محبت کا اظہار کرے اور اس کے ساتھ دوستی کرے۔ مگر مجال ہے کہ سَدّو بیبرگ کو گھاس بھی ڈالتی۔ بیبرگ کہاں پیچھے ہٹنے والا تھا، وہ ضدی عاشق مزاج بہادر نوجوان روز لاشاریوں کے قصبے میں جاتا اور سَدّو کے گھر کی یاترا کرتا۔ اور سرد آہیں بھرتا ہوا یہ اشعار کہتا جاتا:

"نئے دوست منیت کہ وش کنتان زِردءَ
نئے کہ کنت ناہے من ہاترائی بہلان
مارا، مس نیامءَ گمبُلان داشتہ
بُرزی نودان و بار گیں نشینکان"

ترجمہ:

نہ تو محبوبہ مانتی ہے
کہ میرا دل خوش ہو جائے
اور نہ انکار کرتی ہے
کہ میں اس کا خیال چھوڑ دوں
بس، مجھے درمیانی فضاء میں
آسمان اور گہر نما پتلے بادلوں کے درمیان
لٹکا رکھا ہے۔

(نصیر (1979): 33-232)

لاشاری نوجوان اسے دیکھتے تو کھول اٹھتے اور ان کا دل چاہتا کہ وہ اسے مار ڈالیں

مگر وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ایک تو وہ خود انتہائی بہادر نوجوان، بے مثال شاہسوار، ماہر شمشیر زن اور لاجواب تیر انداز ہے، اور اکیلے کئی نوجوانوں پر بھاری ہے اور دوم یہ کہ وہ کوئی اور نہیں رند سردار میر چاکر خان کا بھانجا ہے جو اس کے خون کے ہر قطرے کے بدلے کئی لوگوں کی جان لے گا۔ لہٰذا الاشاری نوجوان اسے دیکھ کر اکثر کترا کر کسی دوسری جانب چلے جاتے اور بیبرگ سَدّو کے گھر کی جانب بڑھتا اور گنگناتا جاتا۔ بالآخر وہ سَدّو کو رام کرنے میں کامیاب ہوا اور اس سے گفتگو اور ملاقاتیں شروع کیں۔ آہستہ آہستہ اور روز روز کی ملاقاتوں سے سدو کے دل میں بھی بیبرگ کے لیے جگہ بنتی گئی اور وہ اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ اکثر اس کی غیر موجودگی میں بھی اس کے بارے میں سوچتی رہتی تھی اور عشق میں ایسے مگن ہوگئی تھی کہ اپنے گھر بار، شوہر اور دیگر خانہ داری امور کو بالکل بھول گئی تھی۔ اب وہ اکثر راتوں کو بیبرگ کو اپنے پاس طلب کرتی اور ساری رات اس کے گرم و شیریں بانہوں میں بسر کرنے لگی تھی۔ اس کے شوہر کو اپنے کام کاج کے سلسلے میں اکثر گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا لہٰذا تنہائی کے یہ لمحے بیبرگ اور وہ ایک ساتھ گزارتے تھے اور ایک دوسرے میں ایسے مگن ہو جاتے تھے انہیں دنیا و مافیہا کی خبر نہ ہو پاتی حتیٰ کہ سپیدہ سحر ظاہر ہونے پر سَدّو بیبرگ کو منت سماجت کر کے واپس بھجواتی کہ مبادا اس کا شوہر یا کوئی اور گھر نہ آجائے اور انہیں ایک ساتھ دیکھ نہ لیں۔

اس طرح دونوں کی زندگی ملاپ کی چاشنی اور لذت وصال سے بھری ہوئی پُر مسرت تھی مگر اس وصل و لذت میں سب سے بڑی رکاوٹ سَدّو کا شوہر تھا کہ جب وہ گھر پر ہوتا تو بیبرگ اپنے حسین و جمیل محبوبہ سے دور ہوتا اور یہ دوریاں اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھیں، لہٰذا اس نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کیا کہ وہ اب کی بار سَدّو کو ہمیشہ کے لیے حاصل کر کے رہے گا چاہے اس کے لیے اسے اُس کے شوہر یا کسی لاشاری کا خون ہی کیوں نہ بہانا پڑے۔ اس بات کا حتمی فیصلہ کر کے اس نے سَدّو سے ملنے کا انتظار کیا مگر اس کو اپنے اس منصوبہ سے بالکل بے خبر رکھا۔

کچھ دنوں بعد سَدّو نے اس کے لیے پیغام بھیجا کہ وہ بہت بے تاب ہے کتنے دن ہوئے آپ کا دیدار نہیں ہوا، آج رات کو میں آپ کا انتظار کروں گی۔ بیبرگ اسی پیغام کا تو منتظر تھا۔ بعض مستند اور معتبر بیانات کے مطابق یہ اس زمانے کی بات ہے جب میر چاکر خان

رندشوران کے قریب فتح پور کے قلعہ میں اقامت پذیر تھا جہاں سے سدّو کے گھر کا فاصلہ کافی زیادہ تھا لیکن عشق کی آگ میں جلنے والا بیبرگ بھلا ان فاصلوں کو کہاں خاطر میں لانے والا تھا۔ وہ فتح پور سے روانہ ہوا۔ اس نے نہ راستے کی مشکلات دیکھیں اور نہ ہی موسم کی سختیاں۔ سبی کی شدید گرمی میں وہ یہ کہتا ہوا سدّو کے گھر کی جانب چل پڑا:

"پیگھام اتکگنت دُر چیڑءِ
ھنبوئیں سلام مئے دوستءِ
بیا پہ یک شپے شبگیریءَ
سیبی دیرنت وروچ گرمنت
بورءَ مئے لوار سوچیت
جِند مئے بیدھاں تُنّی بیت"

ترجمہ:

اُس موتی بکھیرنے والی محبوبہ کا پیغام آیا
اُس دور افتادہ محبوبہ کا
خوشبوؤں میں بسا ہوا سلام پہنچا
کہ ایک رات کے لیے
شبگیر مارکر ضرور آ جاؤ
سبی دور ہے
اور دن بھی بہت گرم ہے
میرے گھوڑے کو لُو لگ جائے گی
اور خود مجھے بھی ویرانوں میں پیاس لگے گی

(نصیر (1979):236)

اُس نے اپنے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں جماتے ہوئے کہا کہ:

"سردار سورِتہ سگّانی
چاکر! تومنی گوانکءَ بیا

بور ءَ آسنیں پاداں دیے
مُرگھی بانزراں زرّیناں
ماراداں ہموداں سر کن"

ترجمہ:
میں نے اپنے اولوالعزم سردار کو یاد کیا
اے چاکر! میری مدد کو آجا
میرے گھوڑے کو لوہے کے پاؤں
اور پرندوں کی چاندی جیسے سفید پر دیدے
مجھے وہاں تک پہنچادے۔

(نصیر (1979):236-37)

وہ اسی رات سَدّو کے گھر پہنچا اور رات بھر اس کے ساتھ رہا۔ علی الصبح جب اس کی محبوبہ نے اسے جگا کر جانے کا کہا کہ: اب اٹھو صبح ہوگئی ہے اب یہاں سے چلنے کی کرو، تو بیبرگ نے جانے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ محبوباؤں کو چھوڑ کر بھاگنے والا جوان میں نہیں ہوں، اس نے کچھ یادگار اشعار کہے جو بلوچی ادب میں کسی بڑے سرمایے سے کم نہیں۔ اس نے کہا:

"در کپیت صُحب ءِ کافریں استار
کئیت چو تیر ڈورمی جلشکان ءَ
آہستگ ءَ چِکیت دست ءِ بائینک ءَ
دولاں گوں ہوشیشیں کلائییان
دست ءَ چو گُنگوئی بُلوڑینیت
پادا، اُوورنا! کہ آستہ بامی
ماؤ تؤ ہر دو مرد مُوں نامی"

ترجمہ:
صبح کا ظالم ستارہ طلوع ہوا
اور کمان سے پھینکے ہوئے تیر کی طرح

چمکتا ہوا اوپر کو اُٹھنے لگا

تب اس (محبوبہ) نے آہستہ سے

اپنا چوڑیوں سے بھرا

اور ہاتھی دانت کی طرح سفید ہاتھ

میرے سر کے نیچے سے کھینچ لیا

اور گونگوں کی طرح

ہاتھوں سے اشارہ کرتی ہوئی کہنے لگی

اے نوجوان! اُٹھ

کہ سپیدۂ سحر نمودار ہوا ہے

ہم دونوں نیک نام لوگ ہیں

(ایسا نہ ہو کہ بدنام ہو جائیں)

(نصیر (1979): 34-233)

ہیرگ اب اپنے منصوبے پر عمل کرنے لگا اور اس نے جانے سے صاف صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ اچھا ہے کہ لوگ ہمیں دیکھ لیں اور بدنام کر دیں تا کہ تمہارا شوہر تمہیں طلاق دے اور میں تم سے شادی کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنا لوں۔ وہ اگر تمہیں طلاق نہیں دیتا اور مار ڈالتا ہے تو پہلے اسے مجھ کو مار ڈالنا پڑے گا۔ وہ اپنی محبوبہ سے کہتا ہے کہ میں آپ کے والد کی طرح نہیں کہ جو اپنی محبوبہ کو چھوڑ کر بھاگتا تھا میں تو جس حسینہ کو اپناتا ہوں پھر اسے چھوڑ کر بھاگتا نہیں۔ ہیرگ سَدو سے کچھ یوں مخاطب ہوتا ہے:

"اے تئی عارفیں پِت ءِ ہیلؑ انت

دوست ئےَ کلیت و گُڈ کنت لوگ ءَ

من نہ کنزاں چہ موزگی پینزءَ

چوروسی پد کنزگ من ءَ عیب انت"

ترجمہ:

(تب میں نے ہنس کر اپنی محبوبہ سے کہا)

یہ تو تیرے بزرگوار باپ کی عادت ہے
جو محبوبہ کو چھوڑ کر
گھر سے نکل بھاگتا ہے
ہم تو اپنے پاؤں کی ایڑی بھی
پیچھے نہیں ہٹائیں گے
چھوکروں کی طرح (محبوبہ سے) پیچھے ہٹنا
ہمارے لیے عیب کی بات ہے

(نصیر (1979):35-234)

اس کے بعد بیبرگ سدّو کے گھر کے باہر آ کر اپنا تیر و کمان ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا اور سدّو کے شوہر کو مقابلے کے لیے پیغام بھیجا۔ اسے سدّو کے گھر سے نکلتے ہوئے کچھ لاشاری نوجوانوں نے بھی دیکھ لیا تھا اور انہوں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا مگر ان لاشاری نوجوانوں میں سے کوئی بھی اس کے مقابلے پر نہیں آ رہا تھا بلکہ صرف دور ہی سے چیخ و پکار شروع کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر بیبرگ سدّو کے گھر کے سامنے اپنے ہتھیار سنبھال کر بیٹھ گیا۔ سدّو کے شوہر کو جب اس سارے واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ غصہ میں بھپر گیا مگر وہ ایک نحیف اور کمزور شخص تھا وہ پہلے تو تلوار اٹھا کر بیبرگ کے مقابلے پر نکلا مگر خود کو کمزور پا کر صرف گالی گلوچ تک ہی محدود رہا۔ مگر یہ معاملہ بڑھتا ہی گیا اور لاشاریوں نے اسے عزت کا معاملہ قرار دے کر اس کے تصفیہ یا بدلہ کا مطالبہ کیا۔

اس کے بعد جب میر چاکر رند کو اس واقعہ کی اطلاع ملی اور یہ خبر بھی ملی کہ بیبرگ اکیلے لاشاریوں کے علاقے میں محصور ہو چکا ہے اور اس کی جان کو خطرہ ہے تو وہ ایک دستہ مسلح لوگوں کا لے کر فوراً وہاں پہنچا جہاں بیبرگ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ معاملہ ایک خصوصی جرگہ کے ذریعے ایسے حل کیا گیا کہ سدّو کے شوہر نے میار یعنی ہرجانہ نقدی اور بھیڑ بکریوں کی صورت میں وصول کیا اور سدّو کو طلاق دے دی۔ جب سدّو کی عدت پوری ہوئی تو بیبرگ نے اس کے لیے باقاعدہ رشتہ بھیجا جسے قبول کر لیا گیا اور سدّو کے گھر والوں نے بیبرگ اور اس کی شادی دھوم دھام سے کر دی اور باقیماندہ زندگی انہوں نے ہنسی خوشی ایک ساتھ بسر کی۔

فیروز و شیران:

بلوچستان کا وہ حصہ جو اس وقت ایران میں شامل ہے، بلوچی لوک داستانوں کے حوالے سے کافی شہرت رکھتا ہے۔ بلوچستان کے اس حصے میں للّلہ و گراں ناز، عزت و مہرک، عزیز و بہرام وغیرہ کی داستانیں کافی مشہور و معروف اور زبانِ زدِ عام ہیں جن کے کردار نہ صرف رومانوی حوالے سے بلوچ تاریخ کا حصہ رہے ہیں بلکہ ان میں سے بعض عسکری جبکہ بعض ادبی حوالے سے بلوچستان کی تاریخ میں بلند مقام و مرتبہ کے حامل ہیں۔ اس خطہ کی ایسی ہی مشہور و معروف داستانوں میں ایک داستانِ محبت شیران و فیروز کی بھی ہے جن کی سچی محبت آج بھی اس خطے کے لوگوں کی زبان اور دلوں میں زندہ ہے اور اب بھی محفلوں اور مجالس میں اس داستان کے دونوں کردار زیرِ بحث آتے ہیں۔ اس کہانی کا آغاز ایران کے مشہور و معروف بلوچ قصبہ سرباز سے ہوتا ہے۔

ایرانی بلوچستان میں واقع اس بلوچ قصبہ میں ایک حسین و جمیل، خوبصورت و رعنا، دراز قامت و سیاہ گیسو، جھیل جیسی گہری آنکھیں اور گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح باریک و نازک ہونٹ حتیٰ کہ قدرت کے تمام نسوانی تحائف سے مزین ایک لڑکی اقامت پذیر تھی کہ جس کی خوبصورتی اور حسن پر اس کے قصبہ کے لوگ بھی فخر و ناز کرتے تھے اور اس کی شان میں دور و نزدیک کے شعراً قصیدہ گوئی اور ثناء خوانی کرتے تھے۔ اس کا نام شیران تھا۔ شیران اپنی سہیلیوں کے ساتھ سرباز کے خوبصورت علاقے کی وادیوں میں گھومتی، پہاڑوں کی طرف نکل جاتی اور ندی کنارے جا کر تتلیوں کے ساتھ کھیلتی اور سہیلیوں کے ساتھ مل کر وہاں سے پھول چُنتی اور اپنے بالوں میں لگا کر ان کو سجاتی اور اپنی خوبصورتی میں اور اضافہ کرتی۔ وہ ایک بے چین و بیقرار سی لڑکی تھی کہ جو ہر وقت بغیر آرام کیے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اِدھر اُدھر پھدکتی رہتی تھی ایسے جیسے اس کی بے چین روح کو کسی کا انتظار ہو اور اس کی بے چینی کی شاید یہی وجہ تھی، وگرنہ وہ خود بھی اپنی اس کیفیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ حسبِ معموں وہ ایک دن اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھومنے پھرنے نکلی تھی اور دور وادیوں اور پہاڑی دامنوں میں جنگلی پھول چنتی جا رہی تھی اور تتلیوں کا پیچھا بھی کرتی جا رہی تھی۔ اسے پتہ نہ چلا اور نہ ہی سہیلیوں کا

اس کی جانب دھیان ہوا کہ وہ ان سے علیحدہ ہو کر دور ہوتی گئی اور اُن سے بچھڑ گئی۔ چلتے چلتے وہ ایک نامعلوم جگہ پر پہنچی جہاں وہ اس سے قبل نہیں آئی تھی کہ اس دوران اچانک اسے بانسری بجنے کی سُریلی آواز سنائی دی۔ یہ آواز سُن کر اس کے پاؤں زمین کے ساتھ چپک گئے اور اس پر ایک سحر سا طاری ہوا۔ وہ اس آواز کو سُن کر مدہوش سی ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد جب اس کی حالت سنبھلی تو وہ اس جانب گئی جہاں سے یہ آواز آ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان بانسری بجا رہا ہے اور اس میں اس حد تک محو و مگن ہے کہ اس کی جانب اُس کی کوئی توجہ اور دھیان نہ ہوا اور وہ بدستور آنکھیں بند کیے اپنی بانسری بجانے میں مگن رہا۔ شیران نے دیکھا کہ وہ ایک چرواہا ہے جو آنکھیں بند کیے انتہائی سریلی دھن کے ساتھ بانسری بجا رہا تھا اور اس کے بڑے بڑے بال ہوا میں لہرا رہے تھے جبکہ اس کی بھیڑ بکریاں اس کے قریب ہی چر رہے تھے۔ شیران کافی دیر تک اس کے پیچھے کھڑی ہو کر اس کی بانسری کی سریلی دھن سنتی رہی اور اس کی دل کو موہ لینے والی سریلی آواز میں کھوئی رہی۔ بالآخر اس نے اس چرواہے کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی خاطر اپنا پاؤں زور سے زمین پر مارا تو وہ چرواہا ایک دم آنکھیں کھول کر اور گھبرا کر کھڑا ہوا اور جب اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور اسے اس لمحے ایسا لگ رہا تھا جیسا کہ وہ ایک خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے بار بار اپنی آنکھوں کو مل کر کھولا تب اسے یقین آیا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے وہ کوئی خواب نہیں بلکہ مکمل حقیقت ہے۔ تب اس نے دیکھا کہ ایک ایسی پری جمال و حور چہرہ لڑکی اس کے سامنے کھڑی ہے کہ جس کے حسن کی تابانی اور روشنی اُس (چرواہے) کے چہرہ پر بھی پڑ کر اسے منور کر رہی ہے۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور پھر دونوں ہی دل ہار گئے اور عشق کے سمندر میں غوطے کھانے لگے۔ وہ دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے اور بالکل ہی ساکت سے ہو گئے۔ دونوں کی دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں اور بالآخر انہیں اپنی موجودگی کا احساس ہوا اور وہ دونوں اس کیفیت سے نکل کر سنبھل گئے۔ پہل شیران نے کی اور پوچھا کہ تم کون ہو اور تمہارا کیا نام ہے؟ تم بانسری بہت اچھی بجاتے ہو۔ جھجکتے ہوئے اُس چرواہے نے کہا کہ جی میرا نام فیروز ہے اور میں ایک چرواہا ہوں، بانسری بجانا میرا مشغلہ ہے اور یہی ان ویرانوں اور پہاڑوں میں میرا دوست اور ساتھی ہے، اسی کے ساتھ میں سارا دن

گزارتا ہوں جبکہ راتوں کو بھی یہی تنہائیوں میں میرا ساتھ دیتی ہے۔ پھر فیروز نے اُس نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اوران ویرانوں میں کیا کررہی ہو؟ جواب میں شیران نے اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتادیا اور یہ بھی کہ وہ اپنے دوستوں سے ذرا آگے نکل کراس طرف اُس کی بانسری کی سریلی آواز سُن کر نکل آئی۔ پھر دونوں کہیر کے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔شیران نے اس سے بانسری بجانے کی خواہش کی توفیروز نے فوراً بانسری پر ایک خوبصورت اور رومانوی سُر چھیڑ دی جس نے شیران کے دل کی تاروں میں بھی اسی طرح جُنبُش پیدا کردی اوروہ فیروز کے عشق میں ڈوب گئی۔اسے اپنا اور اپنی سہیلیوں تک کا احساس نہ رہا۔اس کے دل سے صرف یہی آواز آرہی تھی کہ شیران یہی وہ شخص تھا جس کہ تمہیں تلاش تھی اورجس کے لیے تمہارا دل اور سارا وجود ہمیشہ بے چین و بے قرار رہتے تھے، یقیناً تمہاری روح کواسی کی تلاش تھی، فیروز کی، اس بانسری بجانے والے چرواہے فیروز کی ہی تمہیں تلاش تھی۔

وہ دیر تک فیروز کی بانسری کی خوبصورت دھنیں سنتی رہی اوران میں محو رہی، اسے وقت اور دوستوں کا کوئی احساس نہ رہا تھا کہ اتنے میں دور سے اس کے دوستوں کی آواز آئی جو زورزور سے چلا رہی تھیں اوراس کا نام لے لے کراسے پکار رہی تھیں۔ وہ اپنی سہیلیوں کی آوازیں سُن کرایک دم چونک پڑی اوراٹھ کھڑی ہوئی۔ فیروز بھی اس کے ساتھ ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا توشیران نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا کہ اس سے پہلے کہ میری سہیلیاں مجھے یہاں تمہارے ساتھ دیکھ لیں، میں چلتی ہوں مگراس وعدے کے ساتھ کہ میں تم سے روز اسی جگہ ملا کروں گی اورتمہاری بانسری کی میٹھی میٹھی دھنیں سنوں گی۔اللہ آپ کا حامی وناصر ہو۔

شیران وہاں سے رخصت ہوکراپنے دوستوں کی طرف آئی توانہوں نے پوچھا کہ کہاں چلی گئی تھی ہم تو ڈر گئے تھے آپ کے لیے اور کتنی دیر سے آپ کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔شیران نے کہا کہ وہ اس طرف نکل آئی تھی یہاں کچھ اچھے پھول ملتے ہیں۔ اچھا چلو چلتے ہیں واپس گاؤں کی طرف، بہت دیر ہوگئی ہے۔ یہ کہہ کروہ سب اپنے قصبہ کی جانب بھاگتی اور خوب چہلیں کرتی ہوئی روانہ ہوگئیں۔

شیران تو گھر آگئی تھی مگر وہ اپنا سب کچھ، اپنا دل، اپنی سوچیں، اپنا وجود سب کچھ، اس پہاڑی درے میں چھوڑ آئی تھی جہاں فیروز بیٹھا اپنی بانسری پر خوبصورت دھنیں بکھیر رہا

تھا۔ فیروز کی بانسری کی آواز اب بھی اس کے دل و دماغ میں گونج رہی تھیں اور اسے میٹھی میٹھی تھپکیاں اور لوریاں دے رہی تھیں۔ وہ آج حد سے زیادہ خوش تھی، بے حد خوش، اتنی خوش کہ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ آج اسے کوئی انوکھی شئے ملی ہے یا کوئی ایسی خواہش پوری ہوئی ہے جو بہت بڑی اور دلی خواہش ہے، وہ بہت خوش تھی اور خوب گنگنا کر اپنے کام کر رہی ہے۔ اسے رات دیر تک نیند نہیں آئی اور جب وہ سو گئی تو اس نے سپنوں میں بھی اس منظر کو دیکھا کہ فیروز بیٹھا بانسری بجا رہا ہے اور وہ اس کے قریب کہیر کے ایک پودے کے نیچے بیٹھی ہوئی ہے اور میٹھی میٹھی اور چاہت بھری نظروں کے ساتھ اُس کی جانب دیکھ رہی ہے اور بانسری پر اس کی بجائی ہوئی دھن سُن رہی ہے۔

اب یہ شیران کا معمول بن چکا تھا کہ وہ ہر دو تین دن بعد وہاں پہنچ جاتی جہاں فیروز آ کر اپنے ریوڑ کو چراتا تھا اور اپنی بانسری پر خوبصورت دھنیں بکھیرتا تھا۔ یہ ملاقاتیں محبت اور محبت عشق میں تبدیل ہوتی گئی۔ اب نوبت یہاں تک پہنچی کہ شیران کے ساتھ ساتھ فیروز کی بھی رات کی نیندیں اور دن کا آرام بے معنی سی شئے بن کر رہ گئے تھے۔ فیروز بھی اب اس ماہ جبین و حور چہرہ پری جمال لڑکی کے لیے اپنے دل میں کھسک اور دھڑکنیں محسوس کرنے لگا تھا۔ اب جس دن شیران نہیں آتی تھی تو وہ بانسری ہی نہیں بجاتا تھا اور بانسری صرف شیران کے آنے اور اس کی فرمائش پر ہی بجانے لگا تھا۔ اسے جس طرح شیران سے محبت ہو گئی تھی اسی طرح اسے اپنی بانسری سے بھی پیار ہو گیا تھا کیونکہ اسی بانسری ہی کی وجہ سے اسے شیران جیسی دوست مل گئی تھی جو اس غریب چرواہے سے پیار کرنے لگی تھی، وہ شیران جو اس غریب و بے کس گڈریے کو اپنا سمجھنے لگی تھی اور اسے اپنی محبت سے امارت کے منصب پر فائز کر رہی تھی۔ لہٰذا جب شیران آتی تو وہ پہلے سے بھی زیادہ منہمک ہو کر اور خوبصورت ترین دھنیں اس کے لیے بجاتا اور وہ میٹھی میٹھی نظروں سے فیروز کی طرف دیکھتی اور اس کی بانسری کی دھنوں میں کھو جاتی اور اسے وقت کا کوئی احساس تک نہ رہتا۔ اب وہ اکثر اکیلی اس طرف نکل آتی اور دیر تک وہ اور فیروز بیٹھ کر آپس میں باتیں کرتے اور فیروز بانسری بجاتا۔ اس لمحے ان کے سوا ان کی دنیا میں اور کوئی نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن شیران فیروز سے ملنے گئی تو فیروز نے اس سے کہا کہ شیران میں تمہارے

بغیر جی نہیں سکتا، ہر وقت تم کو سوچتا اور تم سے باتیں کرتا رہتا ہوں، نہ کھانا اچھا لگنے لگا ہے اور نہ ہی نیند آتی ہے، رات ہوتے ہی صبح کا انتظار کرتا رہتا ہوں کہ تم سے ملنے کی امید ہوتی ہے۔ میں کیا کروں؟ مجھے کوئی مشورہ دو۔ شیران نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور اس کا سخت ور کھردرا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے اور اس پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے انتہائی محبت اور نرم لہجے میں کہا: آپ میرے والد سے بات کیوں نہیں کرتے؟ آپ اُن سے بات کر کے میرا رشتہ طلب کریں۔ مگر فیروز نے کہا کہ میں بہت غریب ہوں اور پیشے کے لحاظ سے ایک چرواہا ہوں اور دوسروں کا ریوڑ چراتا ہوں۔ آپ قصبہ کے ایک بڑے رئیس کی بیٹی ہو، بھلا آپ کا والد آپ کا رشتہ میرے ساتھ کہاں کرے گا۔ شیران بھی اس کی باتیں سُن کر اداس ہوگئی اور اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ دل چھوٹا مت کرو، اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔ دونوں کافی دیر تک وہیں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے اور فیروز بانسری بجا بجا کر شیران کو خوش کرتی رہی۔ جب شیران اُس سے رخصت ہو کر اپنے گھر آئی تو اس کی ہمجولیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا اور مبارک باد دینے لگیں۔ وہ بڑی حیران ہوئی کہ ان سہیلیوں کو کیا ہو گیا ہے جو مجھے مبارک باد دے رہی ہیں؟ وہ تذبذب کا شکار ہوگئی تھی اور ان کے رویے سے کافی پریشان ہو رہی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اسے مبارک باد کس بات کی دی جا رہی ہے؟ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور چہرے پر عجیب وغریب تغیرات آنے لگے۔ اس نے اپنی سب سے زیادہ عزیز اور راز دار سہیلی سے جب اس مبارک باد کی وجہ پوچھی تو جو جواب اسے ملا، وہ سُن کر چکرا گئی اور اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ سہیلی نے اس کو بتایا کہ اس کے والد نے آج ہی اس کی نسبت اپنے ایک عزیز اور امیر خاندان سے تعلق رکھنے والے قمبر نامی نوجوان سے طے کر دی ہے اور عنقریب ان کی منگنی اور پھر فوراً شادی ہونے والی ہے۔ سہیلی کی یہ بات سُن کر وہ بظاہر تو شرما گئی اور اپنے کمرے کی طرف بھاگی، مگر یہ مسکراہٹ بناوٹی تھی ورنہ اس کا دل اندر سے کھرچی کھرچی ہو چکا تھا اور اس کے ارمانوں کا خون ہو رہا تھا۔ اس کے والد نے یا گھر کے کسی بھی فرد نے اس سے ایک بار بھی پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور اس کا رشتہ اپنے آپ اور اپنی مرضی سے طے کیا۔ مگر جس سماج اور جس ثقافتی گروہ سے اس کا تعلق تھا وہاں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ والد کے فیصلوں سے سرتابی کی جائے، لہٰذا اس نے بھی

اپنے جذبات کا گلا گھونٹتے ہوئے ایک فرمانبردار بیٹی کی طرح والد کے فیصلے کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا اور اسے مِن وعَن قبول کیا۔ وہ اندر سے رو رہی تھی، اس کا دل رو رہا تھا، اس کا سارا وجود کانپ رہا تھا اور گھر والے اس کی اصل کیفیت سے نابلد اس کی ظاہری حالت کو اس کی مشرقیت سمجھ کر خوش ہو رہے تھے۔

اگلے دن شیران کسی نہ کسی طرح گھر سے نکلی اور سیدھی وہاں پہنچی جہاں فیروز اپنے ریوڑ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ فیروز اسے دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ وہ گذشتہ دن بھی آئی تھی اور ہر ملاقات میں کم از کم ایک دو دن کا وقفہ ضرور ہوتا تھا مگر شیران کی اس اچانک آمد نے اسے حیران بھی کر دیا اور پریشان بھی۔ وہ چونک پڑا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ شیران کی طرف بڑھا اور اس کے خوبصورت اور مرمریں ہاتھوں کو اپنے کھردرے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اسے کہیر کے درخت کے نیچے اپنے پہلو میں بٹھاتے ہوئے بڑی بے چینی سے پوچھا کہ شیران کیا بات ہے؟ تم بہت پریشان اور اداس لگ رہی ہو؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ کسی نے کچھ کہا تو نہیں آپ کو؟ اس نے ایک ساتھ کئی سوالات پوچھے، جواب میں شیران سسک سسک کر رونے لگی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر فیروز کٹ سا گیا اور تڑپ کر اس نے شیران کو اپنے گلے لگاتے ہوئے کہا کہ خدا کے لیے میرا امتحان نہ لو اور مجھے بتاؤ کہ کیا ہو گیا ہے؟ شیران روتی رہی اور فیروز کو اس نے اسی حالت میں سب کچھ بتا دیا۔ فیروز نے جب یہ سُنا تو اس کو جیسے کسی نے گرم سلاخوں سے داغ دیا ہو۔ اس نے چیخ ماری اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔ اس نے روتے ہوئے اپنے بانسری کو توڑ دیا اور کہا کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ میں بانسری بجاتا، نہ آپ سے ملاقات ہوتی، نہ محبت کا درد ملتا، نہ عشق کے تپتے صحرا میں بھٹکنا پڑتا۔ اب میں یہاں نہیں رہوں گا اور یہ علاقہ چھوڑ کر اپنے غموں کا بوجھ اپنے ہی اوپر لاد کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔ اس کی حالت دیکھ کر شیران نے خود کو سنبھالا اور اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بڑے پیار سے اس نے کہا کہ میں کہیں نہیں جا رہی، میں روز آپ کی بانسری سننے آؤں گی، آپ میرے لیے بانسری بجاؤ گے۔ دونوں دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے رہے مگر آج اُن کا موضوع غموں سے بھرے ہوئے مباحث پر مشتمل تھا۔ وہ جدائی اور دوری کے احساس سے لرز رہے تھے اور دونوں کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور بانسری کی

آواز آج خاموش تھی کہ وہ ٹوٹی ہوئی ان کے سامنے پتھروں پر پڑی تھی۔

کچھ دنوں بعد شیران کی شادی ان کے اپنے قبیلہ کے خوبرو اور امیر وکبیر نوجوان قمبر کے ساتھ ہوئی۔ کچھ ہی عرصہ میں شیران اور قمبر ایک دوسرے کو سمجھ گئے اور بطور میاں بیوی ایک دوسرے سے انہیں بے حد محبت ہوگئی۔ شیران بھی قمبر کی محبت اور پیار کو دیکھ کر اس کو پسند کرنے لگی اور اس کے ساتھ مستحکم زندگی بسر کرنے لگی۔ لیکن کبھی کبھی شیران کو جب فیروز کی یاد آتی تو وہ بہت اداس ہو جاتی اور اسے فیروز کا خیال ستانے لگتا۔ وہ سوچتی کہ نجانے وہ بیچارہ کیسا ہوگا؟ وہ ابھی تک وہیں جاتا ہے یا وہ کہیں اور اپنا ریوڑ چرانے جاتا ہے؟ کیا اب بھی وہ بانسری بجاتا ہے جبکہ اس نے کہا تھا کہ وہ اب کبھی بھی بانسری نہیں بجائے گا۔ وہ فیروز کے بارے میں سوچتے وقت وہ بہت پریشان اور اداس ہو جاتی تھی۔ مگر کمال کی لڑکی تھی کہ کبھی بھی اپنے چہرے سے اس نے اپنی دلی کیفیت کسی پر ظاہر نہ ہونے دی اور اپنا درد دوسروں سے ہمیشہ چھپاتی رہی۔ اس کی زندگی قمبر کے ساتھ بہر حال خوش وخرم اور آسودگی وآرام کے ساتھ گزر رہی تھی۔

ایک دن قمبر کو کسی کام سے قصبہ سے باہر جانا پڑا۔ لہٰذا شیران نے سوچا کہ آج فیروز سے ملنے اور اسے حال احوال کرنے کا اچھا موقع ہے۔ لہٰذا وہ اس جگہ کی جانب روانہ ہوئی جہاں اس کی اور فیروز کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ جب وہ وہاں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ فیروز ایک پتھر پر گم سم بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی بھیڑ بکریاں آس پاس چر رہی تھیں اور وہ اپنا سر دونوں گھٹنوں کے درمیان دے کر گہری سوچوں میں کھویا ہوا تھا۔ اسے شیران کی آمد کی کوئی خبر نہ ہوئی۔ وہ اُس وقت چونک پڑا جب شیران کی آواز سُنی۔ اس نے جب اپنا سر زانوں سے اوپر اٹھایا تو اس نے دیکھا کہ اُس کی پری جمال اور ماہِ تاباں، حسین وجمیل محبوبہ اپنی پوری آب وتاب اور رعنائیوں کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ گھبرا کر اور بے یقینی کی سی کیفیت میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ شیران اس طرح، اس وقت اور اس مقام پر اچانک اس سے ملنے آئے گی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور گھبرا کر پوچھا، شیران تم۔۔۔۔ خیریت تو ہے؟ اس نے شیران کے آنے والے راستے پر ایک نظر ڈالی اور دوبارہ اپنی آنکھیں شیران کے خوبصورت وحسین چہرے پر مرکوز کر دیں۔ شیران نے اسے بٹھاتے اور خود اس کے

قریب بیٹھتے ہوئے کہا کہ آج میرا شوہر قصبہ سے باہر کسی کام سے گیا ہوا ہے اس لیے مجھے موقع ملا کہ میں آپ کو دیکھ لوں اور آپ کے خیریت دریافت کروں۔ اسی لیے میں آپ کے پاس آئی ہوں مگر یہ دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا کہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ اور آپ نے بانسری بجانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ آپ کی بانسری آپ کے پاس نہیں ہے اور آج ان پہاڑوں اور وادیوں میں اس کی سریلی آواز کی گونج سنائی نہیں دے رہی۔ دیکھو تو فضائیں بھی اداس اور پھیکی پھیکی سی ہیں۔ آپ کو میری قسم آپ میرے لیے بانسری بجائیں۔ مجھے جب بھی موقع ملے گا میں آپ سے ملنے آیا کروں گی۔ آپ اپنے ریوڑ اور بانسری کے ساتھ ادھر ہی آیا کرو میں یہیں آپ سے ملنے آجایا کروں گی۔ فیروز معصوم معصوم اور آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنی پیاری سے محبوبہ کی جانب دیکھنے لگا اور اس کے ساتھ وعدہ کیا کہ آئندہ وہ صرف اس کی خاطر بانسری بجائے گا۔ فیروز نے اسے یقین دلایا کہ وہ جب بھی ملنے آئے گی میں بانسری بجاؤں گا۔ کافی دیر بیٹھنے اور باتیں کرنے کے بعد شیران نے فیروز سے رخصت لی اور اپنے گھر آگئی۔ اتفاق سے اسے قمبر کے دوستوں یا عزیزوں میں سے کسی نے فیروز کے ساتھ باتیں اور ملاقات کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا لہٰذا اس نے جا کر یہ سارا واقعہ چپکے سے قمبر کے گوش گزار کردیا۔ قمبر کو پہلے تو یقین نہیں آیا کہ شیران اس کے ساتھ بے وفائی کرسکتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی اس کے ساتھ وفادار ہے اور اس سے بے حد محبت کرتی ہے۔ مگر اس کے دل میں شک کا بیج بو دیا گیا تھا، اس نے سوچا کہ ممکن ہے خبر دینے والے کی اطلاع درست ہو، یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ میری اور شیران کی محبت سے حسد کرتا ہو اور یہی چاہتا ہو کہ میں غصے اور جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی انتہائی قدم اٹھاؤں۔ وہ پریشانی کے عالم میں سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے شیران کا امتحان لینے کا پختہ ارادہ کرلیا۔

کچھ دن گزرنے کے بعد ایک دن قمبر نے شیران سے کہا کہ وہ ایک ضروری کام سے باہر جارہا ہے۔ اسے ایک دو دن آنے میں لگ جائیں گے۔ شیران نے اسے رخصت کیا اور خود تیار ہوکر فیروز سے ملنے چلی گئی۔ قمبر کہیں جانے کی بجائے اس جگہ پہنچا جہاں شیران اور فیروز ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ اس نے جان بوجھ کر یہاں آنے میں تھوڑی دیر لگادی تاکہ یہ یقین ہو کہ شیران اگر فیروز سے ملنے آتی ہے تو اسے اتنا ہی وقت آنے کے لیے درکار

ہوگا۔ لہٰذا اس نے کچھ دیر ادھر ادھر گھوم پھر کر اس گھاٹی کی راہ لی جہاں فیروز اپنی بھیڑ بکریوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔

دوسری طرف شیران نے جب دیکھا کہ اب قمبر قصبہ سے کافی دور نکل گیا ہوگا تو وہ فیروز سے ملنے کے لیے متعلقہ جگہ پہنچی۔ اس کو دیکھ کر فیروز اٹھ کھڑا ہوا اور پھر دونوں ایک ساتھ بیٹھ گئے اور شیران کے کہنے پر فیروز نے بانسری پر ایک خوبصورت سی دھن چھیڑ دی۔ ابھی انہیں بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک قمبر ادھر آدھمکا۔ اسے دیکھ کر شیران کے پیروں تلے زمین نکل گئی، آخر وہ قمبر کی بیوی تھی اور ایک غیر مرد کے ساتھ ایک ویرانے میں بیٹھی ہوئی تھی، لہٰذا گھبراہٹ تو فطری سی بات تھی۔ فیروز بھی قمبر کی اس اچانک آمد سے گھبرا گیا اور اسے منت کرنے کے سے انداز میں کہنے لگا کہ شیران بالکل بے قصور ہے اور نہ ہی اُس نے کوئی گناہ کیا ہے، بلکہ وہ تو صرف میری بانسری سننے کے لیے آئی ہے، ہمارا اور کوئی ایسا تعلق نہیں ہے کہ جس پر آپ کا سر خدانخواستہ جھک جائے۔ مگر قمبر کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا، اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ اس کی بیوی ایک غیر نوجوان مرد کے ساتھ ایک پہاڑی ویرانے میں بیٹھی ہے اور ان کے آس پاس اور کوئی نہیں ہے، لہٰذا آؤ دیکھا نہ تاؤ اس نے اپنی تلوار بے نیام کی اور ایک ہی وار میں فیروز کو مار ڈالا۔ شیران چیختی رہی کہ فیروز بے گناہ ہے اس کا کوئی قصور نہیں، وہ چلاتی رہی کہ قمبر خدا کے لیے کسی بے گناہ اور معصوم کے خون سے اپنے ہاتھ مت رنگو، مگر اُس لمحے قمبر پر دیوانگی اور درندگی چھائی ہوئی تھی لہٰذا اس نے شیران کی کوئی بات نہ سُنی اور فیروز کو قتل کر دیا۔ مگر اس کی غیرت اُس وقت مر گئی کہ اس نے شیران کو اس ڈر سے چھوڑ دیا اور اسے کچھ نہ کہا کیونکہ وہ ایک امیر باپ کی بیٹی تھی اور اس کا باپ ایک بااثر اور طاقتور شخص تھا وہ قمبر کی کھال کھینچ لیتا۔ قمبر نے اس ڈر سے بھی شیران کو کچھ نہیں کہا اور صرف بے گناہ اور غریب اور ایک سچے عاشق فیروز کو مار ڈالا اور اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

اس کے بعد قمبر شیران کو تو اپنے ساتھ لے گیا مگر اس کی محبت اور چاہت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔ وہ شیران کا جسم تو استعمال کرتا تھا اور اس کے جسم کا وارث تو تھا مگر وہ کبھی بھی شیران کی روح اور اس کے دل پر حاکمیت نہ کر سکا اور نہ پھر اس کی محبت جیت سکا۔ شیران مرتے دم تک فیروز سے پیار کرتی رہی اور اپنی روح میں اسے بسائے رکھا۔ یہ سچا پیار

کرنے والا انسان جسمانی طور پر تو نہ رہا مگر اس کی روح ہمیشہ شیران کے پاس ہوتی تھی اور شیران اس روح کو اپنے اندر حلول ہوتے ہوئے محسوس کرتی تھی۔ قمبر لاکھ کوشش کے باوجود بھی شیران سے پہلی والی چاہت، محبت، دلچسپی اور توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہا اور ان کی زندگی بھی تلخیوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔

بیبرگ و ملی:

میر بیورغ رند بلوچستان کی تاریخ میں دل پھینک عاشق کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اعلیٰ پائے کا امن پسند رومانوی شاعر، زبردست جنگجو، ماہر شمشیر زن، لاثانی تیرانداز، عظیم شہسوار، معاملہ فہم و عقلمند، خوش اخلاق وخوش گفتار، خوبصورت و حسین اور مردانہ وجاہت کا ایک منفرد نمونہ تھا، رند و لاشار عہد میں اس جیسا کوئی دوسرا پیدا نہ ہوا۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس میں ایک ایسی عادت بھی تھی کہ جسے ممکن ہے بعض لوگ غلط سمجھیں، جبکہ کچھ لوگ اسے بھی اس کی ایک بہت بڑی خوبی خیال کرتے ہیں۔ بلاشبہ وہ بہت بڑا دل پھینک تھا اور خوبصورت عورتوں کو دیکھ کر وہ دل ہار جاتا تھا اور جب تک وہ ان سے تعلق نہ بنا تا تب تک اس کو چین نہیں ملتا۔ اس کے معاشقوں کی بہت سی داستانیں بیان ہوئی ہیں مگر یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ سب درست ہیں یا بعد کے شعرأ نے خود سے اس کے ساتھ یہ کہانیاں منسوب کی ہیں، البتہ اس کی اپنی شاعری سے جن کہانیوں کی وضاحت ہوتی ہے، ان کے مطالعہ سے ہی اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ کتنے بڑے دل پھینک تھے۔ میر گل خان نصیر بھی بیورغ رند کی اس بانکپن کا تذکرہ کرتا ہے اور اس حوالے سے ان کے معاشقوں کی کافی تفصیلات بیان کرتا ہے۔ ایک جگہ ان کی اسی عاشقانہ مزاج کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ:

> ''عاشقانہ بانکپن میں بی بکر رند سرِ فہرست ہے۔ اُن کی شاعری ایک بانکے، سجیلے امیر زادے کی شاعری ہے جو اپنے گھوڑے پر سوار، تلوار اور ڈھال لٹکائے، افغانستان اور ایران کے علاقوں میں گھومتا اور عشق لڑاتا ہے۔''
>
> (نصیر (1979):229)

یقیناً میر بیورغ رند کو عاشقوں کی اس فہرست میں شامل نہیں کیا جاسکتا جس میں حانی

وشہہ مرید، سموومست توکلی، ہیر اور رانجھا، سسی اور پنوں وغیرہ شامل ہیں مگر ان کے جتنے بھی معاشقے ہیں (جو انہوں نے خود بیان کی ہیں) اُن سب میں اس کی وفا، محبت اور اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے یعنی اختتام تک اس کی ثابت قدمی نظر آتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کسی کی تلوار کا شکار نہ بنا اور اپنے سارے اہداف اپنی مستقل مزاجی اور اولوالعزمی سے حاصل کیے اور پھر اپنے تعلقات کو ساری عمر خوش اسلوبی کے ساتھ برقرار رکھا جبکہ بعض عورتوں سے معاشقوں کے بعد اس نے ان سے شادی بھی کر لی اور انہیں ساری زندگی اپنے پاس رکھا جیسا کہ گراں ناز، سَدّو وغیرہ۔

رند و لاشار عہد میں ان قبائل کے بعض امیر زادے ہر جگہ عشق لڑاتے پھرتے تھے اور پھر شاعری میں اپنی پوری داستان عشق رقم کرتے پھرتے تھے۔ بہت کم شاعر ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اپنی داستان عشق کو اشعار کا روپ نہ دیا ہو ورنہ رند و لاشار عہد کا ہر شاعر عشق و محبت کے چکروں میں پھنسا ہوا لگتا ہے اور ہر ایک کی اپنی شاعری میں اس کی داستانِ عشق کے تذکرے ملتے ہیں۔ ان امیر زادوں کے بارے میں میر گل خان نصیر لکھتا ہے کہ:

> ''بلوچی کلاسیکی شاعری، اگر سچ پوچھا جائے تو عاشقانہ بانکپن کی شاعری ہے۔ بلوچی کے بہت کم شاعر ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اپنی داستانِ عشق رقم نہیں کی ہے۔ قدیم و متوسط دور کے شعرا عموماً ایسے البیلے اور بانکے نوجوان گزرے ہیں جیسے بی بکر (بیبر گ) رند، ہیبتان رند (بی بکر یعنی بیبر گ کا بیٹا)، شاہداد رند (میر چاکر خان رند کا بیٹا)، ریحان رند، ریا اور حمل جیئند وغیرہ علی الاعلان عشق لڑاتے اور پھر بہ بانگِ دُہل اپنی داستان عشق سناتے رہتے تھے۔ وہ قبائلی لڑائیوں میں بھی مردانہ وار سر دھڑ کی بازی لگاتے اور میدانِ عشق میں بھی اپنی جانبازی کے جوہر دکھاتے تھے۔ ان کی ہمت، شجاعت اور بانکپن کی وجہ سے اُن کے کلام کو اب تک عوام و خواص میں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ گو کہ اس پیرایہ سخن کی پاداش میں اُن میں سے کئی شاعروں کو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑے لیکن یہ طرزِ بیان مقبول رہا۔'' (نصیر (1979):228)

میر بیورغ رند (بی بکر رند اور بیبرگ رند کے نام سے بھی تاریخ میں مرقوم ہوا ہے)
بھی ایسے ہی بانکے نوجوانوں میں سے ایک تھا کہ جس نے ایک نہیں بلکہ کئی معاشقے لڑائے اور ان کا تذکرہ اپنی شاعری میں بیانگِ دُہل کیا۔ میر بیورغ رند کے معاشقوں میں سے ایک ایسا ہی معاشقہ ایک عورت مَلی کے ساتھ بھی بہت مشہور ہوا جس کا تذکرہ ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ کچھ مصنفین اس عورت کا نام بانو بھی لکھتے ہیں۔ (بعض مصنفین کا خیال ہے کہ یہ ایک جت عورت تھی جو لاشاریوں میں رہتی تھی اور بڑی ہی مالدار تھی)

سیلانی اور دل پھینک بہادر بیورغ جو ہر وقت گھومتا پھرتا، شکار کرتا، شاعری کرتا اور گانے گاتا اور کوئی نہ کوئی موسیقی کا آلہ بجاتا رہتا تھا، ایک بار کسی قصبہ میں گھوم پھر رہا تھا یا کسی کام سے گیا ہوا تھا کہ اس نے قصبہ کے بازار میں ایک عورت کو دیکھا تو اس کی حسن و جمال پر فریفتہ ہوا اور اس کے بارے میں جاننے کا اشتیاق دل میں پیدا ہوا۔ کسی نے اسے بتایا کہ اس کا نام مَلی ہے اور اسے پیار سے بانو بھی کہتے ہیں اور وہ اتنی مغرور اور خودسر ہے کہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی، وہ بڑی مالدار اور دولت مند ہے، اس کے پاس لاتعداد اونٹ اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ ہیں جبکہ اس کی تجارت کا حجم و دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ اس تک پہنچنا اور اس سے تعلق قائم کرنا ناممکن ہے، البتہ اس میں ایک خوبی ضرور ہے کہ وہ خداترس ہے اور اس کے دل میں رحم جلدی آتا ہے اور وہ دوسروں کی فوری مدد کرتی ہے۔ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ قصبہ میں وہ اپنے محل میں کئی نوکروں اور کنیزوں کے ساتھ رہتی ہے۔

مَلی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد وہ اس ٹوہ میں لگا رہا کہ کسی نہ کسی طرح اس حور پیکر کو اپنی دامِ محبت میں گرفتار کرے اور وہ اس کے ساتھ دوستی کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس نے لاکھ جتن کیے، مَلی کے محل اور محلے کے سیکڑوں چکر لگائے، اس کے محل و ماڑی کے کئی طواف کیے، کئی بار زور زور سے کھانسا، گیت گنگنائے، اشعار کہے، مگر مجال ہے کہ جو مَلی اس کی جانب ذرا بھی متوجہ ہوئی ہو، یا بالکونی میں آئی ہو۔ اس نے تو شاید اس جانب نہ تو توجہ دی تھی اور نہ ہی اس کا خیال اس جانب گیا تھا کہ اس کے محلے میں اس کے حسن کی چاشنی پر فدا ایک شخص دیوانہ وار گشت کر رہا ہے۔ وہ تو اپنی دنیا میں مست و مگن تھی، اسے کس بات کی پرواہ تھی، مالدار تھی، دولت کی ریل پیل تھی، محل و ماڑی کی مالکن تھی، سیکڑوں نوکر چاکر،

لونڈی کنیزیں اس کی خدمت پر مامور تھے، اس کے پاس کس چیز کی کمی تھی کہ وہ میر بیورغ کی سرد آہوں یا آہ و بکا کی جانب متوجہ ہوتی یا اس کے دیوانہ وار گشت کا نظارہ کرتی۔ بہر حال میر بیورغ کا ہر حربہ ناکام رہا اور اس کی ہر کوشش بے سود۔

وہ سوچ میں پڑ گیا کہ آخر وہ ایسا کیا کرے کہ جس سے مُلی اس کی جانب متوجہ ہو اور دونوں کے درمیان دوستی قائم ہو سکے۔ وہ اتنا پریشان کبھی بھی اور کسی بھی موقع پر نہ ہوا تھا۔ عقلمند و فہیم تو وہ تھا ہی سوچتے سوچتے اسے ایک ترکیب سوجھی لہٰذا وہ ایک عقلمند و جہاندیدہ بڑھیا کو تلاش کرنے لگا جو بالآخر اس کی ملاقات ایک بوڑھی خاتون سے ہوئی۔ بیبرگ نے اسے کچھ رقم دی اور اس کے قریب بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ بڑھیا نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے استفہامیہ انداز میں گویا ہوئی: نوجوان کہیں دل ہار چکے ہو! لڑکی قابو میں نہیں آرہی! بیبرگ ایک دم چونک پڑا اور پوچھا کہ اے معزز بوڑھی خاتون! آپ نے کیسے جانا کہ میرے ساتھ اس طرح کا کوئی معاملہ ہے؟ جواب میں معمر خاتون ہنس پڑی اور بولی: میرے بچے! زندگی کی ستر سے زیادہ بہاریں دیکھ چکی ہوں، ہر طرح کے سرد و گرم سے گزری ہوں، تم جیسے نوجوانوں کے چہرے دیکھ کر ان کے دل کی حالت بتا سکتی ہوں۔ بولو کون ہے جس نے تمہیں اس طرح بے قرار و بے چین کیا ہے؟ بیبرگ نے دل ہی دل میں اس معمر خاتون کی ذکاوت اور تجربے پر حیران ہوتے ہوئے انتہائی احترام اور نرم و ملتجی لہجے میں بولا: اے معزز معمر خاتون! میں آپ کے تجربے کا دل سے قائل ہو گیا ہوں۔ وہ آپ کے قصبہ کی ہی ایک حسینہ ہے جس نے مجھے یوں گھائل کر دیا ہے۔ میں نے لاکھ جتن کیے، ہر طرح کوششیں کیں، ہر حربہ آزمایا، ہر طریقہ کار اختیار کیا اور ہر ممکن کوشش کی، مگر وہ نہ تو میری طرف دیکھتی ہے اور نہ ہی متوجہ ہوتی ہے۔ اس نے مجھے مکمل طور پر نظر انداز کیا ہے اور میں ہوں کہ اس کے بغیر ایک پل کا نہ چین نہ سکون نہ آرام نہ قرار۔ سب کھو چکا ہوں اور بس اس کا وہ موہنی سا چہرہ ہے کہ جو ہر وقت میری نظروں کے سامنے ہے۔ بیبرگ کا چہرہ اداس ہو گیا اور وہ خاموش ہو گیا۔ معمر خاتون نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا کہ لگتا ہے بانو (مُلی) کے تیرِ نظر کا نشانہ بنے ہوں اور اس کا چلایا ہوا تیر سیدھے آپ کے دل پر لگا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ بیبرگ نے ایک بار پھر حیران ہوتے ہوئے چونک کر پوچھا کہ اے خاتون تم

نے کیسے جانا کہ میں مَلی کی محبت میں گرفتار ہوا ہوں۔تو جواب میں وہ خاتون بولی کہ جس طرح تم جیسے ایک امیر، خاندانی اور خوبصورت نوجوان کو کسی نے اس بُری طرح نظرانداز کیا ہے تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مَلی کے سوائے اور کوئی نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ امیر زادی اور حسین لڑکی کسی کو خاطر میں نہیں لاتی اور حد سے زیادہ مغرور اور خودسر ہے۔میری مانو تو اس کا خیال دل سے نکال دو اور اپنے گھر جاؤ تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہاں تمہاری دال نہیں گلنے والی۔ جس حسینہ سے تم نے دل لگایا ہے وہ کسی مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی، اس کے پاس دنیا کی کسی چیز کی کمی نہیں ہے، وہ تم کو کس لیے دیکھے گی۔جاؤ اور اپنے گھر جا کر کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کرلو اور مَلی کا خیال ہی دل سے نکال دو۔بوڑھی خاتون کی اتنی لمبی اور طویل بات سُن کر بیبرگ نے ذرا توقف کیا اور پھر یوں گویا ہوا: کہ میرا نام بیورغ ہے اور خوبصورت اور جوان لڑکیاں مجھ سے ملنے کو بیتاب رہتی ہیں اور ہر وقت مجھ سے بغلگیر ہونے کو ترستی ہیں۔ میں نے مَلی کو دیکھا ہے اور اب جب تک اسے حاصل نہیں کرتا میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ میں اُن نوجوانوں میں سے نہیں کہ کسی سے پیار کروں اور پھر اسے حاصل کیے بناء خالی ہاتھ اپنے گھر کو لوٹ جاؤں۔اے معمر خاتون مجھے صرف یہ بتاؤ کہ میں ایک بار اسے کیسے مل سکتا ہوں اور کہاں مل سکتا ہوں؟ بیبرگ کی دیوانگی اور اصرار دیکھ کر اس خاتون نے کہا کہ تم بہت مستقل مزاج لگتے ہو اور مَلی سے تمہیں بہت پیار ہوگیا ہے۔لگتا ہے تم کچھ نہ کچھ کر بیٹھو گے۔ سُنو نوجوان اگر تم اس بات پر اصرار کرتے ہو اور مَلی کو دیکھنا چاہتے ہو تو صبح دن چڑھے عطار کی دکان پر جاؤ وہ وہاں آتی ہے۔آگے تمہاری قسمت اور قابلیت کہ تم اس کو اپنا چہرہ کیسے دکھاتے ہو کیونکہ وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی۔جاؤ اور اپنی قسمت آزماؤ۔

بیبرگ معمر خاتون سے رخصت ہوکر اگلے دن صبح سویرے قصبہ کے بازار میں پہنچا اور عطار کی دکان سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوکر مَلی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ وہ ماہ پری سُبک وخرام خرام چلتی ہوئی آرہی تھی اور اس کے پیچھے پیچھے اس کی ملازمہ بھی چلی آرہی تھی۔وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھی عطار کی دکان کے اندر چلی گئی جبکہ اس کی ملازمہ دکان کے باہر کھڑی ہوگئی۔بیبرگ دور سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، اس نے جب دیکھا کہ مَلی دکان کے اندر چلی گئی ہے تو وہ بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا دکان کے پاس آیا

اور اپنے گھوڑے کو ایک کھونٹے کے ساتھ باندھ کر اندر چلا گیا۔ مَلی نے عطار سے ایک عطر کی چھوٹی سی شیشی لی اور اسے چاندی کے دس سکے سونپ دیے۔ پھر اس نے وہ عطر اپنے سیاہ اور لمبے لمبے بالوں میں لگایا جس سے پوری دکان معطر ہو گئی۔ بیبرگ تو اس کی اس ادا پر جیسے فدا ہوا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مَلی عطر لے کر اپنے بالوں کو یوں دکان میں کھول کر لگائے گی۔ اُس نے جیسے بیبرگ کے دل میں تیر گھونپ دیا ہو۔ بیبرگ نے اپنی حالت پر فوراً قابو پایا اور عطار کو مخاطب کرتے ہوئے اسے سونے کے دس سکے تھماتے ہوئے اس سے ایک عطر کی بوتل طلب کی۔ عطار اتنی بڑی رقم دیکھ کر حیران ہوا اور خوش ہو کر ایک بہترین عطر کی بڑی شیشی اس کے ہاتھ میں دے دی۔ بیبرگ نے اس سے تھوڑی سی عطر لے کر اپنے تاؤ دار مونچھوں پر لگایا اور باقی شیشی مَلی کی ملازمہ کو دیدی، جو یہ شیشی لے کر بہت خوش ہوئی۔ بیبرگ مَلی کے ساتھ ہی دکان سے نکل پڑا اور اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے اس کے سامنے سے گزرنے لگا۔ مگر مجال ہے کہ دکان میں داخل ہونے سے گھوڑے کو لے کر چلے جانے تک اس نے بیبرگ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو۔ بیبرگ مَلی کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر سخت مایوس ہوا مگر اس کے ارادوں اور مَلی کو حاصل کرنے کے اس کے عزم میں مزید پختگی آ گئی۔ اس نے مَلی کے اس طرزِ عمل اور رویے پر عہد کیا کہ جب تک تجھے حاصل نہ کروں میں بھی تمہارا قصبہ چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔

وہ عطار کی دکان سے نکل کر ایک سرائے میں آیا اور ایک امیر زادے کا روپ اختیار کیا۔ گو کہ وہ امیر زادہ تھا اور رندوں کی حاکم خاندان سے تعلق رکھتا تھا مگر اس سرائے میں اس نے ایک اور ہی روپ اختیار کیا۔ اس نے کئی گویے بلائے اور انہیں با قاعدہ رقم دی اور سرائے میں ایک ہفت روزہ محفل موسیقی کا اہتمام کیا۔ سات روز تک قصبہ کی اس سرائے میں جشن ہوتا رہا اور دور دراز سے لوگ آ کر اس محفلِ موسیقی سے محظوظ ہوتے رہے۔ بیبرگ کو یقین تھا کہ مَلی اس محفل میں ضرور آئے گی، مگر سات دنوں تک جشن منانے کے باوجود ملی نہیں آئی اور بیبرگ کی مایوسیوں اور نا امیدیوں میں مزید اضافہ ہوا۔ اسے اس لڑکی کے غرور اور تکبر پر غصہ بھی آ رہا تھا اور اس کی اس ادا پر اسے پیار بھی آ رہا تھا جس کی وجہ سے اسے حاصل کرنے کی اس کی جستجو اور خواہش مزید بڑھتی گئی اور اس کا عزم مزید پختہ ہوتا گیا۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھا:

"نئیے دوست منیت کہ وش کنان زِردءَ
نئیے کہ کنت نا ہے من ہاترائی بھلاں
مارا، مس نیامءِ گمبُلان داشتہ
بُرزی نودان وبار گیں شینکان"

ترجمہ:

نہ تو محبوبہ مانتی ہے
کہ میرا دل خوش ہو جائے
اور نہ انکار کرتی ہے
کہ میں اس کا خیال چھوڑ دوں
بس، مجھے درمیانی فضاء میں
آسمان اور گُہر نُما پتلے بادلوں کے درمیان
لٹکا رکھا ہے۔

(نصیر(1979):33-232)

اس کا جب یہ حربہ بھی ناکام ہوا تو وہ سوچ میں پڑ گیا کہ آخر کونسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ جس سے یہ لڑکی اس سے دوستی کرنے اور بات کرنے پر رضامند ہو جائے۔ وہ سخت پریشان تھا، آج تک اسے اس طرح اپنی کسی بھی خواہش کو پورا کرنے میں ناکامی اور دقت پیش نہیں آئی تھی جس حد تک مَلی کے حصول کے لیے اسے پریشانی اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا رہا تھا۔ اس نے بھی عہد کیا تھا کہ جب تک وہ اس حسینہ تک رسائی حاصل نہیں کر لیتا چین سے نہیں بیٹھے گا۔ اس نے کوئی نئی ترکیب سوچنا شروع کیا، سوچتے سوچتے اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس کو اس بات کا علم تھا کہ مَلی بے حد مغرور لڑکی ہے مگر وہ غریبوں اور محتاجوں سے ہمدردی رکھتی ہے اور بیماروں کی مدد کرتی ہے، ان کی دارو دوا کا بھی بندوبست کرتی ہے۔ اس نے ایک گویے کو بُلایا کہ وہ جا کر مَلی کو کسی طرح سے یہ اطلاع دیدے کہ سرائے میں ایک شخص آیا ہے کہ جس کی بینائی نہیں ہے، وہ دوا مانگ رہا ہے آپ براہِ کرم اس کی دارو دوا کا بندوبست کریں۔ گویے کو خوب سمجھا بجھا کر اس نے ملی کی ماڑی یعنی محل کی جانب بھیجا اور خود اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ

کرسرائے کے ایک کمرے میں بیٹھ گیا۔ وہ ڈومب یعنی گویا مَلی کے گھر گیا اور اسے ایک نابینا مسافر کی سرائے میں آمد اور اس کی تکلیف سے آگاہ کیا۔ ہمدرد اور رحمدل مَلی نے فوراً آنکھوں کی دوائی نکالی اور اپنی ملازمہ کو دیتے ہوئے کہا کہ سرائے میں جا کر اس نابینا مسافر کی آنکھوں میں ڈال دو تاکہ اسے تکلیف سے نجات ملے۔ ملازمہ یہ دوا لے کر سرائے میں آگئی اور بیبرگ کے پاس پہنچ کر کہا کہ میری مالکن نے آپ کے لیے دوا بھیجی ہے، آپ اپنی آنکھوں سے پٹی کھولیں تاکہ میں اس میں دوا ڈال دوں۔ امید ہے کہ اس سے آپ کو شفا ملے گی۔ بیبرگ نے دوا ڈالنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ آپ اپنی رحمدل اور ہمدرد مالکن سے کہیں کہ وہ خود میری آنکھوں میں اپنی ہاتھوں سے اگر یہ دوا ڈالے گی تو مجھے قبول ہے ورنہ یہ دوا آپ لے جائیں میں اندھا ہی سہی۔ ملازمہ یہ جواب سُن کر واپس محل میں آگئی اور مَلی کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔ مَلی بڑی پریشان ہوئی کہ یہ کیسا مسافر اور اندھا ہے کہ ملازمہ کے ہاتھوں دوا ڈالنے سے انکار کیا اور مجھے بلا رہا ہے کہ میں اس کی آنکھوں میں دوا ڈالوں تو اسے شفا ملے گی۔ بہرحال وہ ملازمہ کو ساتھ لے کر سرائے پہنچی اور اس کمرے میں چلی گئی جہاں بیبرگ آنکھوں پر پٹی باندھے بیٹھا تھا۔ مَلی نے اسے آواز دی کہ اے نابینا مسافر میں نے آپ کے لیے دوا بھیجی تھی مگر سُنا ہے کہ آپ نے اسے اس شرط پر ڈالنے پر آمادگی ظاہر کی ہے کہ وہ دوا میں خود آپ کی آنکھوں میں ڈالوں۔ لہٰذا میں خود آگئی ہوں، آپ سیدھے بیٹھ جائیں تاکہ میں آپ کی آنکھوں سے پٹی کھول کر ان میں دوا ڈال دوں۔ پھر جب مَلی نے بیبرگ کی آنکھوں سے پٹی کھولی اور بیبرگ نے اپنی آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا تو وہ دو خوبصورت آنکھوں کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر مَلی مبہوت ہو کر رہ گئی۔ بیبرگ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ ان آنکھوں کو صرف آپ کی دید کی ضرورت تھی، آپ کے اس حسین و جمیل اور پری جمال چہرے کو دیکھ کر ان کی بینائی لوٹ آئی ہے۔ اے حسینہ میں کئی دن پہلے آپ کو دیکھ کر دیوانہ ہوا تھا اور ان آنکھوں کو ہی نہیں اس دل کو بھی تم سے ملنے اور مل بیٹھ کر دو چار باتیں کرنے کی بڑی آرزو تھی۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے ان کی آرزو پوری کر دی۔ مَلی کی کیفیت بھی کچھ عجیب سی ہو گئی تھی، وہ ان خوبصورت آنکھوں میں ڈوب چکی تھی اور اپنا دل ہار چکی تھی، اسے یکبارگی احساس ہوا کہ اسے کچھ ہو چکا ہے، وہ نوجوان بیبرگ کے عشق میں گرفتار ہو چکی تھی اور اُس لمحے

وہ نوجوان اسے ساری دنیا سے اچھا لگنے لگا تھا۔ اس طرح بیبرگ بالآخر مُلکی سے دوستی کرنے میں کامیاب ہوا اور ان کی دوستی طویل عرصے تک قائم رہی۔

اس بات کا تو ثبوت نہیں ملتا کہ اس نے مُلکی کے ساتھ شادی کی یا نہیں بہرحال ان کی دوستی کے تذکرے بیبرگ کی اپنی شاعری میں بھی ملتے ہیں۔ وہ مُلکی کے حسن و جمال کے ساتھ ساتھ اس کی دوستی اور محبت کا بھی اظہار کرتا ہے اور اکثر اس سے ملنے کے تذکرے بھی اپنی شاعری میں کرتا رہتا ہے۔

عومر و ماہو:

محبت کی یہ دردناک داستان مکران کے علاقہ زعمران سے تعلق رکھتی ہے جو موجودہ وقت میں ضلع کیچ کی ایک تحصیل ہے اور تربت شہر سے تقریباً پینسٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں اس قصبہ میں ایک لڑکی رہتی تھی جس کا نام ماہین تھا اور پیار سے اسے سب لوگ ماہو کہتے تھے۔ ماہو کے والدین فوت ہو چکے تھے اور اس کی پرورش اس کی خالہ نے کی تھی اور اس لڑکی کو بچپن سے ہی اس نے پالا پوسا تھا۔ جس خالہ نے اس کی پرورش کی ذمہ داری لی تھی اس کا اپنا ایک بیٹا تھا جس کا نام عمر تھا۔ دونوں بچوں کی پرورش ایک ہی گھر میں ہونے لگی۔ عمر کی ماں نے سوچا کہ ماہو اور عمر جب بڑے ہوں گے تو اس کی شادی ماہو سے کر دے گی۔ اس طرح گھر کی بچی گھر ہی میں رہے گی اور اس کے مرحوم والدین کی روح کو بھی سکون مل جائے گا۔ اس طرح ان بچوں کی پرورش ایک ہی گھر میں ہونے لگی اور وہ آہستہ آہستہ عمر کی منزلیں طے کرنے لگے۔ جب دونوں کچھ بڑے ہو گئے تو ایک دن عمر کی والدہ نے اُس سے کہا کہ ماہو بڑی ہو گئی ہے اور اپنے گھر کی بچی ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ تم دونوں کی نسبت طے ہو جائے تا کہ جب وہ بڑی ہو جائے تو تم اس سے شادی کر لینا۔ مگر عمر نے یہ کہہ کر ماہو سے شادی کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ماہو ایک گندی رہنے والی لڑکی ہے جو اپنی صفائی ستھرائی کا کوئی خیال نہیں رکھتی اور ہر وقت میلی کچیلی رہتی ہے لہٰذا وہ کسی بھی صورت ماہو کو اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔ عمر کی والدہ نے بیٹے کو بہت سمجھایا اور منت سماجت کی مگر عمر مسلسل انکار کرتا رہا۔ لاچار ہو کر اس کی والدہ نے اس موضوع پر بات کرنا ہی چھوڑ دیا۔

عمر کچھ عرصہ بعد کام کاج کی خاطر سندھ چلا گیا اور طویل عرصہ تک وہاں مقیم رہا۔ اس دوران کئی سال گزر گئے اور وہ جوان ہوا۔ طویل غیر حاضری کے بعد وہ اپنے قصبہ واپس چلا آیا تو اہل محلہ و قصبہ کے دیگر لوگ اُس سے ملنے اور اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے اس کے گھر آنے لگے۔ روایات کے مطابق رشتہ دار خواتین جب اُس سے ملنے کے لیے آگئیں تو وہ رواج کے مطابق عمر کا ہاتھ چومنے لگیں۔ اس دوران ایک انتہائی خوبصورت لڑکی اور حسن و جمال کا ایک پیکرِ دلکش بھی وہاں آئی اور اس نے عمر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے چوما اور اسے گھر واپس آنے پر خوش آمدید کہا۔ عمر اس خوبصورت اور حسین و جمیل لڑکی کو دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ گیا اور اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ حیرت میں تھا کہ اس کے قصبہ میں اتنی حسین و جمیل لڑکی کہاں سے آئی ہے؟ اور یہ کون ہے؟ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات اور سوالات آ رہے تھے۔ لوگ آتے رہے، اس سے ملتے رہے، باتیں کرتے رہے اور اس کے طویل سفر اور حالات کے بارے میں پوچھتے رہے مگر عمر تو اپنا سب کچھ لٹا چکا تھا، وہ اس حسین و جمیل اور پری جمال لڑکی کے حسن لاثانی میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ اسے اردگرد کے لوگوں کی موجودگی کا بھی کوئی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ جب لوگوں کا جمِ غفیر اُن سے رخصت ہوا اور وہ اپنے گھر میں اپنی والدہ کے ساتھ اکیلا ہوا تو اس نے اپنی والدہ سے اس لڑکی کے بارے میں پوچھا اور ساتھ ہی ماہو کے بارے میں بھی پوچھا کہ وہ کیوں مجھ سے ملنے نہیں آئی؟ عمر کی والدہ نے مسکراتے ہوئے اپنے بیٹے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ ماہو تو تم سے ملنے آئی تھی مگر تم نے اسے پہچانا نہیں۔ عمر حیران ہوا اور کہا کہ اے میری پیاری ماں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں ماہو کو پہچان نہ لوں؟ وہ کب اور کس وقت مجھ سے ملنے آئی تھی؟ اس کی والدہ نے مسکراتے ہوئے اپنے بیٹے کی بیتابی محسوس کرتے ہوئے کہا کہ میرے بیٹے وہ لڑکی جس کا تم اتنی بیتابی کے ساتھ پوچھ رہے ہو دراصل وہی ماہو تھی جس سے تم نے شادی کرنے سے انکار کیا تھا لہٰذا اس یتیم بچی کی شادی میں نے کہیں اور کر دی اور وہ آج اپنے گھر میں اپنے شوہر کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے اور ماہو کے بھائی بھی اس رشتے سے خوش اور مطمئن ہیں۔ عمر یہ سن کر حیران ہوا کہ یہ وہی ماہو تھی جو بچپن میں میلی کچیلی رہتی تھی اور جسے عمر نے صرف اسی وجہ سے ٹھکرا دیا تھا کیونکہ وہ اپنی صفائی ستھرائی کی جانب سے غافل اور لاپرواہ رہتی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ماہو جوان ہو کر اتنی خوبصورت

اور حسین بن جائے گی کہ جس کا ثانی پورے قصبہ میں کوئی نہ ہوگا۔ وہ قصبہ کی سب سے حسین ترین لڑکی تھی جس پر دوسری لڑکیاں رشک کرتی تھیں اور اس کی خوبصورتی اور حسن و رعنائی کی ہمیشہ تعریف کرتی تھیں۔ پورا قصبہ ماہو کے حسن و جمال پر نازاں رہتا تھا اور دور و نزدیک کے نوجوان اسے ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے چین و بے قرار رہتے تھے۔

عمر اب تو دن رات صرف ماہو کے خیالات میں کھویا رہتا تھا اور اسی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ چونکہ ماہو اس کے خالہ کی بیٹی تھی اور دونوں کا بچپن ایک ساتھ اور ایک ہی گھر میں گزرا تھا لہٰذا وہ ماہو سے ملنے اس کے گھر جانے لگا اور وہاں وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتا رہتا تھا۔ ماہو کو تو اس کے آنے پر کوئی اعتراض نہ تھا مگر اس کی ساس عمر کے اس طرح بے دھڑک اور روزانہ گھر آنے کو پسند نہیں کرتی تھی اور عمر کا ماہو کے ساتھ اس طرح گپ شپ اور ملاقاتیں اسے بالکل ناپسند تھیں لہٰذا اس نے ماہو کو منع کیا کہ وہ عمر سے نہ ملے مگر ماہو بیچاری کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی اور اس سلسلے میں اپنی لاچاری اور بے بسی ظاہر کی اور یہ بھی کہا کہ چونکہ وہ اور عمر بچپن سے ایک ساتھ پلے بڑھے ہیں لہٰذا عمر صرف اسی بچپن کے ساتھی کے طور پر اس سے ملنے آتا ہے اور ماضی کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ مگر اس کی ساس ماہو کی ان باتوں سے مطمئن نہ ہوئی اور اس نے اپنے بیٹے اور ماہو کے بھائیوں کو بُلا کر ان سے کہا کہ وہ عمر کو گھر آنے اور ماہو سے ملنے سے منع کریں کیونکہ اسے عمر کا اس طرح گھر آنا اور ماہو کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنا اور تعلقات بڑھانا اچھا نہیں لگتا۔ اس دوران ماہو اور عمر کے تعلقات کی خبریں قصبہ بھر میں گشت کرنے لگیں اور ہر زبان پر ان کے تذکرے ہونے لگے تھے، لوگ ان کے تعلقات کو غلط رنگ دے کر ماہو کے بھائیوں اور اس کے شوہر کو اشتعال دلا رہے تھے۔ لوگوں کی باتوں سے ماہو کے بھائی اور اس کا شوہر سخت پریشان اور شرمندہ شرمندہ رہنے لگے تھے۔ ماہو کا شوہر اور اس کے بھائی بھی عمر کے اس طرح گھر میں آنے جانے اور ماہو سے باتیں کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے اب باہر بھی لوگوں کی باتیں اُن کے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی تھیں مگر انہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ عمر سے کس طرح بات کریں اور اسے کیسے منع کریں، مگر جب ماہو کی ساس کی جانب سے انہیں اشارہ ملا اور اس نے انہیں کہا کہ وہ عمر کو منع کردیں تو ان کو موقع ہاتھ آیا اور انہوں نے ماہو اور عمر دونوں کا کام تمام کرنے کا منصوبہ بنایا۔

عمر اور ماہو ان سازشوں سے بے خبر تھے اور روزانہ ماہو کے گھر میں ملتے اور دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ ایک دن ماہو کے بھائی اور اس کا شوہر ڈھاٹے باندھ کر آئے، انہوں نے اپنے چہرے بھی چھپائے ہوئے تھے اور وہ ماہو کے گھر میں گھس گئے اور اسے تلواروں کی ضربیں مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ خونِ ناحق کرنے کے بعد وہ عمر کو مارنے کا منصوبہ بنانے لگے مگر عمر کو ان کی حرکت اور منصوبہ کا علم ہو چکا تھا اور اسے ماہو کی بے گناہ قتل کیے جانے کی اطلاع بھی مل چکی تھی لہٰذا وہ مکمل طور پر مسلح ہوا اور ان قاتلوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا حتمی فیصلہ کیا۔ اس نے ماہو کے قتل کا بدلہ لینے کا آخری فیصلہ کر لیا تھا لہٰذا وہ تنِ تنہا دشمنوں کی تلاش میں نکل پڑا جب کہ دوسری طرف ماہو کے بھائی اور اس کا شوہر اپنے کئی دیگر ساتھیوں کے ساتھ مل کر عمر کو تلاش کرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ ان کا آمنا سامنا بلیدہ کے قریب ہوا اور وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ عمر ماہو کے قاتلوں کو دیکھ کر وحشی بن چکا تھا اور اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ اس نے دشمنوں اور ماہو کے قاتلوں کو دیکھتے ہی اُن پر حملہ کر دیا۔ کافی دیر تک ان کے درمیان خونریز لڑائی جاری رہی۔ عمر نے ماہو کے پانچ بھائیوں اور اس کے شوہر کو موت کے گھاٹ اتار دیا جبکہ باقی لوگوں نے مل کر زخموں سے چور اور تھکاوٹ سے نڈھال عمر پر اپنی تلواریں برسائیں اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر کے ماہو کی روح کے ساتھ مل گئی۔

میدانِ عشق کے ان شہیدوں کی قبریں اب بھی تربت سے صرف سترہ کلومیٹر دور زعمران کے حدود میں واقع ہیں۔ ماہو اور عمر کی قبریں ساتھ ساتھ ہیں اور اس مقام کو عمرءِ ڈن کہا جاتا ہے۔ زعمران، بلیدہ اور تربت کے لوگ اس محبت بھری سچی داستان اور ماہو و عمر کی بے گناہ مارے جانے کے بارے میں جانتے ہیں اور ان کی قبروں پر جا کر ان کے ایصالِ ثواب کے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔

حسن و شالی:

بلوچ لوک داستانوں میں ایک مختصر سی کہانی حسن بلوچ اور شالی جتنی کی بھی ہے جو سچے عشق کی ایک ایسی داستان ہے کہ جس کے آغاز پر خوشی، مسرت اور محبت کے سچے جذبات کا

عکس نظر آتا ہے مگر اس کے انجام کو دیکھ کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور معاشرے کی بعض فرسودہ، تنگ نظر، غیر فطری، غیر اخلاقی، غیر مذہبی قبیح رسومات اور طبقاتی تقسیم پر غصہ بھی بہت آتا ہے اور ایسے فرسودہ خیالات اور اعتقادات سے نفرت ہوجاتی ہے جو انسانوں میں صرف قوم قبیلہ اور خاندان کے نام پر تقسیم پیدا کرتی ہیں اور ایک جیسے انسانوں کے معاشرتی درجے متعین کیے جاتے ہیں۔ حسن اور شالی ایک ایسے ہی دور کی محبت بھری داستان کے دوخوبصورت دل رکھنے والے کردار ہیں جو اصل اور کم اصل کے غیر فطری نظریات کی بھینٹ چڑھ گئے اور جن کی محبت کا گلا اسی طبقاتی تقسیم کی وجہ سے گھونٹا گیا اور انہیں ایک دوسرے کو دیکھنے تک کی مہلت نہیں دی گئی۔ جی ہاں! قارئین کرام حسن بلوچ اور شالی جیتی دو ایسے پیار کرنے والے کردار تھے کہ جنہوں نے کبھی بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھا اور ان کی محبت قائم ہوگئی، لیکن انہیں ایک دوسرے کو دیکھنے سے قبل ہی جدا کردیا گیا اور حسن بلوچ کو اس کے دشمنوں نے مار ڈالا۔

اس خوبصورت مگر دردناک کہانی کا تعلق بھی رند و لاشار یونین کے دور سے ہے جب یہ دونوں قبائل متحد تھے اور سبی و کچھی گنداوہ کے میدانوں پر قابض تھے۔ غالباً سولہویں صدی کا زمانہ تھا کہ سبی اور کچھی کے ان میدانوں میں یہ دو محبت بھرے پھول اُگ آئے مگر افسوس کہ کھلنے سے پہلے ہی مرجھا دیے گئے۔ حسن بلوچ قبیلہ رند کی کسی شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ انتہائی بہادر اور شجاع نوجوان تھا جس کی شمشیر زنی اور تیراندازی کے ساتھ ساتھ اس کی جنگوں میں بہادری کے جوہر دکھانے کے قصے بھی زبانِ زدِعام تھے اور وہ دور و نزدیک دوست و دشمن حتیٰ کہ ہر جگہ مشہور و معروف تھا اور اپنی ان ہی خصوصیات کی وجہ سے ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے دشمن اس سے خوف کھاتے تھے اور اس سے ڈرتے تھے جبکہ اس کے دوست اس کی بہادری اور شجاعت پر فخر و ناز کرتے تھے۔ وہ رند و لاشار قبائل کے علاوہ دیگر بلوچ قبائل میں بھی بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ نوجوان تھا اور خوبصورتی اور وجاہت میں بھی لاثانی تھا۔ جب وہ اپنی عمر کے نوجوانوں کے درمیان ہوتا تو اپنی شخصیت اور حسن و خوبصورتی کی وجہ سے سب سے نمایاں اور منفرد نظر آتا تھا۔ حسن کے کئی بھائی اور قریبی عزیز و رشتہ بھی تھے جو حسن سے بے حد محبت کرتے تھے اور سب ہی اس کے شیدا

تھے جبکہ وہ ایک متوسط مگر مضبوط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔

گنداوہ کے علاقے میں لاشاری قبائل کے مابین جت قبائل کی حمیری شاخ سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی رہتی تھی اس کا نام شالی تھا۔ وہ ایک امیر کبیر لڑکی تھی جس کے پاس ہزاروں بھیڑ بکریوں کا ریوڑ اور اونٹوں کا بڑا سا گلہ تھا جب کہ وہ ایک شاندار محل نما وسیع و عریض حویلی میں رہتی تھی۔ شالی (شَلّی) اپنی خوبصورتی اور حسن و رعنائی کی وجہ سے صرف علاقہ لاشار ہی نہیں بلکہ رندوں میں بھی کافی مشہور تھی۔ لوگ اس کا نام لیتے تھے اور اس پر مر مٹتے تھے۔ وہ شاعروں کی خیالی محبوبہ تھی اور اس کا حسن و جمال، دلربائی و رعنائی ہمیشہ عاشقانہ مزاج رکھنے والے شعراً کا موضوع ہوتے تھے اور وہ نوجوانوں کی محفل کی اولین موضوع ہوتی تھی، کوئی اس کے قد و قامت کی تعریف کرتا تو کوئی اس کی خوبصورتی اور حُسنِ زیبا کے قصیدے کہتا، کوئی اس کی کج ادائی اور غرور پر مرمٹتا تو کوئی اس کے گیسوئے دراز اور زلفِ خم دار کا قیدی ہوتا۔ الغرض شالی بھی اپنی عمر کی لڑکیوں کے مابین ایک شہزادی اور مثلِ حور و پری نظر آتی تھی اور جو کوئی بھی اسے دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا اور چاہے جتنا بھی حاسد ہوتا تعریف کے چند الفاظ ضرور اس کی زبان پر آجاتے۔ وہ لڑکیوں کی محفلوں میں ہمیشہ یاد کی جاتی اور اس کے آجانے سے محفل میں جیسے جان سی آجاتی۔ جہاں بھی بیٹھی ہوتی سب کی نظریں اسی طرف اٹھ جاتیں اور سب اسے ہی دیکھتے۔ وہ واقعی حسین تھی اور حسن و خوبصورتی میں کسی مثال سے کم نہ تھی۔

حسن نے بھی شالی کے قصے سُنے تھے اور جب وہ اپنے دوستوں کی محفلوں میں بیٹھتا تو یار دوست آپس میں شالی کے تذکرے کرتے اور اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے۔ کسی نے اسے دیکھا بھی نہ ہوتا تب بھی اس کی ایسی تعریفیں کرتا جیسے وہ اس کے روبرو بیٹھی ہوئی ہو۔ سارے نوجوان آپس میں بیٹھ کر اس کے تذکرے کر کے محظوظ ہوجاتے۔ حسن بھی اس کے تذکرے سنتا مگر کہتا کچھ بھی نہیں بلکہ اس کے حسن و زیبائی کے تصوّر میں کھوجاتا۔ وسری جانب شالی بھی اکثر اپنی سہیلیوں اور افرادِ خانہ سے حسن کی بہادری، شجاعت، جنگبازی، شمشیرزنی، تیراندازی، مردانہ وجاہت، عمدہ شخصیت، خوبصورتی اور حُسن کے تذکرے سنتی، اکثر لڑکیاں بھی حسن کا تذکرہ اس انداز میں کرتیں جیسا کہ وہ حسن سے مل کر آئی ہوں اور اس کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں۔ ساری لڑکیاں حسن کے نام

پر مرٹتی تھیں اور ہر ایک اس کا نام لے کر سرد آہ بھر کر کہتی کہ کاش وہ اس کا جیون ساتھی بن جائے۔ شالی یہ سب کچھ سنتی مگر منہ سے کچھ بھی نہیں کہتی اور نہ ہی اپنے خیالات کسی کے سامنے بیان کرتی بس دل ہی دل میں وہ حسن کے بارے میں سوچتی اور اس پر ہزار دل و جان سے فدا ہوتی جاتی تھی۔ اس طرح دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھے بغیر ایک دوسرے پر فدا ہوئے۔ اور دل ہی دل میں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرنے لگے جبکہ ان کے درمیان رابطے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔

دن گزرتے گئے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ دونوں کی محبت بھی ایک دوسرے کو دیکھے بغیر بڑھتی گئی۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اپنے تصورات میں ایک دوسرے کو اپنی آنکھوں میں سجائے رکھتے اور آپس میں باتیں کرتے۔ حسن کی شہرت دن بدن بڑھتی گئی اور اس کے کارناموں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ جبکہ شالی کی خوبصورتی اور بھرپور جوانی کے قصے بھی زبانِ زدِ عام ہوتے گئے اور اس کے طلبگاروں کی تعداد بھی بڑھتی گئی مگر اس نے کسی کو بھی درخورِ اعتناء نہیں سمجھا کہ اس کا محبوب تو حسن بلوچ تھا جو تمام نوجوانوں سے منفرد اور یکتا تھا اور اس کے خوابوں کا شہزادہ تھا۔ بڑے بڑے میر و معتبرین نے اس کے رشتے طلب کیے مگر اس نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور نہ کچھ سوچا اور انہیں انکار کر دیا۔ اسے تو بس ایک ہی رشتے کے آنے کا انتظار تھا کہ شاید وہاں سے میرے لیے کوئی طلب کا پیغام آئے اور میں خود کو دیکھے اور سوچے بناء اس کے سپرد کر دوں، نجانے حسن بلوچ کب مجھے طلب کرے گا۔ جبکہ حسن جانتا تھا کہ اس کا والد اور بھائی کبھی بھی کسی جت قبیلہ کی عورت سے اس کی شادی نہیں ہونے دیں گے لہٰذا اُن سے شالی کا رشتہ طلب کرنے کی درخواست کرنا بالکل فضول ہے۔ وہ اس انتظار اور سوچ میں تھا کہ شاید قدرت کوئی راستہ نکال دے یا اس کے بھائیوں اور والد کے دل میں ہمدردی اور انسانیت کے جذبات پیدا کر دے کہ وہ شالی کو اس کی منکوحہ کی حیثیت سے قبول کریں۔ دونوں دل جلے اپنی اپنی جگہ اپنی قسمتوں اور مستقبل کے منتظر تھے اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔ بالآخر شالی سے مزید انتظار نہ ہو سکا اور اس نے پہل کر دی۔ شالی نے براہِ راست حسن کو شادی کا پیغام بھیجا۔ حسن کو جیسے انہی لمحات کا انتظار تھا وہ خوشی سے پھولے نہیں سمایا اور بالکل پاگل سا ہو گیا۔ وہ خوشی اور مسرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا اور آج سے قبل وہ اتنا خوش کبھی

بھی نہیں ہوا تھا۔ آج اسے دنیا کی ہر شئے اچھی اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس نے نہ تو اپنے والد سے مشورہ کیا اور نہ بھائیوں کو پوچھا، نہ کسی اور عزیز و اقارب یا چچا وغیرہ سے صلاح طلب کی بلکہ پیغام ملتے ہی فوراً ہاں کر دی اور یہ بھی پیغام اپنی طرف سے بھجوایا کہ میں فلاح دن آپ سے نکاح کرنے آ رہا ہوں۔ اس طرح پہلے پیغام کے ملتے ہی دونوں کے درمیان شادی کی تاریخ تک طے ہو گئی۔

حسن جب گھر آیا اور اپنے بھائیوں اور دیگر گھر والوں سے اس رشتے کا تذکرہ کیا اور کہا کہ وہ بہت جلد شالی سے شادی کرنے والا ہے تو اس کے بھائی اور والد سمیت تمام خاندان والے سخت ناراض ہو گئے اور سب نے اسے سمجھایا کہ وہ رند بلوچ ہے اور ان کی نسل اعلیٰ ہے جب کہ شالی جت ہے لہٰذا وہ ایک جت عورت کو اپنی منکوحہ نہ بنائے کہ اس سے سارے خاندان کی بدنامی ہوگی مگر حسن نے کہا کہ یہ فرسودہ خیالات ہیں اور میں ان بنی بنائی انسانی نسلی تقسیم پر یقین نہیں رکھتا۔ سارے انسان برابر ہیں اگر وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے تو یہ کوئی گناہ نہیں ہے کیونکہ میں بھی دیگر نوجوانوں کی طرح اس سے شادی کا طلبگار تھا مگر کسی سے اس بات کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بھائی اور والد اس کے اس فیصلے سے انتہائی ناخوش ہوئے اور اسے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس عورت کو اس گھر میں نہ لائے کہ اس سے ہم سب کی سُبکی ہوگی۔ حسن پھر بھی نہ مانا اور اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں لیا۔ البتہ اتنا ضرور کہا کہ آپ لوگ جس جتنی عورت سے مجھے شادی کرنے سے منع کر رہے ہیں اس کے لیے کئی سرداروں اور اعلیٰ نسل کے نوجوانوں کے رشتے بھی گئے ہیں اور سیکڑوں مزید طلبگار بھی اس کے راستوں میں بھٹکتے ہیں اور اس سے صرف ایک دید کے طالب ہوتے ہیں۔ مگر ان سرداروں، میروں اور امیر زادوں کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے ہر ایک اُس سے شادی کرنے سے منع کرے گا مگر وہ خود اُس سے شادی کا طلبگار ہوگا اور اگر شالی میری بجائے کسی کا بھی انتخاب کرے چاہے وہ کوئی اعلیٰ سردار ہی کیوں نہ ہو، وہ اس رشتے سے انکار نہیں کرے گا۔ میں شالی سے ہر قیمت پر شادی کروں گا۔ اس کے والد نے کہا کہ ہم آپ کی شادی میں شرکت نہیں کریں گے یہ شادی آپ اُس کے گھر میں جا کر رچائیں، جبکہ اس گھر میں اس شادی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔

حسن کو جس بات کا اپنے گھر والوں سے ڈر تھا وہی ہوا اور گھر والوں نے معاشرے کی فرسودہ اور خود ساختہ رسومات کی وجہ سے اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کیا اور حسن کو نہ صرف اس رشتہ سے انکار کرنے کا کہا گیا بلکہ شادی کی صورت میں اسے گھر نہ آنے اور شالی کو اس گھر میں نہ لانے کا حکم بھی صادر فرما دیا۔ اس بات کی خبر سارے علاقے میں جنگل کے آگ کی طرح پھیل گئی کہ شالی اور حسن کی شادی طے ہوگئی ہے اور حسن بہت جلد اسے بیاہنے والا ہے جبکہ حسن کے گھر والوں نے اس شادی سے حسن کو منع کیا ہے مگر حسن نے شالی سے شادی کا حتمی فیصلہ بھی کر لیا ہے۔

جس طرح عرض کیا گیا کہ شالی کے کئی دیگر طلبگار بھی تھے جو اسے دل و جان سے چاہتے اور اس پر مر مٹتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ شالی اس کی منکوحہ بنے اور اس کے گھر کے آنگن کو اپنی خوبصورتی اور حسن و جمال سے روشن کر دے۔ ایسے ہی نوجوانوں میں ایک کا تعلق رند قبیلہ سے تھا اور عجیب اتفاق ہے کہ اس کا نام بھی حسن رند تھا۔ وہ بھی شالی کے عاشقوں میں سے تھا اور اُس پر جان چھڑکتا تھا۔ وہ شالی کا نام کسی کے منہ سے سننا پسند نہیں کرتا تھا اور اس پر سخت ردِعمل دیا کرتا تھا حتیٰ کہ لڑائی جھگڑے پر اُتر آتا تھا۔ شالی بھی اس کے بارے میں جانتی تھی مگر اس کے بُرے کردار اور اعمال کی وجہ سے اسے سخت ناپسند کرتی تھی اور اس کا ذکر بھی سننا پسند نہیں کرتی تھی۔ حسن رند کو جب شالی اور حسن بلوچ کی شادی طے ہو جانے کی خبر ملی تو وہ غیض و غضب میں تلملا اُٹھا اور کہا کہ میرے ہوتے ہوئے کوئی بھی شالی کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، میں حسن کو اس سے پہلے ٹھکانے لگا دوں گا اور اسے کسی بھی حالت میں شالی تک پہنچنے نہیں دوں گا۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ حسن ایک بااثر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور خود بھی نامور اور مشہور و معروف جنگجو ہے۔ لہٰذا اسے اتنا آسان نہیں لینا چاہیے۔ چالاک اور مکار حسن رند حسن بلوچ کو مارنے کے منصوبے سوچتا رہا اور اس کے شیطانی دماغ نے اس سلسلے میں کئی منصوبے سوچے مگر پھر انہیں ناقابل عمل سمجھ کر رد کر دیے۔ بالآخر اس کے شیطانی دماغ میں ایک مکروہ اور بدترین منصوبہ آیا۔

حسن نے سوچا کہ سارے گھر والوں سے کہوں گا کہ وہ اس شادی میں شرکت کریں اور اس کی حمایت کریں، اگر پھر بھی کوئی نہیں آیا تو اپنے چھوٹے بھائی اور ایک رہبر کو

ساتھ لوں گا کہ وہ شالی کے گھر تک اس کی رہنمائی کرے۔ بالآخر وہ دن بھی آیا جب اس کو شالی کے گھر جانا تھا اپنی اور شالی کے نکاح کے لیے۔ اس نے اپنی شادی کے لیے نئے کپڑے سلوائے اور نئے جوتے بنوائے۔ داڑھی اور مونچھوں کو خوب تیل لگا کر ان میں چمک پیدا کی۔ گھوڑے کی زین کسی اور اسے لگام ڈال دی، جو ہتھیار گھوڑے پر سجانے کے تھے وہ اس نے سجا دیے، گھوڑے کے زین کے ایک طرف خرجین اور دوسری طرف نیزہ لٹکانے کی جگہ چھوڑی۔ سر پر سفید عمامہ (پگڑی) باندھی، اپنے سارے ہتھیار اٹھائے، خمدار چمکدار تلوار کو زریں میان میں ڈالی اور اپنے کمر پر باندھ لی، ترکش کو تیروں سے بھر کر اپنی پیٹھ پر کس دیا، اپنے نیزے کو جس کی انی اس نے خوب چمکائی تھی، گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ دیا، خنجر کو میان میں ڈال کر کمر کے دائیں طرف باندھ دی، اپنا زرہ بکتر پہنا، زرہ بکتر کے اوپر اس نے اپنا سفید رنگ کا بلوچی پیراہن (لمبی گول گیردار قمیض) اور گیردار بلوچی شلوار پہن لی، چمکدار کالے رنگ کے بلوچی جوتے پہنے، ایک نظر خود پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل کر اس نے گھوڑے کی لگام پکڑی اور اسی حالت میں وہ حویلی کے صحن میں آیا۔ اس لمحے وہ ایک شہزادہ لگ رہا تھا۔ سفید کپڑوں میں اس کی شخصیت انتہائی متاثر کن تھی۔ جب اس کے خاندان والوں نے اس کی سج دھج دیکھی اور اس کی وجاہت پر ان کی نظر پڑی تو اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے والد نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا کہ میرے بیٹے اپنی شان دیکھو، تم کسی شہزادے سے کم نہیں لگ رہے، اب بھی وقت ہے اسی حالت میں تم کہو تو میں اپنی قوم کی خوبصورت ترین لڑکی کو آج ہی تم سے بیاہ دوں، میری مانو شالی سے شادی کا ارادہ ترک کر دو۔ حسن نے انتہائی ملائمت اور پیار سے اپنے والد کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا کہ اے پدرِ محترم! میں جو ارادہ کر چکا ہوں وہ اٹل ہے، شالی میرے ادھورے خوابوں کی تعبیر اور میری زندگی کا مقصود ہے، میری خوش قسمتی ہے کہ اس نے مجھے شادی کا پیغام بھیجا، میں بلوچ ہوں اور میں اسے شادی کے لیے زبان دے چکا ہوں، وہ مرد ہی کیا جو زبان دے اور اس پر قائم نہ رہے۔ میں صرف آپ لوگوں سے آخری بار کہہ رہا ہوں کہ میں جا رہا ہوں اور آپ لوگ میرا ساتھ دیں۔ اس کے والد کے چہرے پر غصے، ناراضگی اور مایوسی کے آثار پھیل گئے اور اس نے حسن کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا کہ میرے بیٹے اسے

اس گھر میں مت لانا۔ آپ کے ساتھ میرے گھر سے کوئی بھی نہیں جائے گا اور آپ کی شادی میں میرے خاندان کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ حسن نے باپ کی جانب سے مایوس ہو کر اپنے چھوٹے بھائی کی جانب دیکھا مگر بھائیوں میں سے بھی کوئی اس کے ساتھ جانے کو تیار نہ ہوا حتیٰ کہ وہ رہبر جس سے اس نے بات کی تھی بھی مکر گیا اور ساتھ جانے سے عین موقع پر انکار کر دیا۔ حسن اپنے گھر اور خاندان والوں کے نامناسب رویے سے سخت مایوس ہوا اور انہیں اسی حالت میں چھوڑ کر خود گھوڑے پر بیٹھ کر اکیلے ہی شالی کے گھر کی جانب چل پڑا۔

وہ اپنے گھوڑے کو شالی کے قصبے کی جانب سرپٹ دوڑا رہا تھا اور اس کا سیاہ راہدار گھوڑا کچھی کے میدانوں میں طویل فاصلوں کو بڑی تیزی کے ساتھ سمیٹ رہا تھا۔ وہ صبح سویرے گھر سے نکلا تھا اور ظہر سے قبل ہی اس نے کافی فاصلہ سمیٹ لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ سورج ڈھلنے سے قبل ہی شالی کے گھر پہنچ جائے گا اور آج کی رات وہ میاں بیوی کی حیثیت سے اکھٹے گزاریں گے۔ وہ انہی خیالات میں مگن گھوڑے کو سرپٹ دوڑائے جا رہا تھا۔ اسے کیا پتہ کہ تھوڑے ہی فاصلے پر قضا اس کی منتظر ہے اور وہ اپنے ارمانوں سمیت جہانِ فانی سے رخصت ہونے والا ہے۔ ہائے حسن کاش تیرے بھائی تیرے ساتھ ہوتے تو شاید نتیجہ کچھ اور ہوتا اور تو موت کو شکست دے دیتا مگر افسوس کہ جو اٹل ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ وہ اپنے گھوڑے کو سرپٹ بھگا رہا تھا اور اسے ایڑ پر ایڑ لگاتا جا رہا تھا، گھوڑا بار بار ہنہناتا ہوا اپنی رفتار بڑھا رہا تھا کہ اچانک حسن نے دیکھا کہ پچیس تیس کے قریب گھڑسواروں نے اس کا راستہ روکا ہوا ہے۔ حسن ان کے قریب آیا اور اپنے گھوڑے کی رفتار کم کر دی۔ نزدیک آنے پر اس نے ان میں سے اکثر کو پہچان لیا کہ وہ اس کے اپنے رند قبیلے کے نوجوان تھے اور ان کے آگے حسن رند نامی شخص گھوڑے پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ باقی نوجوان بھی قبیلے کے بہترین جنگجو تھے جن میں سے ہر ایک ہتھیار کو کھلونے کی طرح استعمال کر سکتا تھا۔

حسن جانتا تھا کہ حسن رند بھی شالی کے طلبگاروں میں سے ایک ہے اور وہ اس پر مرمٹتا ہے مگر شالی اس سے اس لیے نفرت کرتی ہے کیونکہ حسن رند کا کردار اور اس کے اعمال ٹھیک نہیں ہیں۔ حسن نے ان کے قریب آ کر گھوڑے کو روکا۔ وہ خطرے کو بھانپ گیا تھا اور مقابلے کے لیے مکمل طور پر خود کو تیار کر چکا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ گھوڑے کی لگام اور دوسرا تلوار کے دستے

پر تھا۔ جب وہ قریب آیا تو اس کے رقیب نے اسے للکارتے ہوئے کہا کہ حسن تم نے یہ کیسے سوچا کہ میرے ہوتے ہوئے تم شالی سے شادی کرو گے، جب تک میں زندہ ہوں شالی کو کوئی ہاتھ لگانا تو در کنار اس کا نام بھی نہیں لے سکتا، ورنہ میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ حسن رند کی للکار کے جواب میں حسن نے اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا کہ دیکھو اگر شالی نے خود میرا انتخاب کیا ہے تو اس میں مَیں کیا کر سکتا ہوں، اور اگر وہ تمہیں ناپسند کرتی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ دیکھو مجھے جانے دو کہ شالی میرا انتظار کر رہی ہے اور اس نے مجھ سے شادی کا ارادہ کیا ہے اور اس نے خود ہی مجھے پیغام بھیجا ہے۔ جواب میں اس کے رقیب نے کہا کہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور یہ کہہ کر اس نے حسن پر حملہ کر دیا۔ حسن اِن ان گنت جنگجوؤں کے سامنے ڈٹ گیا اور ایک بپھرے ہوئے درندے کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے ان میں سے کئی نوجوانوں کو مار گرایا۔ جب لڑتے لڑتے تلوار اس کے ہاتھ میں ٹوٹ گئی تو اس نے اپنا نوکیلا نیزہ تھام لیا اور ان کو گھونپ گھونپ کر گھوڑوں سے گرانے لگا۔ گھمسان کی اس جھڑپ میں اس نے حسن سمیت کئی نوجوانوں کو مار ڈالا اور خود بھی شدید زخمی ہوا۔ زخموں سے چور وہ لڑتا رہا، جب نیزہ بھی ناکارہ ہوا تو اس نے خنجر سنبھالا اور اس سے کئی دشمنوں کا کام تمام کر دیا، بالآخر وہ اپنے گھوڑے سے گر پڑا اور ساتھ ہی کئی تلواریں ایک ساتھ اس پر برس پڑیں اور اس کے جسم میں گہرے گھاؤ لگا دیے۔ حسن اسی وقت راہی ملک عدم ہوا اور محبت کے شہیدوں کے کاروان میں شامل ہوا۔ حسن رند کے ساتھی اپنے مقتول ساتھیوں کی لاشیں اٹھا کر روتے پیٹتے اپنے قصبہ کی طرف گئے جبکہ حسن کی لاش کو اسی ویرانے میں چھوڑ دیا۔

شام ڈھلنے سے قبل کئی چرواہے اپنے ریوڑوں کو لے کر اپنے اپنے قصبوں کی جانب رواں دواں تھے۔ وہ جب اس مقام پر پہنچے جہاں حسن اور اس کے دشمنوں کے مابین جنگ ہوئی تھی تو انہیں حسن کی لاش مل گئی۔ حسن چونکہ انتہائی مشہور و معروف نوجوان تھا اور اکثر لوگ اسے جانتے تھے لہٰذا ان چرواہوں نے بھی اسے پہچان لیا اور اس کی لاش اٹھا کر اس کے گاؤں لے آئے اور اس کے گھر پہنچا دیا۔ جب حسن کی لاش اس کے قصبہ میں پہنچی تو پورے قصبہ میں کہرام مچ گیا۔ لوگ حیران تھے کہ وہ کون شخص تھا کہ جس نے اس جیسے بہادر اور دلیر نوجوان پر قابو پایا۔ جب چرواہوں سے پوچھا گیا تو انہوں ے وہ جگہ بتادی جہاں پر جنگ ہوئی تھی اور

یہ بھی کہا کہ وہاں اتنا خون پڑا تھا جس سے لگتا تھا کہ وہاں صرف حسن نہیں مارا گیا بلکہ کئی لوگ مارے گئے ہیں۔ اس دوران پورے بی و کچھی کے علاقوں میں اس جنگ کی خبر پھیل گئی اور اس بات کا بھی علم ہوا کہ حسن کو کس نے اور کیوں مارا ہے؟ اس بات کا بھی لوگوں کو علم ہوا کہ دس پندرہ لوگ حسن کے ہاتھ سے مارے گئے تب باقی ماندہ لوگوں نے زخموں سے چور حسن پر ایک ساتھ حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ حسن کی بہادری پر لوگ عش عش کرا ٹھے جب کہ اس کے رقیب حسن رند کی غیر دانشمندی اور بزدلی پر انہوں نے خوب لعن طعن کی۔ حسن کے قبیلہ والے اس کے انتقام لینے کے لیے بپھر گئے اور وہ حسن کے والد اور بھائیوں کو بھی اس بات پر آمادہ کر رہے تھے کہ حسن کا خون رائیگاں نہیں جانا چاہیے۔

شالی کو جب اس اندوہناک واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ سکتے میں چلی گئی۔ کافی دیر تک اس کی یہی حالت رہی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ حسن، جس کے لیے اس نے شادی کا جوڑا زیب تن کیا تھا، اپنے آپ کو خوب ہار سنگھار کیا تھا، اور آج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُس بہادر اور شجاع نوجوان کی زندگی کا حصہ بننے جا رہی تھی، وہ مارا گیا ہے۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میرے حسن کو کوئی نہیں مار سکتا، آج اس کی شادی ہے اور وہ دولہا بن کر آ رہا ہے، مجھے ہواؤں اور آسمان پر محوِ پرواز پرندوں نے اطلاع دی ہے کہ حسن سج دھج کر دولہا بن کر اپنے سجیلے اور تنومند سُبک رفتار سیاہ گھوڑے پر بیٹھ کر روانہ ہو چکا ہے اور اب بس پہنچنے ہی والا ہے۔ شالی کی حالت لمحہ بہ لمحہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اسے سہیلیوں نے اور گھر میں آئی دیگر خواتین نے بتا دیا تھا کہ حسن کو حسن رند اور اس کے ساتھیوں نے دھوکے سے مارا ہے، جبکہ حسن نے بھی ان میں سے کئی لوگوں کو مار ڈالا اور تنِ تنہا اُن کا مقابلہ کیا۔ شالی پاگل سی ہو گئی تھی، وہ زور زور سے بین کر رہی تھی، اس نے شادی کا جوڑا اُتار پھینکا اور کالے کپڑے پہن لیے، سارے زیور اتار کر اس نے اپنے لمبے لمبے کالے بال کھول کر بکھر دیے اور حویلی کے صحن میں آ کر سر پر خاک ڈال کر آہ وزاری کرنے لگی اور ماتم کناں ہو گئی۔ ایسے جیسے کسی عورت کا شوہر فوت ہو گیا ہو اور وہ بیوہ ہو گئی ہو۔ اس کی چیخ و پکار اور رونے دھونے کو دیکھ کر گھر میں موجود سارے لوگ رونے اور بین کرنے لگے۔ بعد ازاں شالی نے غائبانہ طور پر حسن کی ساری آخری رسومات ادا کیں اور اس کے لیے قرآن خوانی اور خیر و خیرات کے بعد اس کے والد اور بھائیوں کو پیغام بھیجا کہ وہ حسن کا

انتقام لیں اور اس کا خون رائیگاں نہ جانے دیں۔ حسن کے والد اور اس کے بھائیوں نے شالی کو یقین دلایا کہ بے گناہ اور معصوم حسن کے خون کا بدلہ ضرور لیا جائیگا اور اس کا خون کبھی بھی رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا۔

کہتے ہیں شالی نے اس کے بعد اپنی باقی ماندہ ساری زندگی حسن کے بیوہ کے طور پر گزاری اور ساری زندگی شادی نہیں کی۔ وہ جب تک زندہ رہی حسن کی برسی مناتی رہی۔ وہ خوب اہتمام کے ساتھ اس کے ایصال ثواب کے لیے دعائیں کرواتی تھی، خیر و خیرات کرتی اور نیاز دیتی تھی۔ یقیناً شالی اور حسن کی محبت اس درجے کی محبت ہے کہ جسے بلوچی فوک لور میں اہم ترین مرتبہ اور مقام حاصل ہونا چاہیے۔

درویش و بیگم:

یہ داستان بھی دو ایسے پیار کرنے والے انسانوں سے متعلق ہے کہ جنہوں نے معاشرتی بندھنوں کو توڑ کر ایک دوسرے کو حاصل کیا اور اس پیار کی جنگ میں قربانیوں کی مثال قائم کی۔ یقیناً درویش اور بیگم کی کہانی سچی محبت کی عمدہ ترین کہانیوں میں سے ایک اچھی کہانی ہے کہ جس کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اس کہانی کا تعلق علاقہ مکران کے دو شہروں تربت اور گوادر سے ہے۔

کہتے ہیں تربت کے کسی اعلیٰ خاندان میں درویش نام کا ایک خوبرو اور خوش اخلاق نوجوان رہتا تھا جس کی ہمدردی، محبت بھرا لہجہ، خوش اخلاقی، ملنساری اور انسان دوستی کی وجہ سے سب لوگ اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ مکران کے اعلیٰ خاندانوں میں میوزک بجانے کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور اسے نچلے درجے کے لوگوں کا پیشہ خیال کیا جاتا تھا۔ بلوچ قبائل میں بدقسمتی سے طبقات موجود تھے اور انہی طبقات کی درجہ بندی پر پورا معاشرہ استوار تھا۔ گو کہ لوگوں کو پیشہ کے لحاظ سے تقسیم کیا گیا تھا مگر بعض پیشوں کو حاکم خاندان اور میر و معتبرین پسند نہیں کرتے تھے لہٰذا ان پیشوں سے منسلک لوگوں کو بھی اس لحاظ سے کمتر خیال کرتے تھے۔ میوزک اور گانا بجانا بھی ان قبائل میں اُن لوگوں کا پیشہ خیال کیا جاتا تھا جن کو یہ میر و معتبرین اپنے سے کم معاشرتی درجے پر رکھتے تھے۔ (اب وہ خیالات تبدیل ہو چکے ہیں

اور بڑے بڑے اعلیٰ خاندانوں کے لوگ بھی میوزک کے پیشے سے وابستہ ہیں) لہٰذا درویش بھی موسیقی کے آلات بجاتا تھا اور اس کا اسے جنون کی حد تک شوق تھا بالخصوص رباب سے ملتا جلتا ایک آلۂ موسیقی بجانے میں وہ کمال دسترس رکھتا تھا جسے ہشادری کہا جاتا تھا۔ وہ جب یہ آلۂ موسیقی پر کوئی دھن چھیڑتا تو ہوائیں بھی جھومنے لگتیں اور اڑتے پرندے بھی رُک کر اس میٹھی اور سریلی آواز کو سن کر محظوظ ہوتے۔ کہتے ہیں جس محفل میں درویش اپنے آلۂ موسیقی بجانے کے لیے پہنچتا وہاں کوئی دوسرا فنکار بیٹھنے کی جرأت نہ کرتا کیونکہ اُن کو پتہ تھا کہ اگر ایک بار وہ ہشادری بجانے بیٹھ گیا تو پھر کسی کو بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع نہیں ملے گا اور نہ ہی کسی کو وقت کا احساس ہوگا۔ درویش کی شہرت دور و نزدیک ہر جگہ پہنچ چکی تھی اور وہ دور دراز علاقوں میں جا کر اپنے فن کا مظاہرہ کر کے لوگوں سے داد و انعام وصول کر چکا تھا۔

درویش ایک بار اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے گوادر چلا گیا۔ اس کا ارادہ کچھ عرصہ گوادر میں بیٹھ کر پروگرام کرنے اور اپنے فن سے لوگوں کو محظوظ کرنے کا تھا۔ لہٰذا وہ گوادر چلا گیا اور وہاں وہ اپنے فن سے لوگوں کو محظوظ کرنے لگا۔ وہ ہر رات سرائے میں پروگرام کرتا یا کسی کے گھر یا حویلی میں اس کے فن کے مظاہرہ کے لیے پروگرام ترتیب دیا جاتا اور وہ وہاں پر لوگوں کے جمِ غفیر کے مابین اپنا آلۂ موسیقی بجاتا اور ہشادری کے سریلی آواز سے مختلف دھنیں بجا کر لوگوں کو تفریح کا سامان فراہم کرتا اور ان سے اپنے فن کی داد وصول کرتا۔ وہ کئی دنوں تک گوادر میں مقیم رہا اور یہیں سے اس کی پیاری سی محبت بھری کہانی کا آغاز ہوا۔

گوادر شہر میں ایک خاتون اقامت پذیر تھی جس کا نام بیگم تھا یا وہ اسی نام سے اہلیانِ گوادر میں معروف تھی۔ وہ پیشہ کے لحاظ سے آرٹسٹ یعنی فنکارہ تھی اور اپنی فنکاری اور آواز کے جادو سے لوگوں پر سحر طاری کر دیتی تھی۔ وہ از حد حسین، جوان اور دلربا سی خاتون تھی کہ جس پر کئی نوجوان فدا تھے مگر وہ اپنی شرافت اور بردباری کی وجہ سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی، البتہ اس کی شرافت، بردباری اور ملنساری و ہمدردی کی وجہ سے سب لوگ اس کی عزت کرتے تھے اور اسے احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بیگم کے نام سے مشہور ہوئی وگرنہ یہ نام بلوچ قبائل میں مستعمل نہیں ہے اور عموماً کسی باعزت اور بڑے گھرانے کی بہو بیٹی کے لیے استعمال ہوتا ہے، شاید اسی بردباری اور باعزت زندگی کی وجہ سے

اہلیان گوادر اور دیگر جان پہچان کے لوگ اسے بیگم کے نام سے پکارتے تھے۔ بیگم کو بھی اس بات کی اطلاع ملی کہ گوادر شہر میں ایک میوزیکل فنکار آیا ہے جو اپنے آلۂ موسیقی سے لوگوں پر سحر کا سا سماں طاری کر دیتا ہے۔ اس نے درویش کی عمدہ فنکاری اور موسیقی پر مکمل عبور رکھنے کے بارے میں سُنا تو بہت خوش ہوئی اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جسے درویش نے بسر و چشم قبول کیا۔

اس طرح بیگم اور درویش کی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں درویش نے اپنی پوری صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیگم کے سامنے ایسا میوزک بجایا کہ بیگم دل و جان سے اس پر فدا ہوئی۔ اس نے درویش کو ایک ساتھ کام کرنے اور فنکای کے جوہر دکھانے کی پیشکش کی جسے درویش نے قبول کیا۔ اس طرح گوادر میں انہوں نے مشترکہ طور پر پروگرام کیے جو خوب کامیاب رہے۔ انہیں داد بھی ملی اور پیسے بھی۔ اس طرح ان کی حالت مستحکم ہوگئی۔ وہ ایک ساتھ پروگرام کرتے کرتے ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس دوران کئی ماہ گزر گئے۔ ایک دن درویش نے بیگم کو کہا کہ اس طرح الگ الگ رہ کر ہم دوسروں کی نظروں میں مشکوک بنتے جا رہے ہیں اور لوگ ہمارے تعلقات کی نوعیت کو سمجھے بغیر اسے غلط رنگ دے رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ لوگوں کے منہ بھی بند ہو جائیں اور ہم دونوں بھی الگ الگ رہنے کی اذیت سے نکل جائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں شادی کریں اور میاں بیوی کی حیثیت سے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کریں تو لوگوں کے منہ بند ہو جائیں گے۔ بیگم تو عرصہ سے اسی انتظار میں تھی کہ درویش اسے شادی کا پیغام دے، لہٰذا اس نے فوراً ہاں کر دی۔ اس طرح انہوں نے نکاح کر کے میاں بیوی کی حیثیت سے اپنی نئی زندگی شروع کی اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اکھٹے پروگرام کرنے لگے۔ ان کی زندگی بڑی خوش و خرم اور مسرت کے ساتھ گزر رہی تھی۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بیحد محبت کرتے اور ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد درویش کو اپنے گھر بار اور والدین کا خیال آیا تو اس نے بیگم سے کہا کہ وہ اپنے شہر تربت جانا چاہتا ہے جہاں اس کے والدین، بہن بھائی اور عزیز و اقارب رہتے ہیں جو بے تابی سے اس کی آمد کے منتظر ہوں گے۔ مجھے گوادر میں قیام کیے کافی طویل عرصہ

ہو چکا ہے۔ میرے خیال میں ہمیں تربت جانا چاہیے تاکہ تم میرے خاندان والوں سے بھی مل لو۔ بیگم کو بھلا اپنے بے پناہ پیار کرنے والے اچھے شوہر سے کیسے اختلاف ہو سکتا تھا، لہٰذا اس نے فوراً ہاں کردی اور اس طرح وہ دونوں گوادر سے رختِ سفر باندھ کر تربت کے لیے نکل پڑے۔ وہ کئی دنوں کے سفر کے بعد جب تربت پہنچے تو اہلیانِ شہر اور درویش کے خاندان والوں نے ان کا بھرپور استقبال کیا۔ جب وہ گھر پہنچے تو درویش کے گھر والے اس کے ساتھ ایک فنکارہ کو بطور بیوی دیکھ کر بالکل بھی خوش نہیں ہوئے اور درویش سے کہا کہ تم نے خاندانی اور قبائلی روایات کا کوئی خیال نہیں کیا جو اس فنکارہ عورت سے شادی کر کے اسے گھر لے آئے۔ اہلیانِ قبیلہ اور خاندان کے لوگ اس بارے میں کیا کہیں گے اور ہم انہیں کیسے مطمئن کریں گے۔ درویش نے اپنے خاندان والوں کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ بیگم ایک بہت ہی اچھی، نیک و پارسا اور بردبار و باعزت خاتون ہے، وہ اپنے فن سے اپنی روزی روٹی کماتی تھی نہ کہ وہ کوئی غلط کام کرتی تھی، میرے ساتھ مل کر اس نے کام کیا ہے اور میں نے اس کو اس کی بردباری اور عزت واحترام کے پیشِ نظر شادی کی پیشکش کی اور اس نے میرے ساتھ شادی کے لیے حامی بھری۔ کافی تکرار اور بحث مباحثے کے بعد درویش کے گھر والوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر بیگم کو ہمارے ساتھ رہنا ہے تو وہ اپنے فن کو چھوڑ دے گی اور آئندہ کسی بھی پروگرام میں گیت وغیرہ نہیں گائے گی بلکہ درویش کی بیوی کی حیثیت سے گھر میں بیٹھی رہے گی اور بغیر اجازت کے اپنے کمرے سے نہیں نکلے گی۔ بیگم نے اپنے پیار کرنے والے انتہائی اچھے شریکِ حیات درویش کی خاطر اپنے فن کا گلا گھونٹ دیا اور آئندہ کے لیے کسی بھی پروگرام میں جانا بھی چھوڑ دیا۔ اس نے اپنے فن کو اپنی محبت کی خاطر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہا اور درویش کے گھر میں ایک خاتونِ خانہ کی حیثیت سے بیٹھ گئی۔

درویش اپنے فن سے اپنی روزی روٹی بھی کماتا اور اپنا گھر چلاتا تھا اور لوگوں کو تفریح بھی فراہم کرتا تھا۔ ان کی زندگی بڑی خوش وخرم اور آسودہ گزر رہی تھی۔ مگر درویش کے گھر والے اس شادی سے خوش نہیں تھے اور وہ چاہتے تھے کہ درویش اس عورت کو چھوڑ دے اور کہیں اور شادی کرے تاکہ لوگوں کی زبانیں بند کی جاسکیں۔ مگر درویش کسی بھی طور اپنی پیاری اور وفادار بیوی کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا اور اسے الگ کمرے میں رکھا۔ اس طرح ان کی

زندگی کے دن گزرتے گئے۔ درویش کی موجودگی میں اس کی بیوی سے کوئی بھی فردِ خانہ تیز آواز میں بات بھی نہیں کرتا مگر اس کی غیر حاضری میں اُن کا رویہ بیگم کے ساتھ انتہائی معاندانہ اور ناقابل برداشت ہوتا تھا۔ لہٰذا بیگم زیادہ تر اپنے کمرے میں بند پڑی رہتی تھی۔

ایک دن درویش کہیں کسی پروگرام میں شرکت کرنے گیا تھا جہاں اس نے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ حسبِ معمول بیگم اپنے کمرے میں بند پڑی تھی کیونکہ وہ درویش کے گھر سے نکل جانے پر اپنے کمرے تک محدود ہوتی تھی اور وہاں سے حتی الوسع باہر نہیں نکلتی تھی، جبکہ بعض ذرائع یہ بھی بتاتے ہیں کہ چونکہ مکران میں چار دیواری کا کوئی رواج نہ تھا اور زیادہ تر آبادی بغیر چار دیواری کے گھروں میں رہتی تھی لہٰذا اسی طرح کے ایک کمرے میں بیگم کا بھی قیام تھا جس کے باہر صحن کی بجائے کھلا میدان تھا۔ لہٰذا حتی الوسع وہ کمرے سے نہیں نکلتی تھی تا کہ اُس پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ علاوہ ازیں اسے درویش کے گھر والوں نے بھی کمرے سے باہر آنے سے منع کیا تھا کہ یہ ہماری روایات کے خلاف ہے کہ عورت کمرے سے باہر نکل کر کھلے صحن میں آئے جبکہ گھر کی کوئی چار دیواری بھی نہیں۔ لہٰذا درویش کے جانے کے بعد بیگم اپنے کمرے میں بند پڑی تھی۔ سردیوں کے دن تھے اور اس نے کمرے کے درمیان میں آگ جلائی تا کہ کمرہ گرم ہو جائے اور سردی سے بچا جا سکے۔ کمرے کی آتشدان میں جلتی ہوئی آگ کی کچھ چنگاریاں اُڑ کر کمرے میں پڑی ایسی اشیاء پر گریں جن میں جلدی آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے کمرے نے آگ پکڑ لی۔ بیگم اس آگ کو دیکھ کر پریشان ہوئی مگر روایات کی پاسداری کرتے ہوئے اس نے اپنی جان بچانے کی بجائے اُن روایات کو بچانے کی کوشش کی جسے درویش کے خاندان والے اپنی قومی روایات قرار دے چکے تھے کہ ایک عورت اس طرح کھلے عام گھر کے صحن میں نہیں آسکتی اور نہ ہی کہیں آزادی کے ساتھ آ جا سکتی ہے۔ گھر کے دیگر افراد آئے اور انہوں نے چیخ و پکار شروع کی اور بیگم کو کمرے باہر نکلنے کے لیے پکارنے لگے، مگر بیگم نے کمرے سے باہر آ کر روایات کو توڑنے سے جل کر بھسم ہو جانے کو ترجیح دی۔ اس طرح یہ معصوم، محبت کرنے والی اور بے گناہ خاتون اندھی روایات کی بھینٹ چڑھ کر اپنی زندگی کی بازی ہار گئی اور موت کو گلے لگانا قبول کیا مگر اُن روایات کو نہیں توڑا جن پر کاربند رہنے کی اسے ہدایت کی گئی تھی۔

درویش کو جب اس اندوہناک واقع کی اطلاع ملی تو وہ پاگلوں کی طرح دیوانہ وار اپنے گھر کی جانب دوڑ پڑا۔ جب وہ گھر پہنچا تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا اور گھر والے بیگم کی سوختہ لاش کو سامنے رکھ کر اس پر بین کر رہے تھے۔ درویش نے جو اپنی بیوی کی یہ حالت دیکھی اور اس کی جلی ہوئی لاش پر اس کی نظر پڑی تو وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا اور بیگم بیگم کہتا ہوا اپنی بیوی کی جلی ہوئی لاش پر گر پڑا۔ اور زور زور سے چیخ چیخ کر رونے لگا۔ بعدازاں بیگم کی تجہیز و تکفین اور آخری رسومات سے فارغ ہونے کے بعد گھر والے درویش کی جانب متوجہ ہوئے جو اپنا ذہنی توازن کھو چکا تھا اور پاگلوں کی طرح رو رو کر بیگم کو آوازیں دیتا پھر رہا تھا۔ اسے پاس بٹھا کر بھائیوں نے، والد نے، والدہ نے حتیٰ کہ تمام افراد خانہ نے سمجھایا کہ یہ سب کچھ قسمت کا لکھا تھا جو ہوا، اب اپنی حالت کو سنبھالو اور اپنی زندگی جینا شروع کرو۔ ہماری مانو تو اپنے قبیلہ میں کسی لڑکی سے شادی کر لو ہمیں یقین ہے کہ تمہارے یہ زخم بہت جلد مندمل ہو جائیں گے۔ درویش نے غصے سے گھر والوں کی جانب دیکھا اور کہا کہ دنیا کی کوئی عورت یا لڑکی میرے لیے بیگم کی جگہ نہیں لے سکتی اور نہ ہی میرے یہ زخم جو آپ لوگوں کی فرسودہ روایات اور خاندانی جھوٹی انا کی وجہ سے مجھے ملے ہیں اور جن کی وجہ سے میری چہیتی اور محبت کرنے والی بیوی موت سے ہمکنار ہوئی، میرے یہ زخم کبھی بھی مندمل نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اب میں آپ لوگوں کے پاس رہوں گا۔ میں یہ گھر اور یہ علاقہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ مجھے آپ لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی آپ میں سے کسی کو میرے پیچھے آنے کی اجازت ہے۔ آپ لوگ اپنی روایات کو زندہ رکھیں اور اپنی انا کی دستار کو مضبوطی کے ساتھ باندھ رکھیں میں اپنی بیگم کی یاد میں باقی ماندہ زندگی گزار دوں گا۔ پھر درویش نکلا اور اپنا آلہ موسیقی لے کر تربت سے نکل پڑا۔ اس نے درویشوں والا لباس پہنا اور اس کا حلیہ بھی بالکل درویشوں جیسا بنا۔ اس کا نام بھی درویش تھا اور اس نے اپنی باقی ماندہ زندگی بھی ایک گمنام درویش کی طرح بسر کی، وہ زندگی جو صرف چند ماہ کی رہ گئی تھی۔ بیگم کی وفات کا زخم اتنا گہرا تھا اور بیگم کی جدائی کا درد اتنا شدید تھا کہ دولیش صرف چھ ماہ مزید زندہ رہ سکا اور پھر اس کا انتقال ہوا اور وہ اپنی بیگم سے ملنے کے لیے ملکِ عدم کے سفر پر روانہ ہوا۔

باب سوم

بلوچ سماج اور بلوچی ادب میں رومانوی داستانوں کی اہمیت

گذشتہ ابواب پڑھنے کے بعد یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ بلوچ قوم کا جمالیاتی اور رومانوی تصورِ حیات کیا ہے؟ اور اس کی نوعیت کیسی ہے؟ بلوچ سماج میں رومانویت کو کس نظر سے دیکھا جاتا ہے؟ اور اس کے کرداروں کی نوعیت کیسی رہی ہے؟ علاوہ ازیں پہلے باب میں بلوچ سماج میں عورت کے مقام و مرتبہ کا جو مختصر سا نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ الفاظ یقیناً اس صنف کے مقام و مرتبے کا احاطہ کرنے کے لیے ناکافی ہیں جو اس سماجی گروہ کے اندر عورت کو حاصل ہے جبکہ صنف نازک اس سے بھی اعلیٰ مقام و مرتبہ کی حامل ہے۔ گذشتہ سطور میں بھی یہ عرض کیا گیا کہ ضروری نہیں کہ بلوچ سماج میں سارے لوگوں کی سوچ بھی ایک جیسی ہو اور سب کی نیت بھی یکساں ہو، مگر مجموعی طور پر بلوچ قوم کی بحیثیت قوم اور سماجی ادارے کے جو اصول وضع کیے گئے ہیں ان کے مطابق عورت کا جو مقام و مرتبہ متعین ہے وہ یقیناً مثالی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انفرادی طور پر بلوچ قوم میں منفی خیالات رکھنے والے لوگ ملتے ہیں۔ یہ اُن کا ذاتی فعل ہے کہ وہ عورت کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں مگر بحیثیت مجموعی عورت کا مقام اس قوم کے اصولوں کے مطابق متعین ہے اور تاریخی کتب کے صفحات پر بھی ان کے کردار اور سماجی حقوق کے بارے میں کئی واقعات اور تحریریں ملتی ہیں۔

اگر بلوچ سماج میں خواتین کے مختلف سیاسی وسماجی معاملات میں عمل دخل اور کردار کا

جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ بلوچ خواتین روزِ اول سے ہی اپنے معاشرے کے سماجی و سیاسی معاملات میں مدخل ہوتے رہے ہیں اور اپنا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ماضی میں بلوچوں کے اپنے سماج میں بلوچی زبان یا کسی بھی ذیلی بلوچی زبان میں تاریخ نویسی کا کوئی رواج نہیں تھا اور نہ ہی اب تک اس قسم کے شواہد ملے ہیں کہ بلوچی کبھی سرکاری اور تحریری زبان کے طور پر بلوچستان میں مستعمل رہی ہے۔ مگر اس قوم کی قدیم تاریخ کے بارے میں قدیم کتب میں کافی شواہد ملتے ہیں یعنی بلوچوں نے اگرچہ اپنے بارے میں خود کچھ بھی لکھ نہیں چھوڑا تاہم دیگر اقوام نے، جن کا بلوچوں کے ساتھ واسطہ پڑا، بلوچوں کے بارے میں کافی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ ان غیر بلوچ مورخین کی کتب سے بھی بلوچوں کی سابقہ تاریخ پر کافی حد تک روشنی پڑتی ہے اور اس خطے میں ماضی قدیم سے اب تک ان کے سرگرم اور باعمل کردار کا علم ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں پندرہویں اور سولہویں صدی کی بلوچ تاریخ کے بارے میں بلوچی زبان میں منظوم انداز میں بلوچوں کی وسطی عہد کی تاریخ کے بارے میں ٹھوس اور اہم شواہد ملتے ہیں۔ یہ عہد رند و لاشار اتحادیہ کا دور کہلاتا ہے جب یہ دونوں بڑے قبائلی یونین نے ایک ہی یونین کی شکل اختیار کی اور اور تاریخ میں رند و لاشار یونین کے نام سے شہرت پائی۔ بلوچ تاریخ کا یہ دور بڑی ہی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس دور میں نہ صرف بلوچی ادب پروان چڑھا اور ایک بہت بڑا ادبی خزانہ بلوچی کا حصہ بنا بلکہ اسی دور میں بلوچ قوم کے لاتعداد عسکری اور رومانوی کرداروں نے جنم لیا۔ یہ وہی دور ہے جب تین بلوچ خاندانوں نے بلوچستان (ایران، افغانستان اور پاکستان میں منقسم بلوچستان) اور سندھ سمیت پنجاب و کے پی کے کے بعض حصوں پر بھی بلوچ حاکمیت قائم کی۔ یہ خاندان کمبرانی، رند و لاشار اور دودائی ہوت کہلاتے ہیں جنہوں نے منگولوں کے زوال پر ایشیاء میں پھیلی ہوئی انارکی اور انتشار سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور مغرب میں کرمان کے حدود سے لے کر مشرق میں ہندوستان کی سرحدات تک جبکہ شمال میں سیستان سے لے کر جنوب میں ساحل بیلہ و مکران تک کا وسیع و عریض علاقہ اپنے تصرف میں لے آئے۔ جس کے نتیجے میں بلوچ قبائل وسیع و عریض رقبے میں پھیل گئے۔ یہ وہ عہد تھا کہ جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومتیں بنتی اور بگڑتی جا رہی تھیں جبکہ بابر کا لشکر ابھی تک لودھیوں کے ساتھ نہیں ٹکرایا تھا بلکہ یہ گرگانی ترک جو ہندوستان

کی تاریخ میں مغل کے نام سے مشہور و معروف ہوئے ابھی تک منظر عام پر بھی نہیں آئے تھے کہ بلوچ قبائل ہندوستان کی سرحدات تک پہنچ چکے تھے۔

اس عہد میں بلوچوں کے ان فاتح قبائل کے بارے میں تاریخی کتابوں میں بہت کچھ مرقوم ہوا جبکہ رند و لاشار قبائل نے بلوچی منظوم ادب کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ پنجاب اور سندھ میں آباد اور برسرِ اقتدار آنے والے قبائل اور ان کی حاکمیت کے دوران بلوچ خواتین کے کردار کے بارے میں معلومات ناپید ہیں مگر کمبرانی اور رند و لاشار عہد میں بلوچستان کی سیاست اور سماجی اداروں میں بلوچ خواتین کے بارے میں کافی اہم شواہد اور بیانات ملتے ہیں جن کے مطالعہ سے بلوچ سماج کے اصل خدوخال اور اس میں خواتین کے کردار کی بہتر وضاحت ہوتی ہے۔ کمبرانی عہد میں ادب کے میدان میں بلوچ خواتین کے تذکرے زیادہ نہیں ملتے البتہ سیاسی میدان میں میر احمد خان اول (1666-1695) کے عہد میں ان کی ہمشیرہ ماہی بیبو کا تذکرہ ملتا ہے کہ جو دربار میں اپنے بھائی کے قریب بیٹھ کر اور ان کے ساتھ مل کر امورِ حکومت و سیاست میں ان کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ جبکہ عسکری میدان میں بھی ماہی بیبو کے کارنامے تاریخی کتب میں مرقوم ہیں۔ یہ بہادر اور جوانمرد خاتون باروزئیوں کے ساتھ لڑتی ہوئی ماری گئی جبکہ یہ واقعہ سترہویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔ (نصیر (2000) 17) اس کے بارے میں تاریخی کتب میں منظوم انداز میں ایک بیان ملتا ہے کہ:

یکے خواہرش بود بیبو بنامِ
ہمہ مردمان کرد اورا سلام
چومرداں بہ دیوان نشستی مدام
بہ گردش ہمہ مرداں خاص و عام
زنے بود دانا بسے ہوشیار
بمردانگی درجہاں اشتہار

(نصیر (2000) 17)

ماہی بیبو کا دربار میں اپنے حاکم بھائی کے پہلو میں بیٹھنا اور امورِ سلطنت میں بطورِ مشیرِ خاص کردار ادا کرنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ بلوچ قبائل میں ابتدائی عہد سے ہی

خواتین سیاسی میدان میں سرگرم تھیں اور انہیں امورِ سیاست و ریاست کا تجربہ حاصل تھا، حتیٰ کہ ماہی بیبو کی رزم آرائیوں سے اس بات کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے کہ بلوچ خواتین نہ صرف سیاسی بلکہ عسکری میدان میں بھی بھرپور کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ گذشتہ اوراق میں ایک جنگجو حاکم اور عاشق میر بہرام خان باران زئی بلوچ کا تذکرہ آیا۔ ان کا معاشقہ عزت نامی خاتون سے چلا جو بالآخران کی زوجہ بن گئی۔ عزت جہاں رومانوی طور پر بلوچ ثقافت کی پہچان کہلاتی ہے تو ان کا اپنے شوہر کے شانہ بشانہ جنگوں میں شمولیت کرنا بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ بلوچ خواتین جہاں معاشرے کے دیگر میدانوں میں اپنے بھرپور کردار سے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں تو سیاسی و عسکری حوالے سے بھی وہ سرگرم تھیں۔ میر نصیر خان نوری کے زریں عہد میں بھی خواتین کی بحالی اور ان کے معاشرے میں کردار و عمل کو بڑھانے کے لیے عملی اقدامات کیے گئے۔ ان کے حقوق و مراتب کا خیال رکھا گیا اور انہیں اپنے بھرپور کردار کو ادا کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ مگر یہ درست ہے کہ کمبرانی عہد میں خواتین کا کردار زیادہ وسیع و واضح نہیں تھا بلکہ صرف شاہی خاندان کی خواتین تک محدود تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ عہد کمبرانی قبیلہ کی دو ذیلی خاندانوں (طائفوں) کا عہد کہلاتا ہے۔ اول عہد کو میروانی جبکہ عہد دوم کو احمد زئی عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میروانی عہد میں کمبرانیوں کی ساری توجہ مدافعت اور دفاعِ ریاست کی جانب مبذول رہی اور انہیں مختلف اقوام و قبائل کی یورشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ مغلوں سے لڑتے رہے، جدگالوں (قدیم ہوت قبائل جو گیارہویں صدی عیسوی کے بعد برسر اقتدار آئے اور منگولوں کی مداخلت تک وہ وسیع و عریض خطے پر قابض ہوئے۔ سراوان و جھلاوان بھی ان کے قبضہ و اختیار میں تھے جنہیں براہوئی زبان بولنے والے بلوچ قبائل جت، جتگال، جدگال، جنغدال اور جاموٹ کے نام سے پکارتے تھے) کے ساتھ خونریز جنگیں لڑ کر سراوان و جھلاان میں ان کا زور توڑا، رندو لاشار قبائل کی متحدہ قوت کا سامنا کیا جنہوں نے تقریباً بیس برسوں تک انہیں اقتدار سے محروم کیا اور خود اُن کے علاقوں سوراب، منگچر، قلات وغیرہ پر قابض ہو گئے۔ اس طرح میروانی عہد زیادہ تر انتشار کا زمانہ تھا جس میں کمبرانیوں کو اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقتور حریفوں کا سامنا کرنا پڑا اور انہوں نے انتہائی استقلال کے ساتھ اپنی حاکمیت جاری رکھی۔ اس متزلزل اور غیر یقینی دور میں کمبرانیوں میں

سیاسی یا ادبی حوالے سے کسی بھی خاتون کا تذکرہ نہیں ملتا۔ یقیناً جنگوں اور غیر مستحکم حکومت ہونے کی وجہ سے خواتین کا سیاسی، سماجی اور ادبی کردار نہ ہونے کے برابر تھا البتہ یہ بڑی بات تھی کہ انتہائی کم وسائل ہونے کے باوجود اور اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقتور قوتوں کی موجودگی میں کمبرانیوں کی میروانی شاخ کے بہادر اور مستقل مزاج حاکموں نے اڑھائی سو سال سے بھی زیادہ عرصے تک اپنے وجود کو قائم رکھا اور جب منتقلی اقتدار کا وقت آیا تو اقتدار اپنے مرکزی قبیلہ کمبرانی کو ہی منتقل کیا۔ کمبرانیوں کا دوسرا عہد اس عہد کے پہلے حاکم میر احمد خان اول کی وجہ سے احمد زئی عہد کے نام سے موسوم ہوا۔ میر احمد خان اول کا انتیس سالہ طویل عہد کمبرانی عہد کا آغاز عروج تھا کیونکہ اس بیدار مغز حکمران نے وسیع و عریض علاقہ فتح کر کے کمبرانی خاندان کی جغرافیائی حدود کو خوب وسعت عطا کی اور مستحکم حاکمیت کی بنیاد ڈالی۔ اسی حاکمِ قلات میر احمد خان کی بہن ماہی بیبو نے دربار قلات میں بیٹھ کر ریاستی امور سرانجام دیے تھے۔ منطق سمجھ میں آجاتی ہے یعنی چونکہ میروانی عہد طوفانوں اور مدافعتی جنگ کا عہد تھا لہٰذا اس عہد کی رزم آرائیوں میں عورتوں کا کوئی کردار نہ تھا مگر جب احمد زئی عہد میں ریاست کو استحکام حاصل ہوا اور کمبرانی حاکم دفاعی پوزیشن سے نکل کر استحکامت کی جانب گامزن ہوئے اور ان کے زیرِ حاکمیت علاقوں کو ذرا سکون ملا تو ریاست کے استحکام کی خاطر مختلف ادارے بھی بنتے گئے۔ تب خواتین کا کردار ماہی بیبو کے روپ میں منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ میر نصیر خان نوری کی والدہ محترمہ بی بی مریم صاحبہ کا ریاست قلات کے سیاسی امور میں بھرپور کردار تھا۔ تاریخ کی کتب میں ان کے کردار کے بارے میں کئی مستند بیانات ملتے ہیں۔ کچھی کا علاقہ انہی کی دانشمندی سے احمد زئیوں نے کلہوڑوں کے قبضہ سے چھڑایا اور اسے دوبارہ قلات کے حدود میں شامل کیا۔ قلات کے شاہی دربار کی خواتین میں میر نصیر خان کی صاحبزادی جس کا نام بی بی زینب تحریر کیا گیا ہے (نصیر (2000):94)، کا کردار بھی بڑا اہم تھا کہ جس نے اپنے بھائیوں کی خانہ جنگی رُکوانے کے لیے سرگرم کردار ادا کیا۔ گوکہ اسے ناکامی ہوئی مگر اس کی کاوشیں تاریخ کے اوراق پر رقم ہوئیں۔ اسی طرح انگریزی حملے کے وقت یعنی 1839ء میں میر محراب خان کی بیٹی بی بی بانڑی کی انگریزوں کے خلاف سفارتی کوششیں اور ناراض قبائل کو منانے کے لیے اس کی کاوشیں کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ دورِ حاضرہ میں بھی اس خاندان کی کئی خواتین کا

سیاسی میدان میں قابل ذکر کردار ہے اور وہ قومی اور عوامی اداروں سے منسلک ہیں۔ علاوہ ازیں احمد زئی عہد میں شاہی دربار کی خواتین کے علاوہ انگریزی مداخلت کے دوران ادبی میدان میں بھی چند خواتین کے تذکرے ملتے ہیں۔ ان خواتین میں براہوئی زبان کے مشہور و معروف مذہبی عالم اور براہوئی زبان میں قرآن مجید کے پہلے مترجم جناب مولانا محمد عمر دینپوری کی عالمہ بیٹی بی بی تاج بانو اور مولانا موصوف کی دونوں بیگمات شامل تھیں جو انگریزوں کی تبلیغی مشنری کے خلاف بھرپور انداز میں اپنا کردار ادا کر رہی تھیں۔ بی بی تاج بانو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ درجنوں کتابوں کی مصنفہ تھی۔ گو کہ یہ کتابیں مذہبی اور اصلاحی نوعیت کی ہیں مگر اہم ترین بات یہ ہے کہ یہ براہوئی زبان میں تحریر ہیں اور ایک قبائلی معاشرے کی ایک خاتون کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی تحریریں ہیں۔ مولانا صاحب کی دونوں بیگمات ان کے ایک میگزین کی سب ایڈیٹر یعنی نائب مدیر تھیں اور اس میگزین کی اشاعت میں بھرپور کردار ادا کر رہی تھیں، واضح ہو کہ اس میگزین کو بلوچستان کی تاریخ کے پہلے میگزین ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ لیکن چونکہ بلوچوں کے براہوئی زبان بولنے والے قبائل پر مذہب کی چھاپ بہت زیادہ ہے اور وہ خواتین کے حوالے سے کافی حد تک تنگ نظری کا شکار ہیں لہٰذا ماضی میں بھی اس صنف کی تخلیقی صلاحیتوں کو صرف گھر کی چار دیواری تک محدود رکھا گیا اور انہیں معاشرے میں کوئی بھی قابل ذکر کردار ادا نہیں کرنے دیا گیا۔ بلاشبہ کمبرانی حکمرانوں (میروانی و احمد زئی) پر مذہب کا اثر بہت زیادہ تھا اور افغان حکمرانوں کے ساتھ مختلف مہمات نے اس جنونیت کو مزید بڑھا دیا تھا لہٰذا انہوں نے بھی افغانوں کی طرح مذہب کی دیگر احکامات پر عمل کیا یا نہیں بہر حال خواتین کے حقوق اور کفار کو مارنا اپنا فرض عین بنا لیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ کمبرانی حکمران مذہبی معاملات میں روادار تھے اور اپنی مملکت مین آباد غیر مسلموں سے روادارانہ سلوک روا رکھتے اور انہیں مکمل مذہبی و سماجی تحفظ فراہم کرتے تھے۔ ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ بلوچستان کی ہندو اور دیگر غیر مسلم اقلیتوں کو خوانینِ قلات کے عہد میں کوئی تکلیف یا گزند پہنچی ہو یا ان کے مذہبی معاملات اور دیگر سماجی امور میں کبھی کسی بلوچ نے مداخلت کی ہو۔ لیکن نہ تو اس میں کوئی شک ہے اور نہ ہی اس حقیقت سے انکار کرنا چاہیے کہ خوانین قلات نے خواتین کو ریاست کے معاملات میں کوئی بھی کردار ادا کرنے کا

موقع فراہم نہیں کیا اور نہ ہی ایسے حالات پیدا کیے اور نہ ہی ایسے ادارے بنائے کہ جن سے خواتین کو معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنے کا موقع ملتا۔ خوانین قلات کی حکومت مکمل طور پر قبائلی حمایت اور امداد کی بنیاد پر قائم تھی اور براہوئی بولنے والے بلوچ قبائل اور ان کے مضبوط سردار اس حکومت کی حمایت کر رہے تھے۔ چونکہ بلوچوں کے اس گروہ یعنی براہوئی قبائل کا معاشرہ ناخواندہ تھا جہاں خواتین تو اپنی جگہ مردوں کے لیے بھی کسی طرح کے تعلیمی ادارے وغیرہ کا کوئی تصور نہ تھا۔ نہ ہی ان قبائل میں سیاسی ادارے قائم تھے اور نہ ہی حکومت کا کوئی تصور موجود تھا۔ پندرہویں صدی کے آغاز میں ان قبائل میں سیاسی بیداری کی لہر اٹھی اور انہوں نے اپنی حاکمیت کا آغاز کیا۔ شروع کے اڑھائی سوسال تک تو ان قبائل کی پوری تاریخ خونریز جنگوں اور مدافعانہ رویوں پر مشتمل رہی اس کے بعد بھی جب ریاست مستحکم ہوئی اور مختلف ریاستی ادارے معرض وجود میں آئے تو بھی ان میں خواتین کو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا حالانکہ اب احمدزئی حاکموں نے علم وادب کی سرپرستی بھی شروع کی تھی۔ میر نصیر خان نوری کے دربار سے بڑے بڑے علماء منسلک تھے جبکہ ان کے والد میر عبداللہ خان قہار اور بڑا بھائی میر محبت خان خود بلوچی زبان کے اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ میر نصیر نوری کے دربار سے بلوچی زبان کا پہلا غزل گو شاعر جام درک منسلک تھا جو ملک الشعرأ کے عہدے پر فائز تھا۔ علاوہ ازیں اس دربار سے قاضی نور محمد گنجابوی، آخوند صالح محمد، آخوند محمد حیات اور ملک داد قلاتی جیسے علماء اور شعرأ بھی منسلک تھے۔ ملک داد قلاتی کی لکھی ہوئی کتاب تحفۃ العجائب کو براہوئی زبان کی پہلی کتاب ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے، جبکہ نصیر خان نے کئی علمی ادارے اور جامعات بھی بنوائے اعلم وادب کی سرپرستی بھی کی، مگر اس کے باوجود خواتین کی معاشرتی، سماجی اور سیاسی ترقی کے لیے کوئی بھی قابل قدر کردار ادا نہیں کیا اور نہ ہی اس صنف کو ملکی معاملات میں کردار ادا کرنے کا کوئی موقع فراہم کیا، بلکہ جب قلات کا آئین بنایا گیا تو اس میں بھی خواتین کے حقوق کو سلب کرنے کی کوشش کی گئی اور ان کی شخصی آزادی کو سلب کیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی کئی دیگر وجوہات تھیں جس کی وجہ سے کمبرانی دور میں خواتین کا کردار بلوچ معاشرے میں ناپید رہا۔ لہٰذا اس دور میں اکا دکا خواتین کے علاوہ کوئی بھی قابل ذکر نام سیاسی، سماجی یا ادبی حوالے سے نظر نہیں آتا۔

کمبرانی حکمرانوں کے برعکس اگر رند و لاشار قبائل کے اتحادیے پر ایک نظر ڈالی جائے تو وہاں صورتحال اس سے کچھ مختلف نظر آتی ہے۔ رند و لاشار یونین میں بھی گو کہ عورت کی حیثیت وہی تھی جو ایک بنیاد پرست قبائلی معاشرے میں ہوتی ہے مگر پھر بھی اس یونین کے دور میں کئی خواتین کے تذکرے کتب میں ملتے ہیں کہ جنہوں نے بلوچستان کی سیاسی، سماجی، ادبی اور رومانوی شعبوں میں اہم کردار ادا کیا۔ سیاسی حوالے سے رند و لاشار کے محل کی خواتین کا کردار محدود تھا جو مشاورت میں اپنے حاکموں کی مدد کرتے تھے مگر اس کے بارے میں کوئی مستند حوالہ نہیں ہے کہ رند و لاشار کے عہد میں سیاسی میدان میں بلوچ خواتین کا بڑا یا اہم کردار رہا ہو۔ اس میدان میں رند و لاشار یونین کے حکمران بھی کمبرانی بلوچوں کے پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ البتہ ادبی میدان میں اس دور میں بلوچ خواتین کا کردار بہت ہی اہم اور قابل ذکر تھا۔ اس دور میں کئی بلوچ خواتین منظر عام پر آئے جن کی منظوم ادبی خدمات نے بلوچی زبان و ادب کو مضبوط اور توانا بنیادیں فراہم کیں۔ اس قبائلی سماج میں سیاسی میدان میں خواتین کا آنا شاید ناممکن تھا یا ان کے لیے حالات سازگار نہیں تھے، مگر جب ادب کے وسیع و مشکل ترین میدان میں پندرہویں، سولہویں اور سترہویں صدی میں بلوچ خواتین بڑی تعداد اور توانا ادبی ذخیرے کے ساتھ نظر آتی ہیں تو یقیناً یہ حیرت انگیز منظر ہے۔ کیونکہ کسی قدیم قبائلی سماج میں کہ جہاں دنیاوی علوم ناپید ہوں اور معاشرے کی بنیادیں قدیم خطوط پر استوار ہوں، ایسے معاشرتی نظام میں خواتین کا بڑی تعداد میں ادبی اصناف کے ساتھ منسلک ہو جانا واقعی حیرت انگیز اور تعجب خیز ہے جبکہ سیاست میں وہ بالکل ہی ناپید ہوں۔ صرف یہی نہیں کہ یہ خواتین ادب کے منظوم صنف کے ساتھ وابستہ تھیں اور بہترین شاعری کر رہی تھیں بلکہ ان کی شاعری زبانِ زدِ عام تھی اور انہیں سب سے زیادہ حمایت اپنے گھر اور خاندان والوں کی جانب سے مل رہی تھی۔ مثلاً جب حانی اور مہناز کی شاعری سامنے آتی ہے تو ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ دورِ حاضرہ کا بلوچ بھی اتنا وسیع القلب نہیں ہے کہ کسی خاتون کی شاعری اور ادب میں دلچسپی کو اچھی نگاہ سے دیکھے اور عورت کی رومانوی خیالات کی حمایت کرے، تو پھر ماضی کا بلوچ کیوں اتنا وسیع القلب اور وسیع الذہن تھا کہ وہ اپنے گھر کی خواتین کو خود ہی ان کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے پر ابھارتا تھا اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ شہداد کو مہناز کی شاعری کی وجہ سے اس

سے عشق ہوا تھا اور وہ مہناز کی شاعری کو دل سے سراہتا اور اس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اسی طرح حانی کو مکمل طور پر شہہ مرید اور اپنے خاندان کے دیگر افراد کی جانب سے حمایت مل رہی تھی لہٰذا اسی حمایت کے نتیجے میں ان کی شاعری آج بلوچی زبان و ادب کی بنیادی شاعری اور بنیادی ادبی ذخیروں میں شمار ہوتی ہے۔ اسی طرح گذشتہ اوراق میں کئی خواتین کے تذکرے ہوئے کہ جن کی رومان اور منظوم ادبی خدمات سے تاریخ بلوچستان کے صفحات مزین ہیں۔ ان خواتین میں بیشتر رندو لاشاریوں کے عہد سے تعلق رکھتی ہیں اور ادبی میدان میں اپنے وقتوں میں بھی ان کا بڑا اور مرکزی کردار تھا۔ ان کی شاعری زبانِ زدِ عام تھی اور لوگوں کی دلچسپی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ان کے نئے کلام کے منتظر رہتے تھے۔ اسی وسطی عہد میں جب مکران کے علاقہ گوادر میں بیگم کی شکل میں ایک آرٹسٹ کا تذکرہ سامنے آتا ہے تو واقعی حیرت ہوتی ہے اور وہ بیانات جن میں بلوچوں کو بنیاد پرست، دقیانوسی اور قدیم خیالات والے غیر مہذب لوگ کہا گیا ہے، نہ صرف مشکوک بلکہ مکمل باطل نظر آتی ہیں، اس کے برعکس بلوچوں کا قدیم معاشرہ کے اصل خدوخال اتنے روشن نظر آتے ہیں کہ اتنی روشنی خیالی اور ترقی پسندی جدید اقوام میں بھی نہیں ملتی۔ بلاشبہ رندو لاشار عہد میں بلوچ سماج کے مختلف اداروں میں خواتین بھرپور کردار ادا کررہی تھیں اور اپنے کردار سے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔

ممکن ہے کہ اگر ماضی کا بلوچ مرد خواندہ ہوتا اور اسے جدید دنیا کے بارے میں درست معلومات ملتیں تو شاید بلوچ خاتون بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو جاتی مگر بدقسمتی سے جب بلوچ مرد ہی ناخواندہ اور ان پڑھ تھا اور نہ ہی اسے اپنی جہل کو ختم کرنے کے لیے مواقع فراہم کیے گئے تو بھلا بلوچ عورت کہاں سے خواندہ ہوتی اور معاشرتی لحاظ سے منظر عام پر رہ کر اپنا کردار کس طرح ادا کرتی۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے ماضی کا بلوچ خواندہ نہ تھا اور نہ ہی اس کے دور دراز اور پسماندہ خطے میں تعلیمی سہولیات تھیں کہ جن سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی جہالت کا خاتمہ کرتا اور دنیا کے سرد و گرم سے آشنا ہوتا لہٰذا تعلیمی اداروں کی کمی اور جہالت سے دوچار معاشرتی نظام میں عورت بھی ناخواندہ ہی رہی۔ مگر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بلوچ خواتین ناخواندہ ہونے کے باوجود بے شعور نہ تھیں، انہیں سمجھ بوجھ اور عقل و شعور تھا مگر چونکہ اس زمانے میں سیاسی حوالے سے خواتین کے کردار کا علاقائی، قومی یا بین الاقوامی تصور نہ

تھا لہٰذا جس طرح دنیا کی دیگر اقوام وممالک میں خواتین کا سیاسی کردار ناپید تھا، بلوچستان کی سیاست میں بھی اس صنف کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ لیکن عورت کا مقام ومرتبہ بلوچ سماج میں متعین تھا اور اس کے حقوق کا مکمل احترام کیا جاتا تھا۔ بلوچ سماج کی یہ خوبی کہ عورت کو مرد سے بھی زیادہ تقدس اور احترام کا درجہ حاصل ہے، دیگر ترقی پسند اور حقوقِ نسواں کے بڑے دعویدار ممالک اور اقوام کے لیے بھی کسی مثال سے کم نہیں۔ یہ دعویٰ ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ بلوچ سماج میں عورت کا درجہ مرد کی نسبت بہت زیادہ ہے اور عورت کی جس حد تک خیال داری اس سماجی گروہ کے اندر کی جاتی ہے شاید ہی دنیا کے کسی اور سماجی گروہ میں اس کی کوئی مثال مل سکے۔ اس حوالے سے مثال بیان کرنا صرف اوراق کا اضافہ ہوگا وگرنہ بلوچ تاریخ کے اوراق عورت کے احترام اور بلند مرتبہ کی مثالوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن احترام کے ساتھ ساتھ خواتین کا معاشرے کے مختلف اداروں میں کردار اور سرگرمیاں بھی ہونی چاہیے تاکہ اس صنف کی ہر طرح کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکے۔ بلوچ سماج میں اب کافی تبدیلی آچکی ہے اور جدید تعلیم کی بدولت بلوچ عورت دیگر اداروں کے ساتھ ساتھ سیاست کے میدان میں بھی اپنی شاہسواری کے جوہر دکھا رہی ہے۔

بلوچ سماج میں برقعہ کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ پردے کے لیے بلوچ خواتین ایک بڑی چادر کا استعمال کرتی ہیں جو سوا دو سے لے کر اڑھائی گز تک طویل اور سوا ایک گز چوڑی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں بلوچی کشیدہ کاری شدہ کپڑے کھلے ڈھلے اور جسم چھپانے کے لیے بہترین ہوتے ہیں جبکہ چادر سے سر اور جسم کو مکمل طور پر ڈھانپا جاسکتا ہے۔ یہی بلوچ خاتون کا لباس اور اس کا پردہ ہوتا ہے۔ آج اگر بلوچ خواتین میں پردہ، برقعہ اور عبایا کی شکل میں نظر آتا ہے تو یہ جدید تعلیم اور جدید دنیا کی بدولت امپورٹ کردہ شئے ہے وگرنہ برقعہ اور عبایا کا بلوچ قوم اور بلوچ ثقافت کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ درآمد کردہ اشیاء بلوچ دیہاتوں میں بالکل ناپید ہیں جہاں خالص بلوچی زندگی نظر آتی ہے البتہ شہروں کی مرکب اور آلودہ معاشرہ میں پردہ داری کے یہ ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں۔ دیہات میں رہنے والی ایک خاتون جانتی ہے کہ وہ اور اس کی جان وعزت دونوں دیہات کے کے صاف ستھرے ماحول میں محفوظ ہیں۔ اگر کہیں پر خواتین جارہی ہوں اور سامنے سے مرد بھی آرہے ہوں تو مرد اپنا راستہ تبدیل

کر لیتے ہیں اور کسی اور راستے پر ہو لیتے ہیں جبکہ اگر کسی گلی کوچے میں کوئی مرد کھڑا ہو یا جا رہا ہو تو اگر سامنے سے کوئی خاتون آ رہی ہو تو وہ مرد اپنا منہ فوراً دیوار کی طرف اور نظریں زمین کی طرف کر کے تب تک کھڑا رہتا ہے جب تک وہ خاتون وہاں سے گزر نہ جائے۔ کھیتوں میں مرد اور خواتین ایک ساتھ کام کر رہے ہوتے ہیں مگر مجال ہے کہ کوئی مرد آنکھ اٹھا کر بھی کسی خاتون کی طرف دیکھے، یا کوئی نازیبا و ناشائستہ حرکت کرے یا کوئی لغو بیہودہ بات اپنی زبان سے نکالے۔ لہٰذا ایک ایسے ماحول میں جہاں عورت کو اس قدر تحفظ حاصل ہو وہاں شٹل کاک پہننے کی کیا ضرورت ہے یا عبایا پہن کر خود کو مشکوک انداز میں چھپانے کی بلوچ سماج کے دیہی خاتون کو کیا ضرورت ہے۔ اس کے لیے اس کا بلوچی لباس اور سر پر اوڑھنے والی بڑی چادر ہی کافی ہے۔ برقعہ اور عبایا شہری سماج کی اشیاء ہیں جہاں عورت خود کو محفوظ تصور نہیں کرتی۔ کیونکہ شہروں میں آنکھیں جلد ہی خراب ہو جاتی ہیں اور انہیں اِدھر اُدھر دیکھنے کی گندی عادت پڑ جاتی ہے جبکہ دیہات میں آنکھ مکمل طور پر خود کو معصوم رکھتی ہے اور گندگی و آلودگی کو اپنے قریب بھی نہیں آنے دیتی۔ لہٰذا شہر کی خاتون بیچاری مجبور ہو کر برقعہ اور عبایا کا سہارا لیتی ہے کہ میلی آنکھوں کے چھوڑے ہوئے آلودہ اور زہریلی تیروں سے محفوظ رہا جا سکے۔

ادبی دنیا میں بلوچ خواتین کا کردار کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ محققین بلوچی زبان و ادب کو خطے کی قدیم زبانوں میں شمار کرتے ہیں۔ گو کہ اس کو آریائی زبانوں کی ایک شاخ قرار دیا جاتا ہے مگر بعض محققین اس زبان کو اس سے بھی قدیم زبان قرار دیتے ہیں جو آرین زبانوں کے غلبہ کی وجہ سے ان سے متاثر ہوتی رہی۔ یہ امکان زیادہ قرین القیاس لگتا ہے کیونکہ بلوچ قبائل میں سے اکثر بنیادی قبائل سے تعلق رکھتے ہیں جو آرین حملوں اور ان کے سیاسی غلبے سے پیشتر ہی موجودہ خطہ ایران، جنوبی افغانستان اور موجودہ بلوچستان میں دور دور تک آباد تھے اور اولین ثقافتی گروہوں میں شمار ہوتے تھے۔ آریائی اقوام انہیں کوچ و بلوچ کے نام سے پکارتے تھے جبکہ چند ایک کتابوں میں انہیں قدیم لوگ یا خطے کے قبل از آرین عہد کے باشندے بھی لکھا گیا ہے۔ مگر افسوس کہ اتنی تاریخی قدامت اور شاندار ماضی رکھنے کے باوجود بلوچی زبان و ادب کے اُس زمانے کے بارے میں کسی قسم کے شواہد نہیں ملتے۔ اس کی وجہ جو بھی ہو وہ ایک الگ بحث ہے بہر حال جب سے بلوچی زبان کے ادب کے ذخائر کے شواہد ملتے ہیں تب سے

اس شعبہ میں خواتین کا بھر پور کردار رہا ہے۔ عمومی طور پر رند و لاشار عہد کو ہی بلوچی ادب کا ابتدائی عہد کہا جاتا ہے۔ اس عہد میں بلوچی زبان میں جس انداز کی شاعری ہوئی وہ بلاشبہ ادبی حوالے سے یکتا اور منفرد ہے۔ اس عہد میں لاتعداد شعرأ پیدا ہوئے اور ہر قسم کی شاعری کی۔ گیت گائے گئے، عشقیہ نظمیں کہی گئیں، غزلیں بیان ہوئیں، رزمیہ شاعری کی گئی، داستانوں کو گویوں نے منظوم انداز مین بیان کیا، ہجو گوئی نے کافی ترقی کی اور اس صنف نے خوب شہرت پائی، حتیٰ کہ شاعری کی بہت ساری اصناف نے جنم لیا اور ہر صنفِ شاعری میں بڑے نامور شعرأ پیدا ہوئے کہ جن کا کلام صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی تر و تازہ ہے اور ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس عہد کی شاعری کی نوعیت اور معنویت دیکھ کر دورِ جدید کے بڑے بڑے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شعرأ بھی دنگ رہ جاتے ہیں اور انہیں داد دیے بغیر نہیں رہ پاتے۔ ان اعلیٰ اور ارفع درجے کے نامور شعرأ کرام میں جام درک (اٹھارہویں صدی)، میر بالاچ گورگیج (سولہویں صدی)، میر حمل جیئند (سولہویں صدی)، میر بیورغ رند (سولہویں صدی)، شہہ مرید (سولہویں صدی)، میر گواہرام لاشاری (سولہویں صدی)، میر چاکر خان رند (سولہویں صدی)، مست توکلی (انیسویں صدی)، ملا عزت پنجگوری، ملا فاضل (انیسویں صدی) اور کئی دیگر مشہور و معروف نام شامل ہیں جنہوں نے اپنے خوبصورت اور بامعنی کلام سے بلوچی ادب کو علم کا وہ ذخیرہ عطا کیا کہ جس کی ثمرات سے آج کے ادیب و دانشور اور شعرأ کرام استفادہ کر رہے ہیں۔ سولہویں صدی ہی کے عہد میں اور ان ہی درج بالا شعرأ کرام کے ہم عصر بعض خواتین شعرأ کا نام بھی اس فہرست میں شامل ہے کہ جن کے اعلیٰ درجے کی شاعری کی مہک آج بھی بلوچی ادب کے گلستان کو اپنی خوشبو سے مہکا رہی ہے۔ ان خواتین شعرأ میں حانی بنت مندو، مہناز زوجہ شہداد، گراں ناز زوجہ لللہ، شیریں زوجہ دوستین، فاطمہ بنتِ عالی، سَدّو زوجہ کیّا اور کئی دیگر نامور خواتین شامل ہیں۔ ان کا کلام آج بھی شعرأ کے لیے مثل نمونہ ہے۔ یہ وہ خواتین تھے جنہوں نے صدیوں پیشتر بلوچی زبان اور ادب کی ترقی و ترویج میں بھرپور کردار ادا کیا اور اپنے کلام سے بلوچی ادب کو مضبوط و توانا بنیادیں فراہم کیں۔ بلاشبہ بلوچ سماج میں صدیوں پیشتر خواتین کی اتنی بڑی تعداد میں ادبی دنیا میں موجودگی اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ بلوچ سماج میں کس حد تک رواداری اور انسانی آزادی

پائی جاتی تھی کہ جب دنیا کی بیشتر ترقی یافتہ قومیں بھی ابھی تک اس خوبی سے متصف نہیں ہوئی تھیں اور خواتین کو صدیوں پیشتر اس حد تک آزادی قرب وجوار کی ثقافتوں میں کبھی حاصل نہیں رہی جس حد تک آزادی کی مثالیں بلوچ معاشرے میں ملتی ہیں۔ صدیوں پیشتر یہ خواتین عشق و محبت اور وصال وجدائی کے موضوعات پر اشعار کہتے تھے اور برملا ان اشعار کو ادا کرتے تھے۔ خاندان والوں کے سامنے ادا ہونے والے اشعار یا کسی محفل میں کی جانے والی شاعری عام لوگوں کو ازبر ہوجاتی اور وہ سینہ در سینہ اور علاقہ در علاقہ منتقل ہوتی رہتی تھی۔ یہی شاعری اسی طرح زبانی ہم تک پہنچی ہے جسے دورِ حاضرہ کے ادبأ و دانشوروں نے تحریری طور پر شائع کروا کے محفوظ کیا۔ خواتین کی جانب سے کی جانے والی عشقیہ اور رومانوی شاعری سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بلوچ معاشرے میں ادب کی بڑی اہمیت تھی اور اسے ہر عام وخاص میں پسند کیا جاتا تھا۔ ادب کی اصناف میں شاعری کو زیادہ ترجیح دی جاتی تھی۔ لہٰذا صرف رند ولاشار یونین کے دور میں شعرأ کی اتنی بڑی تعداد ملتی ہے جس سے ایسے لگتا ہے کہ ان دو قبائل کا ہر فرد شاعر تھا اور عام طور پر بھی گفتگو شاعری میں کی جاتی تھی۔ قدیم بلوچی شاعری اور اس میں خواتین کی بڑی تعداد کو دیکھ کر یہ بات بھی شنید میں آتی ہے کہ خواتین شعرأ کے لیے حالات انتہائی سازگار تھے اور انہیں اپنے خاندان والوں کی جانب سے بھی مکمل حمایت حاصل تھی جس کی وجہ سے وہ براہِ راست مشاعروں تک میں اپنا کلام پیش کرتی تھیں یا کم ازکم ان کے خاندان والے ان کی شاعری کے شوق سے کبھی نا آشنا نہیں رہے۔ مہناز کی شاعری کو خود شہداد کی حمایت حاصل تھی، بلاشبہ شہداد کی شاعری کی نسبت مہناز کی شاعری اعلیٰ درجے کی تھی، اسی طرح حانی کی شاعری کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ جسے نہ صرف شہہ مرید بلکہ خود حانی کے خاندان والوں کی بھرپور حمایت حاصل تھی اور جب حانی کو چاکر نے اپنی منکوحہ بنایا اور اسے شہہ مرید سے حیلہ اور فریب سے چھین لیا تو بھی حانی چاکر کی منکوحہ ہونے کے باوجود شہہ مرید کے لیے اشعار کہتی تھی اور ان میں وہ براہِ راست شہہ مرید سے ہمکلام ہوتی تھی جبکہ چاکر کو اس کی اس شاعری اور شہہ مرید سے عشق کا علم بھی تھا مگر اس پر کبھی بھی پابندی نہیں لگائی گئی اور نہ ہی اس کے اس شوق کو پورا کرنے سے اسے روکا گیا۔ دوستین قید میں تھا اور اس کی منگیتر شیرین اسے تمام حالات سے آگاہ کرنے کے لیے خط لکھتی ہے۔ وہ خط نثر میں تھا یا منظوم، اس بارے میں

کچھ نہیں کہا گیا، مگر دوستین کے کلام سے لگتا ہے کہ وہ منظوم خط تھا جس میں اشعار کی مدد سے دوستین کو حالات کی خبر دی گئی تھی۔ ان چند مثالوں سے ہی اس بات کی بہتر طور پر وضاحت ہوتی ہے کہ بلوچ معاشرے میں خواتین کا مقام بہت اعلیٰ اور بلند تھا اور وہ مکمل آزادی اور خاندانی و قومی حمایت سے بلوچی ادب میں اپنا کردار ادا کر رہی تھیں۔

بلوچ قوم کی تاریخ میں ڈھیر ساری رومانوی داستانیں دیکھ کر کئی سوالات ذہن میں جنم لیتے ہیں۔ اول تو یہ کہ بلوچ خواتین میں رومانویت اور جمالیات کا تصور کس حد تک پایا جاتا تھا؟ دوم یہ کہ بلوچ معاشرے میں خواتین کو کس حد تک سماجی آزادی حاصل تھی؟ سوم یہ کہ بلوچ سماج میں رومانویت اور جمالیات کی کس حد تک حوصلہ افزائی کی جاتی تھی؟ وغیرہ اور اس طرح کے کئی سوالات ذہن میں آتے ہیں کہ کیا بلوچ سماج میں رومانویت اور حُسن پرستی کی گنجائش موجود ہے یا نہیں؟

ان سوالوں کا جواب دینا اتنا آسان نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ سوالات انتہائی حساس نوعیت کے ہیں کیونکہ بلوچ معاشرے میں ابھی تک بنیاد پرستی اور قدامت پرستی جیسے نظریات پائے جاتے ہیں اور ایسے سوالات جو براہِ راست رومان اور خواتین سے متعلق ہوں برداشت نہیں کیے جاتے اور ایسے سوالات کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو بظاہر ایسا لگتا ہے کہ بلوچ معاشرے میں رومان اور عشق و عاشقی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی ایسی کسی حرکت کو قبول کیا جاتا ہے۔ عشق و محبت کرنے والوں کے لیے سنگین تر سزائیں مختص ہیں جن میں دونوں اصناف کو قتل کر کے ان کی لاشیں بے گور و کفن پھینک دینے کی سزا بھی شامل ہے اور ایسے مقتولوں پر کوئی آنسو بہانے والا بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسے مقتولوں کے لیے کوئی دعا یا فاتحہ لی جاتی ہے بلکہ دونوں اصناف کے خاندان والے ان سے برات کر لیتے ہیں اور ان کی وراثت سے دستکش ہو جاتے ہیں۔ لیکن اتنی سخت اور سنگین سزاؤں کے باوجود بلوچ معاشرے میں رومانوی داستانوں کی بھرمار نظر آتی ہے اور بہت کم کردار ایسے ہوں گے جو مارے گئے جبکہ اکثر کردار (دونوں اصناف یعنی زن و مرد) اپنی رومان میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اپنی منزل پا لیتے ہیں۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے کہ غور طلب ہے کہ اگر ایک طرف رومانویت اور عشق و عاشقی کے لیے سنگین سزائیں ہیں تو دوسری جانب یہ کامیاب محبتوں کی داستانیں کیوں اس کی

تردید کررہی ہیں۔ اگر سنگین سزائیں ہوتیں تو سب سے پہلے چاکر مارا جاتا کہ جس نے شہہ مرید کے ساتھ انتہائی اوچھی حرکت کی تھی اور اس سے اس کا منگیتر حیلہ اور فریب سے چھین لیا تھا، اگر کوئی عبرتناک سزا ہوتی تو مست توکلی کو دی جاتی کہ جس نے ایک شادی شدہ اور کئی بچوں کی ماں سمو نامی عورت سے عشق لڑایا اور اسے جہاں بھر میں بدنام ورسوا کیا، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ وہی مست توکلی سمو کے خیمے میں جاکر اس کے اور اس کے شوہر کے ساتھ بیٹھ کر راتیں گزارتا تھا اور وہ دونوں میاں بیوی اس کی خاطر مدارت کرتے تھے جبکہ سمو کے شوہر اور پورے قبیلہ کو اس بات کا علم تھا کہ مست سمو سے عشق کرتا ہے اور اس کے لیے ہر جگہ گیت گاتا پھرتا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مست توکلی آزادی کے ساتھ سمو سے اپنے عشق کا اعلان کرتا پھر رہا تھا جبکہ اسے نہ تو سمو کے شوہر کی جانب سے کچھ کہا گیا اور نہ ہی بلوچ سماج کے اداروں نے اسے موردِ الزام ٹھہرایا۔ علاوہ ازیں اگر بیبرگ کے کردار کو دیکھا جائے تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ایک قدیم اور بنیادی تصورات اور روایات کے امین قوم میں اس کی اوباشیوں پر اسے بہت پہلے ماردیا جانا چاہیے تھا مگر معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے کہ بیبرگ جگہ جگہ عشق لڑاتا پھرتا ہے، گلی کوچوں ہی میں نہیں بلوچستان کے حدود سے باہر بھی جاکر وہ عشق بازیاں کرتا پھرتا ہے، اس کی اپنی شاعری کے مطابق اس کے کئی دوست اور بیلیاں تھیں جن کے پاس وہ اکثر دل لبھانے کے لیے جاتا تھا اور ان کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بیبرگ کو نہ تو سدّو کے عشق میں کچھ کہا گیا اور نہ ہی اسے مَلّی سے دل لگی کرنے پر کوئی سزادی گئی اور نہ ہی قوم نے اسے شہزادی گراں ناز کو اغوا کر کے لانے پر کوئی سزادی، بلکہ دیکھا یہ گیا کہ اس کے ہر معاشقے پر قوم کے سرکردہ لوگوں نے اس کی حمایت کی اور اس کی حفاظت کے لیے ہتھیار تک اٹھائے اور آمادۂ قتال ہو گئے۔ چاکر اور گواہرام دونوں بڑے سرداروں نے اس کی حمایت کی تھی اور اس کی اوباشیوں پر اسے کچھ کہنے کے اُلٹا اس کی حفاظت کے لیے لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے تھے۔ شالی (شَلّی) ایک خاتون ہوتے ہوئے خود ہی حسن بلوچ کو اپنے لیے منتخب کرتی ہے اور اسے شادی کا پیغام بھیجتی ہے جبکہ بلوچ قبائل میں کبھی یہ نہیں دیکھا گیا اور نہ ہی بلوچ روایات میں اس بات کی کوئی گنجائش نظر آتی ہے کہ ایک خاتون خود ہی کسی کو اپنے لیے پسند بھی کرے اور اسے سرِ عام اور ببانگِ دُہل شادی کرنے کا پیغام بھی بھیجے۔ حسن کے مارے جانے کے

بعد شالی اس کے لیے گریہ کناں ہوتی ہے اور ساری زندگی اس کی یادوں کے سہارے اور اسے اپنا شوہر قرار دے کر بیوہ حالت میں بیٹھ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ حسن کو اپنا شوہر تک قرار دے کر اس کے بھائیوں اور خاندان سے اس کے قاتلوں سے اس کا بدلہ لینے کا مطالبہ کرتی ہے۔ حتیٰ کہ اس ضمن میں اتنی مثالیں ہیں کہ جن کے مطالعہ سے اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ محبت اور رومانویت کے حوالے سے بلوچ قوم میں بہت رواداری پائی جاتی ہے اور کسی کو پسند کرنا اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرنے کا تصور گو کہ بلوچ روایات میں نہیں ہے لیکن اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو اسے غلط یا معیوب نہیں سمجھا گیا البتہ اگر محبت بے حیائی اور فحاشی میں بدل جاتی ہے تو پھر اس قومی گروہ ہی نہیں دنیا کے دیگر بہت سارے ثقافتی گروہوں میں بھی سیاہ کاری اور زنا کاری کے لیے رحم کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ البتہ پُرخلوص اور سچی محبت کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ بلوچ رومانوی کرداروں کو سماج میں برداشت کرنے کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ ان کرداروں میں سے اکثر یا تو بچپن سے ہی ایک دوسرے کے ساتھ منسوب رہے تھے جن کی منگنیاں بچپن میں ہی طے ہوئی تھیں یا پھر پسند آجانے پر ان کی نسبت طے کی گئی تھی یعنی شادی سے قبل یا معاشقے سے قبل وہ نسبت کے بندھن میں بندھ چکے تھے اور پھر ان کی محبت کہانی شروع ہوئی وگرنہ بہت کم کردار ایسے ہوں گے کہ جن کا کوئی تعلق نہیں تھا اور انہوں نے عشق و محبت کی۔ قدیم شاعری اور بالخصوص خواتین کی جانب سے کی گئی شاعری اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ بلوچ قوم میں خوبصورتی اور رومانویت کا تصور بالکل موجود تھا اور اسے صرف بے حیائی اور فحاشی کی صورت میں معیوب خیال کیا جاتا تھا اور اب بھی فحاشی اور بے حیائی کے لیے اس قوم کی روایات میں کوئی گنجائش نہیں البتہ محبت اور پیار سے بلوچوں کے قلوب مسخر کیے جاسکتے ہیں۔ بلاشبہ بلوچ خود بھی محبت کرنے والی قوم ہے اور محبت کرنے والوں کو پسند کرتی ہے بشرطیکہ اس محبت میں خود غرضی، فحاشی، بے حیائی اور مفاد پرستی نہ ہو۔

بلوچ خواتین نے رومانوی داستانوں میں بھرپور اور سرگرم کردار ادا کر کے اس بات کا بین ثبوت فراہم کیا ہے کہ اگر رومانویت پاکیزگی اور روحانیت کے جذبات سے بھری ہوئی ہو تو اس کے لیے جان بھی جائے تو کوئی بات نہیں۔ گذشتہ باب میں جن داستانوں کو زیرِ تحریر لایا گیا ان کے مطالعہ سے اس بات کا ادراک بخوبی ہوتا ہے کہ محبت کی ان سچی کہانیوں میں عورت

کا کردار بڑا جاندار اور مرکزی نوعیت کا رہا ہے۔ کہانی کے ہر منظر میں وہ پوری جانفشانی کے ساتھ سرگرم نظر آتی ہے اور کہیں پر بھی وہ اپنے مقاصد سے پیچھے ہٹتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ وہ پورے جوش و جذبے کے ساتھ اپنی محبوب کے کا ساتھ دیتی ہے۔ چاہے تیز طوفان ہو، یا بادو باران، غیر ملکی حملے ہوں یا قبائلی جنگیں، قید و بند یا بدلے کی آگ، عاشق جہاں بھی اور جس حالت میں بھی ہوتا ہے اس کی معشوقہ اس کے ساتھ ہوتی ہے، اس کا انتظار کرتی ہے، اس کے لیے دعائیں کرتی ہے، اس کے ساتھ رابطہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ خوشی غمی، درد وسکون، رنج والم، مسرت وشادمانی، سفر وحضر حتیٰ کہ محبوبہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنی محبوب سے جدا نہیں ہوتی۔ اس کی جاندار اور بھرپور کردار کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حانی تیس سال شہہ مرید کی منتظر رہتی ہے اور چاکر کی منکوحہ ہونے کے باوجود اسے بددعائیں دیتی ہے کہ جس نے اس کے شہہ مرید کو در بدر کر کے رکھ دیا تھا۔ سَدّو کئی برس تک رِکیا کی منتظر رہتی ہے اور اپنے باپ سے صاف صاف کہتی ہے کہ میں اگر شادی کروں گا تو صرف رِکیا سے اور کسی سے بھی نہیں۔ اسی طرح شالی، حسن بلوچ کی موت کے بعد اس کے نام کا سندور اپنی مانگ میں بھر لیتی ہے اور ساری زندگی اس کے بیوہ کے طور پر گزارتی ہے حالانکہ دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو دیکھا تک نہ تھا۔ عزت اپنے پیار کرنے والے شوہر میر بہرام سے اتنی محبت کرتی ہے کہ وہ جنگوں میں بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے اور اس سے جدا ہونے سے انکار کرتی ہے۔ حتیٰ کہ اس ضمن میں اتنی مثالیں ہیں کہ جن سے کئی صفحات پر روشنائی بکھیری جاسکتی ہے اور انہیں مثال کے طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا کسی شک وشبہ کے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ رومانوی داستانوں میں بلوچ عورت کا کردار بڑا جاندار اور متحرک رہا ہے اور کسی بھی موڑ پر اس ذاتِ نازک کے ارادوں اور پایۂ ثبات میں کوئی لغزش نظر نہیں آتی۔

عمیق و دقیق مطالعہ اور تحقیق یہ حقیقت آشکارا کرتی ہے کہ بلوچ قوم دنیا کی قدیم ترین ثقافتی گروہوں میں شمار ہوتا ہے جن کے بارے میں آرین حملہ آوروں کی اس خطے میں ورود سے قبل کے ادوار کے بھی شواہد ملتے ہیں کہ یہ قوم آرین قبائل کے ایرانی خطے میں مداخلت سے قبل ایک وسیع وعریض خطہ زمین پر آباد تھی جنھوں نے آرین حملہ آوروں کے ساتھ شدید جنگیں لڑیں اور انہیں علاقہ موجودہ ایران میں داخل ہونے سے روکنے کی بہت کوششیں کیں۔

گو کہ بلوچی زبان کو انڈو آرین زبانوں کی شاخ قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ زبان آرین حملہ آوروں کے اس علاقے میں مداخلت سے قبل بھی رائج تھی۔ اکثر مورخین اس زبان کو پارتھی زبان کی باقیات بھی قرار دیتے ہیں جو قبل از آرین اس خطے میں مستعمل تھی۔ بعض محققین اور دانشور نقش رستم پر لکھی ہوئی تحریروں کو بھی بلوچی زبان کی اولین تحریریں قرار دیتے ہیں۔ (بگٹی (1995) :267) مگر افسوس کہ اس زبان کا قدیم ادب دستیاب نہیں ہے،ور موجودہ زبان وادب کا آغاز عام طور پر رندو لاشار اتحادیہ کے عہد سے کیا جاتا ہے۔ یقیناً قدیم ادوار میں بھی بلوچی زبان کے شاعر اور ادیب گزرے ہوں گے جن کا کلام حوادث زمانہ کا شکار ہوتا رہا اور آج اس قدیم اثاثے میں سے کچھ بھی دستیاب نہیں ہے حالانکہ اس قوم کے مضبوط سیاسی اور سماجی کردار کے بارے میں طویل تذکروں سے قدیم تاریخی کتب بھرے پڑے ہیں۔ تاریخی کتب کے مستند بیانات کے مطابق اس قوم کے کئی قبائل نے مختلف اوقات میں نہ صرف موجودہ منقسم بلوچستان پر اس سے بھی زیادہ وسیع وعریض خطے پر حاکمیت قائم کی اور طویل عرصہ تک وہ ان خطوں پر برسرِ اقتدار رہے۔ قدیم ایران، افغانستان کا وسیع رقبہ، سندھ، پنجاب وغیرہ اس قوم کے مختلف قبائل کے قبضہ واختیار میں رہے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کی زبان کے بارے میں تحریری مواد اٹھارہویں صدی عیسوی میں ملنا شروع ہوتا ہے جبکہ ادب کا باقاعدہ آغاز سولہویں صدی عیسوی کے رندو لاشار عہد سے کیا جاتا ہے۔ یقیناً بلوچی کا قدیم ادبی اثاثہ موجودہ رسم الخط میں نہیں ہوگا بلکہ وہ کسی اور رسم الخط میں تحریر ہوا ہوگا۔ راقم الحروف کا تعلق لسانیات کے شعبے سے نہیں ہے، لہٰذا یہ تو کوئی ماہرِ لسانیات ہی بتا سکتا ہے کہ قدیم رسم التحاریر کون سی تھیں؟ اور ان کی نوعیت کیسی تھی؟ تب ممکن ہے کہ قدیم بلوچی تحریروں کے بارے میں کوئی کھوج لگانے میں کامیابی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر صدقِ دل سے اس مسئلہ پر تحقیق کی جائے تو کامیابی ضرور ملے گی اور قدیم بلوچی تحریروں اور رسم الخط کے بارے میں ضرور کوئی نہ کوئی کھوج لگانے میں کوششیں بارآور ثابت ہوں گی۔

بلوچ قوم کا اصل خطہ ایسی جغرافیائی کیفیت رکھتا ہے کہ جسے بیان کرتے وقت بھی یوں لگتا ہے جیسے کوئی فطرت پرست شاعر منظوم انداز میں فطرت کی رنگینوں کو بیان کر رہا ہے اور یہ الفاظ حقیقت کی بجائے صرف سراب ہیں جو یہ بیان کرنے والا اپنے منہ سے اُگل رہا ہے یا

لکھنے والا ہرزہ سرائی کر رہا ہے۔ لیکن جو شخص بلوچستان (منقسم بلوچستان یعنی ایران، افغانستان اور پاکستان میں منقسم وہ علاقہ جو انگریزوں کی آمد سے قبل بلوچستان کہلاتا تھا) کے بارے میں جانتا ہے تو اسے یہ علم ضرور ہوگا کہ اس خطے کی جب جغرافیائی کیفیت بیان کی جاتی ہے تو شعرا کرام بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ یہ شاعری ہے یا حقیقت، جیسا کہ صحارؑ بدی نے حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے مکران کی تصویر کشی کی تھی تو اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے قاصد صحار عبدی سے متحیر ہو کر پوچھا تھا کہ اے صحار تم شاعری کر رہے ہو یا حالات بتا رہے ہو۔ صحار نے جوب دیا کہ حضور مکران کی نقشہ اور حالات بیان کر رہا ہوں۔

واقعی اس خطہ کی نوعیت اور منظر نامہ کچھ یونہی ہے جس میں یہ قوم زمانہ اولیٰ سے بودوباش رکھتی ہے۔ اس خطے کی جغرافیائی کیفیت میں اتنا رومان ہے کہ اگر کوئی شاعر ان ویرانوں کو دیکھے تو وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے گا۔ کوئی عاشق کی نظر جب فطرت کی ان خوبصورت رنگوں پر پڑتی ہے تو اپنی محبوبہ کے حُسن اور اس خطے کی خوبصورتی کے بارے میں شش و پنج میں پڑ جاتا ہے اور اس سے یہ فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ کس کی تعریف کرے اپنی محبوبہ کی یا اس خطہ ارضی کی۔

قدیم بلوچستان کا نقشہ اگر دیکھا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں البُرز اور دماوند کا اونچا پہاڑ اور دشوار گزار پہاڑی سلسلہ واقع ہے، جس کے خوبصورت مناظر اور اس کے گھنے جنگلات، رنگ برنگے پھول، برف کی سفید چمکدار چادر سے ڈھکی ہوئی بلند و بالا اور نا قابلِ عبور چوٹیاں، تو کہیں پر بَل کھاتے اور مڑتے ہوئے خوفناک درے، کہیں پر پانی کی خوبصورت اور موتیوں کی طرح چمکدار پانی کے آبشار، تو کہیں پر ٹھنڈے میٹھے آبِ کوثر کی مانند ابلتے ہوئے چشمے کہیں پر آہو و آہو نما چرندے تو کہیں پر خونخوار جنگلی درندے، کہیں پہاڑی چوٹیوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتے سفید و سرمئی بادلوں کے نرم و گداز گولے تو کہیں ہوا میں اڑتے خوش نما و خوش صدا طیور، کہیں پہاڑی پگڈنڈیاں تو کہیں پر گاؤں کے مکانوں کی چمنیوں سے نکلتے ہوئے دھویں کے مرغولے، کہیں پر مویشیوں کے دھول اُڑاتے ہوئے ریوڑ لے جاتے گڈریے تو کہیں گاؤں کے کھلے میدان میں بھاگ دوڑ کرتے ہوئے دنیا کی غموں سے بے فکر و آزاد بچے۔ کیا یہ منظر کسی بھی شاعر کو مسحر کرنے ک لیے کافی نہیں۔ یہ تو صرف قدیم بلوچستان کے ایک

چھوٹے اور مخصوص سے پہاڑی علاقے کوہِ البرز کے مناظر کا معمولی سا عکس تھا، میرے خیال میں شاعر کی پوری بیاض کے لیے یہ پہاڑی سلسلہ ہی کافی ہے۔ اگر وہ کوہِ البرز کے جنوب میں پھیلے ہوئے اس وسیع و عریض اور حُسن و عشق کی لذتوں سے مالا مال ریگستان پر بھی نظر ڈالے تو اس کیفیت قابلِ دید ہوگی، جو جنوب میں ساحلِ مکران تک تقریباً آٹھ سو میل کی طوالت تک پھیلا ہوا ہے جبکہ اس کی وسعت مغرب میں کرمان سے مشرق میں نوشکی تک پھیلی ہوئی ہے۔ بلوچستان کا موجودہ رخشان ڈویژن مکمل جبکہ کچھ حصہ منقسم مکران کا بھی جو ایران اور پاکستان میں بٹا ہوا ہے، اس عظیم صحرا پر مشتمل ہیں۔ ایرن میں شامل تمام تر بلوچستان اسی صحرا پر مشتمل ہے۔ کہتے ہیں کہ صحرا اور سمندر دونوں کسی بھی حقیقی اور حساس شاعر کی کمزوری ہوتی ہیں اور عاشق کی کمزوری بھی تو یہی تو مقامات ہیں یا تو وہ سمندر کنارے یا سمندر کے اندر رہ کر محبوب کا متلاشی ہوتا ہے یا پھر صحرا کو اپنا ٹھکانہ بنالیتا ہے۔ اسی لیے تو شاعر کہتا ہے کہ:

قیس صحرا میں اکیلا ہے مجھے جانے دو

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

لہٰذا یہ طویل و عریض صحرا کسی بھی شاعر یا ادیب کے تخلیات کا منبع ہوگا اور یہ اسے اس کی سوچوں کا مرکز محسوس ہوگا۔ صحرا کا لہریں مارتا ریت کا تا حد نگاہ نظر آنے والا سمندر، اس میں اٹھتی ہوئی لہروں کی مانند چھوٹے بڑے ٹیلے، ان ٹیلوں کے مابین کہیں کہیں جان لیوا ریت کے بڑے بڑے کنویں نما کھڈے، دور دور تک جان لیوا گرم تپتی ہوئی ریت کا سمندر اور اس ریت کے وسیع و عریض قطعہ میں دور و نزدیک نہ کوئی انسان نہ جانور۔ طویل فاصلوں پر کہیں کہیں سرسبز و شاداب خوبصورت نخلستان اور ان میں آباد چھوٹے چھوٹے گاؤں، اور مٹی گارے کے بنے ہوئے کچے مکانات اور اس گاؤں میں ٹھنڈے میٹھے پانی کے ابلتے چشمے، میٹھے میٹھے اور قسم قسم کے کھجور کے درختوں کے گھنے جھنڈ، اونٹوں کی طویل قطاریں، ساربانوں کی حدی خوانی، بھیڑ بکریوں اور مویشیوں کے بڑے بڑے ریوڑ اور چرواہوں کے بانسری کی میٹھی و سریلی آواز، دن میں بلا کی گرمی اور ریت کو جنت کی ٹھنڈک، دن کو سورج کا آگ برساتا غصہ اور رات کو نور و شبنم میں نہائی ہوئی نرم و گداز اور ٹھنڈی و میٹھی چاندنی اور جھلملاتے جلتے بجھتے ستارے: کیا یہ دلفریب اور سحر انگیز نظارے کسی بھی شاعر کو دیوانگی کی حد تک لے جانے کے

لیے کافی نہیں۔ یقیناً کوئی ادیب اور کوئی شاعر ایسے مناظر صرف خوابوں میں ہی دیکھ سکتا ہے اور اگر اس نے حقیقت میں ایسا منظر دیکھا تو ذرا اندازہ لگائیں کہ اس کی کیفیت کیا ہوگی؟

یہ تو صرف دو مناظر کا ہی تعارف ہوا ہے ابھی تو اس خطہ بے کراں کے کئی مناظر تعارف کے منتظر ہیں۔ ابھی تو رومان و عشق کا بادشاہ سمندر ہمیں گھور گھور کے دیکھ رہا ہے جیسے ہم اسے بھول چکے ہیں۔ یقیناً اس کی رومانویت، محبت، غصہ، کبھی اٹھکیلیاں کرتی جھومتی اور کبھی غصہ میں بپھری ہوئی لہریں، ساحل کا نرم و آرام دہ ریت جو عاشقوں کی نشست گاہ ہوتی ہے، جو ادیب کا مسکن اور شاعر کا ٹھکانہ ہوتا ہے۔ وہ جہاں مچھیرے کی رزق اور امت کی روزی چُھپی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ سمندر جہاں ڈوبتا اور ابھرتا ہوا سورج ہمیں موت و زیست کا احساس دلاتا ہے کہ جہاں چاندنی سمندر کی لہروں کو بھی مست کر دیتی ہے۔ طویل و عریض نیلے پانیوں اور سنہری ریت والا ساحل اور دنیا کے حسین ترین ساحلوں میں سے ایک خوبصورت ترین ساحل: کیا یہ کسی شاعر کے تخیلات کا مرکز نہیں ہوگا؟ کیا کوئی شاعر یا ادیب اس رومانویت اور حُسنِ قدرت کو دیکھ کر خاموش رہ سکتا ہے؟ جیونی کا ڈوبتا سورج، گنز و پیشکان کے خوبصورت ساحل، گوادر کا باتیل اور باتیل کی چوٹی سے گوادر شہر اور اس کے گرد و پیش کا رومان پرور نظارہ، وہ نیلگوں سمندر اور سمندر کے پار رات کی تاریکی میں نظر آنے والی مسقط کے ساحلوں کی روشنیاں، دن کی روشنی میں ماہی گیروں کی کشتیاں اور لانچوں کی بیچ سمندر رزق کی تلاش میں مارا مارا پھرنا اور رات کے سناٹے میں دن بھر کے تھکے ماندے ملاحوں کے سمندر کنارے واقع جھگیوں سے مدھر لے میں بلند ہوتی ہوئی گیتوں کی آوازیں۔ اس ساحل سمندر پر بھلا اور کس شئے کی کمی ہے کہ جو ایک شاعر کے صرف تصورات میں آتے ہوں اور جس سے ادب تخلیق ہوتی ہو۔

مکران کی پہاڑی بھول بھلیاں، کھجور کے باغات، آڑھے ترچھے پھیلے ہوئے پُر پیچ پہاڑی سلسلے، بالگتر کا طویل میدان، بلیدہ کی بہتی اور شور کرتی ہوئی ندی، پنجگور کے موسم اور وہاں کے مزے مزے کے پھل اس خطہ عریض کے لذیذ و ذائقہ دار قسم قسم کے کھجور۔ حتیٰ کہ اس کی ہر لمحہ بدلتے مناظر اس کی دلکشی اور حُسن میں اتنا اضافہ کرتی ہیں کہ شاعر و ادیب تو کیا ایک بے ذوق بھی ان رعنائیوں اور فطری حُسن کی چاشنی میں ڈوب جاتا ہے۔ اگر وہ شاعر نہیں تو

یہ مناظر اسے شاعر بنا دیتے ہیں۔

وہ ہنگول کا پُراسرار جنگل، اس جنگل میں بہتا ہوا دریا ہنگول کا مٹیالہ پانی، اس پانی میں موجود وحشی مگر مچھ، وہ ہنگول کے پُر پیچ پہاڑی سلسلے اوران کے خوفناک درے، اس وسیع و عریض نیشنل پارک میں پائے جانے والے لاتعداد اقسام کے چرند، درند اور پرند اس جنگل کے حُسن اور دہشت دونوں کو بڑھا دیتی ہیں۔ اسی نیشنل پارک کی خوبصورت ترین نشانی یعنی امیدوں کی رانی (Princess of Hope) کا مجسمہ جو کوسٹل ہائی وے پر سڑک کنارے ایستادہ ہر آنے جانے والے مسافروں اور اس جنگل میں بھٹکنے والے راہگیروں کے لیے امیدوں کا مرکز ہے۔ کیا ہنگول کا وسیع و عریض جنگل اور یہاں کی زندگی کسی شاعر کے خواب کے مطابق نہیں ہوگی؟ کہ یہاں اسے اپنی امیدوں کی ملکہ بھی تو مل جاتی ہے۔ بیلہ کا میدانی علاقہ اور چاروں طرف پھیلا ہوا لق ودق ویرانہ کہ جس کی وسعتوں سے خوف کو بھی خوف آئے۔ وہ گڈانی کا ساحل وہ ساکران کے باغات، پب و کیرتھر کے پہاڑی سلسلے، دریائے حب کا پانی، سسی پنوں کا مزار، لکھ کا پہاڑ اور شیریں کے عاشق فرہاد کی کھودی ہوئی پہاڑی نہر، سنڈیمن کا مقبرہ اور محمد بن ہارون المکرانی کا مزار، وہ سڑک کنارے بکھرے ہوئے قبرستان جو اس خطے کی قدیم تاریخ کے گواہ ہیں۔ پورالی کی طوفانی ندی، شاہ نورانی کا اونچا مزار، قدیم حملہ آوروں کی اہم گزرگاہ: کیا یہ کسی شاعر کے سوچوں کا عکس نہیں ہوگا؟ یقیناً ادب کی تخلیق کے لیے تو بیلہ کا وسیع ویران میدان اور اس کا خوبصورت اور نیلے پانیوں والا ساحل ہی کافی ہے۔

وہ خضدار کے حسین و پُرکشش مناظر، رنگ برنگے پہاڑ، سرسبز و دلکش وادیاں، باغبانہ، ساسول، زیدی، کرخ، فیروز آباد و مولہ کا حسن اور ونگو کا خطرناک پُر پیچ راستہ: کسی حسین معشوقہ سے بھی زیادہ خوبصورت اور حسین و جمیل ہیں کہ جنہیں دیکھ کر معشوقہ کی یادیں کم ہو جاتی ہیں اور دل کو یک گونہ سکون مل جاتا ہے۔

وہ مولہ کا گیت گاتا موتی سے زیادہ شفاف بہتے پانیوں والا دریا اور اس قدیم درہ کے بل کھاتے اور مڑتے ہوئے راستے، وہ اس درے کی اونچی اونچی رنگ برنگے پہاڑوں کی چوٹیاں، اس درے کی سب سے خوبصورت مقام چُھوک کہ جسے دیکھ کر شاعر تو شاعر فرشتوں کی بھی سانسیں رُک جائیں، یہ نولنگ کا شور مچاتا پانی اور دور دور واقع کچے مکانات پر مشتمل

چھوٹے چھوٹے گاؤں اور شام کی ملگجی روشنی میں ان گاؤں میں داخل ہوتے ریوڑ اور ان کی اڑتی ہوئی دھول ایک عجیب سماں پیدا کرتی ہیں، رات کا اندھیرا اور درہ مولہ کا خوفناک سناٹا اور اس سناٹے میں شامل پتھروں پر بہتے دریا کے پانی کا مدھم شور۔ ایک عجیب خوف کا سا منظر ہوتا ہے اور وہ دن کی روشنی میں درہ کا حُسن اور دریا کے لہروں کا کانوں میں رس گھولتی ہوئی آوازوں کا ترنم رات کے خوف کا خاتمہ کر دیتی ہے اور دلوں کو مسرتوں سے بھر دیتی ہے۔

قدیم دارالخلافے سوراب اور قلات اس خطہ کی تاریخ کے امین ہیں۔ سوراب کے قدیم ٹیلے، پہاڑوں سے مثلِ سانپ بل کھاتا نیچے کی جانب تیزی کے ساتھ بہتا ہوا بارش کا پانی، تاریکی کا تاریخی پہاڑ، میروانیوں کا پہلا مرکز، سوراب اپنی خوبصورتی و رنگینی سے ہر ایک متاثر کرتی ہے۔ قلات کا قدیم قلعہ ہزاروں سالوں سے اس خطے کی قدیم ترین تاریخ کا امین ہے کہ جس نے کئی حاکموں کو اس شہر کے سنگھاسن پر بیٹھتے ہوئے دیکھا۔ ٹھنڈا ٹھار قلات جو موسم گرما میں جنتِ ارضی سے کم نہیں جہاں ہر طرف سبزہ و ہریالی اور ہرے بھرے باغات ہی باغات نظر آتے ہیں، جہاں جولائی میں بھی رات کو بغیر کمبل کے سویا نہیں جا سکتا۔ وہ قلات جہاں قدیم ہربوئی کا سلسلہ کوہ اور وہ تفریحی مقام واقع ہے جس کی خوبصورتی اور جمالیاتی حُسن اپنی مثال آپ ہے۔ قلات کہ جہاں کبھی دُدران کا پانی بہتا تھا اور اس بہتے چشمے کے پانی میں صرف انسان ہی نہیں دیگر حیات کی بھی زندگی پوشیدہ تھی۔ قلات جہاں کڑاکے کی سردی ہوتی ہے اور جہاں گھٹنوں گھٹنوں برف پڑتی ہے، جہاں کی ٹھنڈی ہوائیں ناقابل برداشت ہوتی ہیں اور جنوری میں جسم کو کاٹ ڈالتی ہیں۔ قلات جہاں سے درہ مولہ اور درہ بولان کے راستے نکلتے ہیں اور جہاں سے شرق و غرب اور شمال و جنوب میں سفر کیا جا سکتا ہے۔

وہ منگچر، کھڈ کوچہ اور مستونگ کی حسین وادیاں، کہیں پر باغات کے نہ ختم ہونے والے سلسلے تو کہیں پر طویل صحرائی پٹی۔ واہ کیا دلکش نظارہ ہوتا ہے، کہیں پہاڑ تو کہیں خشک و بنجر میدان، کہیں پر برساتی نالے تو کہیں پر اونچی اونچی پہاڑی چوٹیاں۔ وہ آماچ کی خوبصورت چوٹی جو وادیٔ مستونگ کی حسن اور اس کی پہچان ہے اور وہ ماران کی چوٹی جس سے منگچر کی شان ہے۔ وہ لکپاس کا درہ جو راہِ کاروان ہے۔ آگے دشت و کوئٹہ کی حسین وادیاں تو مغرب میں کانک، شیخ واصل اور اس سے بھی آگے کوہِ سلطان کا پہاڑی سلسلہ ہے جو اس خطے کے منظر

نامے میں مزید حسن وخوبصورتی پیدا کرتی ہے۔ نوشکی کا سارا علاقہ صحرا ہی صحرا کہ جہاں شاعروں اور ادیبوں کی جنت اور فطرت پرستوں کا آستانہ ہے۔ وادیءِ کوئٹہ ایک پیالے کی مانند سب کے سر پر الٹا دھرا ہے چاروں طرف سے یہ اونچے اونچے پہاڑوں سے گھرا ہوا شہر اپنی حسن وخوبصورتی میں کبھی چھوٹا لندن کہلاتا تھا۔ اس سے آگے شمالی بلوچستان کے دلکش و دلفریب نظارے ہیں جو آنکھوں کو سکون اور ٹھنڈک اور دل کو راحت بخشتی ہیں جبکہ مشرق کی جانب مشہور ومعروف اور قدیم رازوں کا امین درہ بولان ہے جہاں کی بھول بھلیوں اور پُر پیچ گلیوں سے نکل کر کچھی کے میدانوں میں داخل ہوا جاتا ہے۔ درہ بولان کے ساتھ ساتھ دریا بولان کا بہتا ہوا نرم وشیرین پانی ترنم کے ساتھ کچھی کے میدانوں کی طرف محوِ سفر رہتا ہے اور اس درے سے گزرنے والے مسافروں کی پیاس بجھاتا ہے۔ اس درے کی خوبصورتی پر سیکڑوں اشعار اگر کہے گئے ہیں تو یقیناً شاعر کو اس میں اپنے تخلیات اور سوچوں کا عکس نظر آتا ہے۔ یہاں شاعر اور ادیب کو اس کی تمام تر دنیا اپنی پوری رنگینیوں اور خوبصورتیوں کے ساتھ ملتی ہے اور اس کے بیاض میں کئی ابواب کا اضافہ ہوجاتا ہے۔

بولان سے آگے کچھی کے وسیع وعریض اور زرخیز میدان ہیں کہ جن کی ہریالی سے یہاں کے لوگوں کی زیست بندھی ہوئی ہوتی ہے۔ کچھی آباد تو بلوچستان آباد۔ یہاں سے آگے مزید مشرق کی جانب اس خطے کی سرحدات تاریخی علاقہ سندھ کے ساتھ منسلک ہوجاتی ہیں۔ شمال میں چلتے چلتے ہم افغانستان پہنچ جاتے ہیں جنوب میں نیلا سمندر اور مغرب میں پیلا ریگستان اس خطے کی حدبندی کرتے ہیں۔

مشرق اور شمال مشرق میں پھیلا ہوا عظیم کوہِ سلیمان کا سرسبز وشاداب پہاڑی سلسلہ کہ جس کے دونوں طرف دامنوں میں بلوچ قبائل ازمنۂ اولیٰ سے ہی آباد ہیں۔ وہ کوہِ سلیمان جہاں تختِ سلیمان واقع ہے، وہ کوہِ سلیمان جو بلوچ شعرا اور عاشقوں کا مسکن رہا ہے، وہ کوہِ سلیمان جس کے دامنوں میں اب بھی بلوچ گڈریے اپنے ریوڑ چراتے نظر آتے ہیں، وہ کوہِ سلیمان جو مست توکلی کے غمگین اور درد بھرے دل کو تسلی وآرام دیتا تھا۔ اس کے دامنوں میں پانی کے جھرنے، آبشاریں، چشمے اور جھیلیں نہ صرف اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں بلکہ کسی عاشق کو بھی وہاں ٹھکانہ بنانے اور کسی شاعر کو پوری بیاض لکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ کوہِ

سلیمان کے غیور بلوچ قبائل کہ جنہوں نے نہ صرف ہر آڑے وقت میں اپنی سرزمین اور اپنے پہاڑوں کی حفاظت کی بلکہ انہوں نے بلوچی ادب کی ترقی و ترویج میں مرکزی کردار ادا کیا۔ کیا کوہ سلیمان کا حسین و جمیل اور سرسبز و شاداب خطہ کسی ادیب و شاعر کو مسحور کر دینے کے لیے کافی نہیں؟

الغرض بلوچستان کا ہر منظر دلکش، حسین، خوبصورت اور دلچسپ ہے۔ جب کبھی میدانی علاقوں میں سفر کرنا پڑتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی منظر ہے بس سبزہ ہی سبزہ، ہریالی ہی ہریالی سیکڑوں میل سفر کریں ایک ہی منظر آنکھوں کے سامنے چل رہا ہوتا ہے جیسے کوئی فلم چلتے چلتے ایک ہی سین پر آ کر رُک گئی ہو اور سکرین ہینگ ہو گیا ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں بوریت شروع ہو جاتی ہے کیونکہ جہاں بھی یکسانیت ہو گی تو بوریت اس کے ساتھ لازم ہوتی ہے، جبکہ بلوچستان میں اگر کوئی مسافر سڑک کے ذریعے سفر کرے تو ہر چند منٹ بعد اسے منظر بدلتا ہوا ملے گا۔ کبھی پہاڑ، تو کبھی میدان، کبھی کوئی وادی، تو کبھی کوئی ندی، کبھی ریگستان تو کبھی سبزہ زار، یعنی عجیب و غریب اور دلکش و حسین مناظر ہوتے ہیں کہ جو لحہ بہ لحہ بدلتے رہتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ گاڑی کا پہیہ زندگی کی طرح رواں دواں ہے۔ بوریت تو کجا، دل چاہتا ہے کہ سفر ختم ہی نہ ہو اور یہ مناظر یونہی چلتے اور بدلتے رہیں۔ حد درجہ رومانویت اور فطری جمالیات سے بھرپور یہ خطہ بذاتِ خود کسی غزل، کسی نظم یا گیت سے کم نہیں تو پھر بھلا یہاں کا سماج اور یہاں کے باشندے کس مزاج اور کس نوعیت کے ہوں گے؟

بلاشبہ بلوچستان کی سرزمین کا ایک ایک انچ رومان اور محبت سے بھری ہوئی ہے۔ اس خطے کے باشندوں کو جنگجو اور لڑاکا لکھنا اور سمجھنا یقیناً ان کے ساتھ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔ کیا ان کے مزاج میں صرف یہی چیزیں مورخین، مصنفین، محققین، ادباء وغیرہ کو نظر آتا ہے؟ کیا ان کے مزاج کے اندر موجود حب البشر اور حب الحیات کے جذبات کسی کو نظر نہیں آتے؟ اگر یہ جنگجو اور لڑاکا ہوتے تو ان کا ادب اتنا رومانوی کبھی بھی نہ ہوتا۔ ان کے تو زندگی کے اصول ہی امن، سکون، محبت، پیار اور برداشت ہیں پھر بھلا کس ناطے ان کو جنگجو اور لڑاکا اقوام کی صفوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ یقیناً بلوچ ایک رومانویت پرست اور محبت کرنے والی قوم ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ رومان کسی صنف مخالف سے ہو، کسی دوشیزہ یا کسی پری چہرہ خاتون سے ہو، یہ

کسی پہاڑی چوٹی سے بھی ہوسکتا ہے، کسی جنگلی یا گھریلو حیات سے بھی ہوسکتا ہے۔ کسی ندی نالے یا کسی درے سے بھی ہوسکتا ہے، یہ کسی مخصوص علاقے یا کسی مخصوص پیداوار سے بھی ہوسکتا ہے، یہ تمام خطے سے بھی ہوسکتا ہے، اس طرح یہ پیار محبت اس خطے کے خوبصورت ترین مناظر سے بھی ہوسکتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہاں کے باشندے جب فطرت سے اتنا پیار کرتے ہیں تو پھر فطرت کی سب سے حسین شئے انسان سے انہیں کتنا پیار ہوگا؟ یقیناً بلوچستان کا سماج شروع ہی سے ادب کا گہوارہ رہا ہے، یہاں کی تاریخ اور یہاں کی قدیم ثقافتی نقوش اس بات کا مظہر ہیں کہ اگر یہاں رواداری اور محبت نہ ہوتی تو یہاں کی انسانی تاریخ کی طوالت کبھی اتنی نہ ہوتی۔ تحقیقات اور ان سے برآمد ہونے والے نتائج کے مطابق انسانوں کی اولین بسائی ہوئی بستیاں اور گاؤں بلوچستان میں ملے ہیں کہ جہاں پہلی بار انسان نے محبت اور سکون کے ساتھ رہنا سیکھا اور اپنے اجداد کی سابقہ پُر مشقت اور تکلیف دہ شکاری اور غاروں کی زندگی چھوڑ کر زمین پر مل کر رہنا سیکھا۔ جب تک بیرونی دنیا کے حملہ آوروں نے یہاں کے باشندوں پر جنگ اور زور آوری مسلط نہیں کی تب تک یہاں کے باشندے امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے اور خوشیاں سمیٹتے رہے مگر جوں ہی وحشی اقوام نے مہذب انسان ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے دنیا کے مختلف خطوں میں ورود کیا تو بلوچستان کی قدیم اور پُرامن ثقافت ان وحشی اقوام کے طور طریقوں اور درندگی پر دنگ رہ گئی۔ اس قدیم سماج کے باشندوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے اور اسے قتل بھی کرسکتا ہے۔ وہ سماج جو قبل از تاریخ دور کا سماج تھا محبتوں اور مسرتوں کا سماج تھا اور اگر آج وہ سماج کہیں پر نظر آتا ہے تو وہ صرف اور صرف بلوچ قوم کی دیہی زندگی میں کہ جہاں لوگوں کے طور طریقے اور رویے بھی ادب کا شاہکار نظر آتے ہیں۔ یقیناً بلوچ سماج اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ میرا تو یہ دعویٰ ہے کہ ماضی کا کوئی بھی بلوچ جو باہوش وحواس ہوتا یا مست الست، ادب کی منظوم صنف کے ساتھ جڑا رہنا اپنے لیے لازم سمجھتا تھا وگرنہ اس کے خیال میں ادبی ذوق نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی سوسائٹی میں لعن طعن کا شکار بنتا۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ ماضی کا بلوچ چاہے وہ اچھی اور بہترین شاعری کرتا یا پھر بس یوں ہی الفاظ جوڑتا رہتا، مگر وہ خود کو اس صنف ادب کے ساتھ منسلک رکھتا۔ بھلے اسے اس کی شاعری پر داد نہ ملتی لیکن وہ بے،

ذوق ہونے کے طعنوں سے بچ جاتا۔ یقیناً بلوچی ادب کا ایک بڑا حصہ انہی لوک داستانوں اور ان کے کرداروں کی کی ہوئی شاعری پر مشتمل ہے۔ ان رومانوی داستانوں اور بلوچ سماج اور بلوچی ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

بلاشبہ اور بغیر کسی قباحت کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بلوچ قوم میں رومانویت اور ادبی ذوق کی مثال ایسے دی جاسکتی ہے کہ جیسے ایک جسم میں خون کی روانی کو زندگی کہا جاتا ہے تو اسی طرح بلوچ سماج میں ادب کی موجودگی کو بلوچیت کہا جاتا ہے۔ ادب کے بغیر بلوچ قوم اور ان کا سماج نامکمل ہیں جہاں بلوچ ہوگا وہاں ادبی اور رومانوی ذوق ہوگا۔

بدقسمتی سے بلوچ قوم کا سابقہ ادبی وتحریری اثاثہ ناپید ہے۔ اس امید کے ساتھ اس تحریر کا اختتام کرتا ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ کم از کم بلوچستان سے تعلق رکھنے والے محققین بالخصوص بلوچی و براہوئی ادب اور تاریخ کے مضامین سے تعلق رکھنے والے محققین و ماہرین اس قدیم اثاثے کو تلاش کرنے کی سعی کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ بلوچوں نے اپنی سابقہ تاریخ اور ادب کو ضرور تحریری شکل دی ہوگی البتہ اس کا رسم الخط قدیم طریقوں پر مشتمل ہوگا۔ مجھے اپنی اس کمزوری کا علم ہے کہ میں لسانیات کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا جبکہ اس کام میں ماہرین لسانیات و ادب کا کردار مرکزی نوعیت کا ہے جبکہ مورخین، ماہرین آثار قدیمہ اور ماہرین بشریات اس سلسلے میں ضمناً اپنا کردار ادا کرسکتے ہیں۔ یقیناً بلوچ قوم کا ماضی بھی لوک داستانوں اور رومانوی وعشقیہ داستانوں سے مزین ہوگا۔ اگر گیارہویں وبارہویں صدی عیسوی میں سسی اور پنوں کی عظیم داستان محبت کتب کی زینت بنتی ہے تو یقیناً اس سے قبل کے بھی ایسے واقعات قدیم تاریخ کے اوراق پر رقم ہوئے ہوں گے ضرورت صرف انہیں تلاش کر کے قرطاس کی زینت بنانے کی ہے۔

کتابیات

☆ اعجاز، انوار احمد، ڈاکٹر (2007): سسی پنوں۔ بک ہوم، لاہور

☆ امجد، یحییٰ (1989): تاریخ پاکستان قدیم دور، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور

☆ بگٹی، عزیز (1995): ادب ثقافت اور سماج، سپنزر پرنٹرز، کوئٹہ

☆ بگٹی، عزیز (2010): بلوچستان شخصیات کے آئینے میں، فکشن ہاؤس، لاہور

☆ بلوچ، ذکیہ سردار (1965): سرمست بلوچستان، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

☆ بلوچ، فاروق (2012): بلوچستان کے تہذیبی نقوش، فکشن ہاؤس، لاہور

☆ بلوچ، محمد سردار خان (1977): اے لٹریری ہسٹری آف بلوچز، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

☆ ڈائر (1984): بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار، مترجم: میر گل خان نصیر، قلات پبلشرز، کوئٹہ

☆ زبیری، جمیل (2002): فوک ٹیلز آف بلوچستان، رائل بک کمپنی، کراچی

☆ سبط حسن (2009 پندرھواں ایڈیشن): موسیٰ سے مارکس تک، دانیال، کراچی

☆ سبط حسن (2002 تیرھواں ایڈیشن): ماضی کے مزار، دانیال، کراچی

☆ سلیم، آغا (1992): شاہ جو رسالو (شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کا اردو ترجمہ)، لوک ورثہ۔ اسلام آباد

☆ سمتھ۔ ونسنٹ۔ اے (2001): قدیم تاریخ ہند، مترجم: محمد جمیل الرحمن، تخلیقات، لاہور

☆ شاد، فقیر (1998): میراث، بلوچی ادبی جھنکار، بحرین

☆ صابر، غوث بخش، (1986): حانی شہہ مرید، لوک ورثہ، اسلام آباد

☆ صابر، غوث بخش، بلوچوں کی لوک داستانیں، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

☆ صابر، عبدالرحیم، قاضی (1984): بلوچستان کے رومان، بلوچی ادبی بورڈ، کراچی

☆ عقیل شفیع (1997): پاکستان کی لوک داستانیں، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

☆ عقیل شفیع (2002): سسی پنوں، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

☆ عبدالقادر، اثیر (1994): بلوچی ثقافت گیتوں میں، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

☆ قادری۔ اخلاق احمد (سال اشاعت ندارد): تاریخ وتمدن ملتان، مکتبہ علم وعرفان، لاہور

☆ قاضی، توراکینہ (سال اشاعت ندارد): سائرس اعظم، شاہکار بک فاؤنڈیشن، کراچی

☆ قزلباش، انجم، بلوچوں کے رومان

☆ گمی، سلیم خان (1990): بلوچی ادب۔ بلوچ ثقافت، مطبوعات النساء، کوئٹہ

☆ مارکس کارل (2002): ہندوستان کا تاریخی خاکہ، مترجم: احمد سلیم تخلیقات، لاہور

☆ مری۔ شاہ محمد (2005): بلوچ سماج میں عورت کا مقام، سنگت اکیڈمی، کوئٹہ

☆ نصیر، میر گل خان (2000): تاریخ بلوچستان، قلات پبلشرز، کوئٹہ

☆ نصیر، میر گل خان، بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

☆ نصیر، میر گل خان (1979): بلوچی عشقیہ شاعری، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

☆ ولیم۔ ایل لینگر (1968 تیسرا ایڈیشن): انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم جلد اول تاریخ اسلام، مترجم: مولانا غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور

☆ ہیروڈوٹس (2001): دنیا کی قدیم ترین تاریخ، مترجم: یاسر جواد، نگارشات، لاہور

☆ ☆ ☆

بلوچی رومانوی داستانوں کا جہاں ادبی حوالے سے بڑی اہمیت ہے تو تاریخِ بلوچ قوم اور بلوچستان میں بھی ان کرداروں کا جلوہ اور سرگرم کردار نظر آتا ہے اور اُس لمحے یہ ہرگز نہیں لگتا کہ یہ کردار صرف ایک مجنوں یا صحرانورد دیوانہ ہے بلکہ اُس لمحے جب اس کی قوم اور وطن کو اس کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اپنے لطیف جذبات اور عشقیہ خواہشات کو قربان کرتے ہوئے وطن اور قوم کی حفاظت کے لیے دوڑ پڑتا ہے اور اپنی محبوبہ سے دوبارہ ملنے کے وعدے اور قومی فرض کی تکمیل کے بعد ملاقات کا کہہ کر میدانِ رزم اور بساطِ سیاست پر سرگرم کردار ادا کرتا نظر آتا ہے یعنی وہ محبت میں اندھا نہیں ہوتا اور نہ ہی اپنی یا اپنی محبوبہ کی بدنامی کا باعث بنتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے جب بھی ان عشقیہ اور رومانوی کرداروں کا حال بیان کیا جائے تو بلوچستان کی قومی اور سیاسی تاریخ کے حوالے سے بھی ان کے کردار کا جائزہ لیا جائے اور نہ صرف ان کی داستانِ محبت پر طبع آزمائی کی جائے بلکہ ان کے سیاسی اور تاریخی کردار کو بھی منظرِ عام پر لا کر ان ہستیوں کی سرگرمیوں اور کردار و عمل کی اہمیت کو بیان کیا جائے۔

زیرِ نظر کتاب بھی اُن مشاہیر کے بارے میں ایک چھوٹی سی کاوش ہے جنہوں نے بلوچ قوم کی رومانوی تاریخ کو جلا بخشی اور بلوچ تاریخ کے اس خوبصورت پہلو کی تکمیل کر کے ہر کس و ناکس کو یہ اطلاع دی کہ بلوچ قوم ایک امن پسند اور محبت کرنے والی قوم ہے جسے بعض اوقات تاریخ سے ناآشنا اور نابلد لوگ صرف جنگجو اور رزم آرا قوم تحریر کرتے ہیں۔ اس کتاب کے منظرِ عام پر آجانے کے بعد اس بات کی بہتر طور پر وضاحت ہوگی کہ بلوچ قوم کو امن اور آشتی سے محبت ہے جبکہ رزم آرائی پر انہیں ہمیشہ مجبور کیا گیا ہے۔ اگر بلوچ قوم کی طویل تاریخ میں شدید رزم آرائیوں کی تاریخ ملتی ہے تو یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ کیا بلوچوں نے یہ جنگیں ایرانی، یونانی، ہندی، عرب، ترک، مغل اور انگریز اقوام کے ملکوں میں جا کر لڑی ہیں یا ان اقوام کے بلوچستان پر حملوں کے خلاف مزاحمت کی ہے۔ یقیناً مطالعہ اور تاریخی حقائق کے پڑھنے سے یہ بات واضح ہوگی کہ بلوچوں نے ہمیشہ اپنے دفاع کی جنگ لڑی ہے اور انہوں نے کبھی بھی کسی دوسری قوم پر نہ تو جنگ مسلط کی ہے اور نہ ہی کسی قوم کو اپنے زیرِ نگیں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی ساری مدافعت اپنی قوم و وطن کی دفاع کی خاطر رہی ہے اور یہ سلسلہ ہزاروں سالوں سے جاری ہے۔

لاہور • حیدرآباد • کراچی
@fictionhousepublishers www.fictionhouse.com.pk

ISBN 978-969-562-900-0